کارکن اور قیادت سے

تحریک کے تقاضے

خُرّم مُرَادُ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کارکن اور قیادت سے

تحریک کے تقاضے

ترتیب

مقدمہ — قاضی حسین احمد — ۱۳

تحریک: کیا اور کیوں؟

- تحریک سے مراد — ۱۹
- حضرت ابراہیمؑ: ایک مثالی مسلمان — ۲۰
- تحریک: ایک نئی اصطلاح — ۲۵
- تحریک کی خصوصیات — ۲۹
  - ابدی اور مستقل حیثیت — ۲۹
  - ہمہ گیر نوعیت — ۳۱
  - مقصود و مطلوب، رضاے الٰہی — ۳۱
  - کامیابی اور ناکامی کا معیار — ۳۲
  - فرد اور جماعت کا تعلق — ۳۴
- تحریک اسلامی ہی کیوں؟ — ۳۵
- جہاد: ایک ناگزیر تقاضا — ۳۹

راہ و منزل: جہاد و جنت

- صحابہ کرامؓ کا عمل — ۴۵
- اللہ کی رضا اور جنت — ۵۰
- جنت اور جہاد کا تعلق — ۵۳
- عروج کا راستہ — ۶۰

حکمتِ تنظیم: اہداف اور منصوبہ بندی

○ حکمتِ تنظیم ۶۷
○ تین بنیادی اصول ۷۱
مقصد نگاہ میں رہے ۷۱
مستقبل کو پیش نظر رکھیں ۷۲
معاشرے پر اثرات ۷۳
○ محض تنظیم مقصود نہیں ۷۴
○ ''کیوں'' کا سوال کیجیے ۷۶
○ منصوبہ بندی ۷۸
○ منصوبہ بندی: قابل توجہ امور ۸۰
○ امکانات پر توجہ رہے ۸۲
○ ہلکی پھلکی تنظیم ۸۳
○ وقت کی قدر ۸۴
○ قوتِ اجتہاد ۸۵

موثر قیادت: کیا اور کیسے؟

○ احساسِ ذمہ داری ۹۰
ذمہ داری کا تعین ۹۰
احساسِ جواب دہی ۹۱
ذمہ داری اٹھانا ۹۳
○ اللہ کی تائید پر بھروسا ۹۴
خود اعتمادی ۹۵
○ وقت کا صحیح استعمال ۹۶
اپنے وقت کا آڈٹ کیجیے ۹۷
اہم اور غیر اہم کاموں کا جائزہ ۹۹
کام تفویض کرنا ۱۰۰
اجتماعات میں شرکت ۱۰۱

بروقت فیصلہ	۱۰۱
اجتماعات کی تعداد میں کمی	۱۰۲
وقت کے طویل دورانیے کا استعمال	۱۰۳
○ اعلیٰ مقاصد پر نظر	۱۰۵
○ ترجیحات کا تعین	۱۰۶
○ مجموعی کام پر نظر	۱۱۱
○ دین کا فہم	۱۱۳

تربیت: اپنی اور دوسروں کی

○ تحریک کو مطلوب انسان	۱۱۹

تربیت کے بنیادی اصول

○ اپنی تربیت آپ	۱۲۱
○ تنظیم و ذمہ داران کا دائرہ کار	۱۲۳
○ تربیت: سیکھنے اور عمل کرنے کا نام	۱۲۷
○ تربیت کا عمل زندگی کا حصہ	۱۲۹
○ تربیتی امور اور تنظیمی ماحول میں مطابقت	۱۳۰
○ تربیت: ایک طویل اور مسلسل عمل	۱۳۱

باہمی تعلقات: تین بنیادی اصول

○ رحمت و شفقت، عفو و درگزر	۱۳۳
○ قدر و قیمت کا احساس	۱۳۹
○ صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا اور کام لینا	۱۴۰
○ احتساب کا عمل	۱۴۰
○ تربیت کی عملی تدابیر	۱۴۳
سوچ سمجھ کر کام کرنا	۱۴۳
صلاحیتوں کے مطابق کام لینا	۱۴۴
مربوط انداز میں کام	۱۴۵

خود احتسابی ۱۴۵
موثر رابطہ ۱۴۶
تعریف اور حوصلہ افزائی ۱۴۸
کوتاہی کو تسلیم کرنا ۱۴۹
دعوت اور اخوت ۱۵۰

تزکیہ نفس: بنیادیں

○ تزکیہ دعوت کی بنیادیں ۱۵۲
۱-تزکیہ کا مرکز: قلب ۱۵۴
قلب کی اہمیت ۱۵۵
دو اہم سوال ۱۵۸
۲-ارادہ و عزم ۱۶۱
ارادے اور خواہش میں فرق ۱۶۲
۳-نتیجہ نہیں کوشش ۱۶۴
کوشش کا معیار ۱۶۵
۴-وقت' ایک اہم بنیاد ۱۶۷
۵-''احسان'' کی کیفیت ۱۶۹
۶-احساسِ ذمہ داری ۱۷۱

تزکیہ نفس: طریقے

○ اللہ کا ذکر ۱۷۵
○ ذکر کی اہمیت ۱۷۷
○ ذکر کے معنی ۱۸۱
○ اجتماعی ذکر ۱۸۴
○ ذکر کے طریقے ۱۸۶
○ کلماتِ ذکر کا اہتمام ۱۸۶
○ نماز ۱۸۷
○ موت کو یاد رکھنا ۱۹۰

- تلاوتِ قرآن ۱۹۱
- اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا ۱۹۴

تعلّق باللہ

- ربّ کی معرفت ۲۰۰
- رحمت اور ربوبیت ۲۰۲
- قدرت ۲۰۵
- حاضر و ناظر ۲۰۸
- اللہ کی کبریائی ۲۰۹
- تعلّق باللہ کی نوعیت ۲۱۰
- شکر ۲۱۰
- عملی نتائج ۲۱۶
- استغفار ۲۱۹
- عملی نتائج ۲۲۲

تعلّق باللہ: عملی تقاضے

- اخلاص ۲۲۵
- اللہ پر بھروسا ۲۳۲
- دعا ۲۳۷
- اطاعت اور فرماں برداری ۲۴۳

دنیا اور آخرت

- آخرت پر ایمان: بنیادی تقاضے ۲۵۰
- آخرت کو مقصود بنائیے ۲۵۴
- آخرت باقی رہنے والی ہے ۲۵۶
- آخرت میں اجر یقینی ہے ۲۵۸
- دنیا کی حیثیت ۲۵۹
- دو اہم پہلو ۲۶۳

مقدمہ

برادرم خرم مرادمرحوم اخلاص اور للّٰہیت کا پیکر تھے۔ ہم انھیں زمانہ طالب علمی سے جانتے تھے۔ وہ اسلامی جمعیت طلبہ کے اس وقت ناظم اعلیٰ تھے جب میں ابھی اسکول کا طالب علم تھا۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں ان کی کتاب ''تحریک اسلامی کے کارکنوں کے باہمی تعلقات'' ہمارے حلقے میں ایک معروف کتاب تھی۔ یہ موضوع ہماری تربیت گاہوں کا ایک اہم موضوع تھا جس پر تقریر کرنے والے خرم بھائی کی اس کتاب سے استفادہ کرتے تھے۔

خرم مرادؒ نے اپنی پوری زندگی اسلامی تحریک کی خاطر سوچ بچار' جدوجہد اور قربانی میں گزاری۔ وہ ثبات اور تغیر کے قائل تھے۔ اسلامی تحریک میں تنظیم اور پالیسیوں سے تعلق رکھنے والے کچھ امور قرآن وسنت کے نصوص سے تعلق رکھتے ہیں جو ناقابل تغیر اور اٹل ہیں' مثلاً ساری جدوجہد کا اصل مقصود اللہ کی رضا تک پہنچنا اور فلاح اخروی حاصل کرنا ہے۔ اللہ کی رضا تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جو حضور نبی کریمؐ کا راستہ ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ (احزاب ۳۳:۲۱) ''درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسولؐ میں ایک بہترین نمونہ تھا' ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخرت کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا راستہ کون سا ہے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اللہ کی رضا کے حصول کے لیے غارِ حرا سے مخلوق کی طرف آئے اور مخلوقِ خدا کو اللہ کی طرف دعوت دی یعنی حضور نبی کریمؐ کی رضا کے حصول کے لیے مخلوق کو چھوڑ کر کوہ و بیابان کی خلوت کی طرف نہیں، بلکہ غار و کوہ کی خلوت کو چھوڑ کر مخلوق کی طرف آئے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضور نبی کریمؐ نے مخلوقِ خدا کو اللہ کی طرف بلایا ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (یوسف ۱۲:۱۰۸) ''کہہ دو کہ میرا راستہ تو یہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، میں خود بھی پوری روشنی میں اپنا راستہ دیکھ رہا ہوں اور میرے ساتھی بھی۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (اٰل عمرٰن ۳:۱۶۴) ''اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انھی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انھیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے بھی یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں جو طریق کار وضع کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کو جماعت، بانی جماعت یا امیر جماعت کی طرف بلانے کی بجائے اللہ کی طرف بلایا جائے اور قرآن و سنت ہی کو حق و باطل کا معیار تسلیم کیا جائے۔ جہاں تک تفصیلی احکام مستنبط کرنے کا تعلق ہے، تو خواہ وہ تنظیم سے متعلق ہوں یا پالیسیوں اور حکمت عملی سے، ان میں اختلاف رائے کی گنجایش بھی موجود رہتی ہے اور زمانے اور حالات کے مطابق تبدیلیاں بھی آسکتی ہیں۔ جماعت کی قیادت اور اس کے کارکنوں میں اتنی وسعت ضرور ہونی

چاہیے کہ وہ وقت کے تقاضوں کو سمجھیں' اصل مقصود اور منصوص احکام اور قابل تغیر تنظیمی اور وقتی فیصلوں میں تمیز کرسکیں اور حالات کے مطابق حکمت عملی اختیار کرسکیں۔

یہی بات ۱۹۵۷ء کے ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی تاریخی تقریر ''تحریک اسلامی کا آیندہ لائحہ عمل'' میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ اس وقت جماعت کی تشکیل کو محض ۱۷ برس گزرے تھے لیکن اس دوران قیامِ پاکستان کا ایک بڑا واقعہ ظہور پذیر ہوگیا تھا جس کی وجہ سے حکمت عملی میں تبدیلیاں ناگزیر ہوگئی تھیں۔ لیکن کچھ لوگ پرانے ڈگر پر ہی اصرار کر رہے تھے اور مولانا مودودیؒ کی اپنی تحریروں سے ان کے خلاف دلائل نکال کر انھیں سنا رہے تھے جس پر مولانا نے انھیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

> جو شخص حالات اور مواقع اور ذرائع کی تبدیلی کے ساتھ ان اصولوں پر عمل درآمد کی شکلیں نہ بدل سکے' اس کی مثال میرے نزدیک اس عطائی طبیب کی سی ہے جو کسی حکیم کی بیاض کا ایک نسخہ لے کر بیٹھ جائے اور آنکھیں بند کر کے تمام مریضوں پر اسے جوں کا توں استعمال کرتا چلا جائے۔ (**تحریک اسلامی کا آیندہ لائحہ عمل**' ص ۱۱۷)

برادرم خرم مرادؒ کے بارے میں بھی لوگوں کو اعتراض ہے کہ وہ بعض امور میں جماعتی روایات اور طے شدہ ڈگر سے ہٹ کر رائے رکھتے ہیں۔ ان کی یہ بات درست ہوسکتی ہے لیکن یہی جدت ان کی تحریر اور ان کی رائے کے جان دار ہونے کی علامت ہے۔ ان کی یہ صلاحیت تحریک کے لیے مفید تھی کہ وہ قرآن و سنت کی تعلیمات کے دائرے میں رہتے ہوئے بنیادی مقصد اور مخصوص طریق کار پر نظر جما کر تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے نئے اسلوب کی طرف متوجہ کر دیتے تھے۔

تحریک اسلامی کا قافلہ الحمدللہ رواں دواں ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس قافلے میں جان ڈالنے کے لیے ایک زبردست اجتہادی کوشش کی اور پوری دنیا میں یہ تحریک

نئے سرے سے منظم ہوئی۔ لیکن یہ مولانا مودودیؒ کا نہیں' بلکہ انبیاء علیہم السلام کا تشکیل کردہ قافلہ ہے اور قیامت تک اس کے لیے اصل اسوہ اور معیار اللہ کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہمارا عقیدہ ہے۔ اس عقیدے کی بنیاد پر یہ قافلہ رواں دواں ہے۔ اس میں ہم سب چند قدم چل کر اپنا حصہ ڈال رہے ہیں اور حضور نبی کریمؐ کے ہر اُمتی کا فرض ہے کہ قدمے' سخنے' دامے درمے اپنی قوت اور استطاعت کے مطابق اس قافلے کو رواں دواں رکھے۔ خرم مرادؒ نے اپنی کتاب ''کارکن اور قیادت سے تحریک کے تقاضے'' میں بھی اس فرض کی طرف متوجہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اس کتاب کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنا دے۔

۲۸ مئی ۲۰۰۳ء　　　　(قاضی حسین احمد)

تحریک: کیا اور کیوں؟

اسلامی تحریک کیا ہے اور کیوں ہونا چاہیے؟

یہ بات معروف' واضح اور جانی پہچانی ہونی چاہیے' خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو ایک عرصے سے تحریک کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ بار بار کی کہی ہوئی اور بار بار کی سنی ہوئی بات کے اوپر گفتگو کیوں ضروری ہے؟

دراصل کسی بھی تحریک کے لیے اور اس سے وابستہ لوگوں کے لیے' اپنی زندگی کے ہر مرحلے پر سب سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ ان کے اصل مقصد اور دعوت کا شعور برابر تازہ ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ایک ہی بات کو بار بار دہراتا ہے۔ مکہ کی پہلی وحی سے لے کر مدینہ کی آخری وحی تک چند باتیں ہیں جن کا تذکرہ بار بار کیا جاتا ہے۔ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ایک اللہ کی بندگی کرنی چاہیے' اس کو دوبارہ دہرانے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز جانتا ہے' پھر اس کو بار بار کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ ---- یہ دراصل وہ بنیادیں ہیں جن کا تذکرہ اور تازگی بڑی اہم ہے۔ یہ اس لیے بھی اہم ہے کہ کسی چیز کا معلوم ہونا اور کسی چیز کا یاد رہنا' دونوں کے اندر بڑا فرق ہے۔

انسان کی دو بنیادی فطری کمزوریوں میں سے ایک جہالت نہیں' بلکہ بھول جانے کی اور دوسری غفلت کی کمزوری ہے۔ اس لیے اگر کوئی بات معلوم ہے تو اس کی یاد دہانی

ضروری ہے' اور اگر نہیں معلوم تو پھر اس کا صحیح فہم اور شعور ضروری ہے۔ یہ اپنے لیے بھی ضروری ہے اور تحریک کی ساری سرگرمیوں' منصوبوں اور پروگراموں کو صحیح رخ پر رکھنے کے لیے' اور دعوت کو صحیح انداز میں پیش کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔

ہوتا یہ ہے کہ جب تحریکوں اور تنظیموں پر ایک طویل مدت گزر جاتی ہے تو مقاصد کے اندر آمیزش شروع ہو جاتی ہے۔ جو مقصودِ اصلی ہوتا ہے' اس کے ساتھ دوسرے مقاصد آکر شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات صرف ڈھانچہ رہ جاتا ہے اور روح غائب ہو جاتی ہے۔ دستور میں لکھے ہوئے نصب العین اور مقاصد کا تعلق عملی زندگی سے کٹ جاتا ہے۔ وہ لوگ جو اس لٹریچر کو پڑھ کر تحریک کے ساتھ آئے ہوں کہ جس میں ''راہ رو پشت بہ منزل'' اور اس قافلے کا ذکر ہو جو چل تو رہا ہو پشاور کی طرف اور اس کے اوپر بورڈ لگا ہو کراچی کا' ان کو تو خاص طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ جائزہ لیتے رہیں کہ جو بورڈ لگا ہوا ہے اسی سمت میں جا رہے ہیں' یا ہم نے پیٹھ پھیر کر دوسری سمت میں چلنا شروع کر دیا ہے' یا دوسری راہوں پر نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ اس گفتگو کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم دوسری راہوں پر نکل گئے ہیں' بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس کی روشنی میں اپنا جائزہ لیں اور احتساب کریں۔

ایک اور وجہ یہ ہے کہ جب ''تحریک'' کا لفظ اپنایا گیا تھا تو وہ ایک نیا اور غیر معروف لفظ تھا۔ یہ لفظ خود قرآن و سنت میں نہیں پایا جاتا تھا۔ اب یہ لفظ مشہور ہو گیا ہے اور مقبول بھی ہے۔ جو لفظ مشہور و مقبول ہو جائے اور جسے بہت سے لوگ اختیار کر لیں تو اس کے اندر معنی کی کثرت پیدا ہو جاتی ہے۔ جو شخص جہاں پر بھی جو کام کر رہا ہے وہ اس کو ایک معنی دیتا ہے' خواہ وہ انگلینڈ میں ہو یا امریکہ میں' مراکش میں ہو یا ملائیشیا میں' یا ایران میں۔ اب ہر ایک اسلامی تحریک ہے۔ چنانچہ ہر ایک کا عمل اور اس کے تصورات اسلامی تحریک کو ایک معنی پہناتے ہیں۔ اس طرح معنی میں کثرت بھی پیدا ہوتی ہے اور الجھاؤ بھی۔ معنی صرف تقریر' گفتگو اور لٹریچر سے ہی متعین نہیں ہوتے بلکہ عمل

سے بھی متعین ہوتے ہیں، اور اپنا عمل اور دوسروں کا عمل، نئے معنی پہنانے لگتا ہے۔ ظاہر ہے کہ لوگ الفاظ کے بیان سے زیادہ عمل کے بیان سے سیکھتے ہیں۔ اس لیے یہ موضوع بڑی بنیادی اہمیت کا موضوع ہے۔

تحریک سے مراد

سوال یہ ہے کہ تحریک کیا چیز ہے؟

''تحریک'' کا لفظ ایک نیا لفظ ہے اور اسے ہم نے اپنی ہم عصر تہذیب کی لغت سے اختیار کیا ہے اور اس پر لوگوں نے اعتراضات بھی کیے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ تحریک کا لفظ اختیار کر کے دراصل دین و مذہب کو سیاسی شکل دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اعتراض بہت بڑے بڑے مفکرین اور علما کی طرف سے بھی کیا گیا۔ اس اعتراض کا جائزہ ہم بعد میں لیں گے۔ پہلے اس بات کو جاننے کی ضرورت ہے کہ ''تحریک'' کا لفظ فی الواقع کن معنوں میں اختیار کیا گیا ہے۔

اس کے لغوی معنی کئی افراد کے مجموعے کی طرف سے کسی اجتماعی مقصد کے حصول کے لیے مسلسل عمل اور کوشش کے ہیں۔

تحریک کا لفظ انگریزی زبان کے لفظ movement سے لیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے غور کیا جائے تو تحریک کے لیے تین اجزا لازمی ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی غائب ہوگا تو اس کو تحریک نہیں کہا جا سکتا، ممکن ہے کچھ اور کہا جائے۔

ایک یہ کہ اس کے سامنے ایک مقصود ہو، اور وہ مقصود ایسا ہو جو اجتماعی زندگی کو بھی تشکیل دے۔ انفرادی مقصد، تحریک کا مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس مقصود کے ساتھ ایک واضح تصورِ حیات بھی ہونا چاہیے۔ اسے کسی بھی لفظ سے اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ جدید اصطلاحات میں اسے نظریۂ حیات (ideology)، یا ورلڈ ویو (world view)، یا اس کائنات میں انسان کا تصور کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر اجتماعی مقصد کا تعین ممکن نہیں۔

دوسری بات یہ کہ اس کے اندر اجتماعیت اور تنظیم ہو۔ کسی ایک فرد کی کوشش کو ادبی پیرائے میں تو تحریک کہا جا سکتا ہے کہ یہ شخص اپنی ذات میں ایک تحریک ہے لیکن عام معنوں میں' تحریک کے لیے اجتماعیت اور تنظیم لازم ہے۔

تیسری چیز یہ کہ اس کے اندر اجتماعی جدوجہد اور کوشش شامل ہو۔

یہ تین اجزا لفظ ''تحریک'' کے اندر بنیادی طور پر شامل ہیں۔ ان ہی تین پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ہم دیکھیں گے کہ اسلامی تحریک کیا ہے؟ اس کے بعد اگر ہم اپنا جائزہ لینا چاہیں تو ان ہی اصولوں کی روشنی میں لے سکیں گے۔

''اسلامی تحریک'' کے لفظ میں اصل لفظ ''اسلامی'' ہے جسے ہم بار بار بولتے ہیں۔ گویا ''اسلامی'' کا لفظ اس تحریک کے ہر پہلو (dimension) کی تعریف کرے گا' تشکیل دے گا' اور رہنمائی کرے گا۔

یہاں اس وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام کیا ہے؟ اس لیے کہ اسلام کی تعریف اور اس کا تصور ہماری زبانوں پر اور تقریروں میں بھی ہے اور ہمارے لٹریچر میں بھی موجود ہے۔ لیکن بات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے چند لمحات اسلام کے تصور کو سمجھنے میں صرف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں تاکہ ہم اپنے ذہن میں یہ تازہ کر لیں کہ اسلام سے ہمارے پیش نظر کیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ : ایک مثالی مسلمان

کسی چیز کی تعریف الفاظ میں بھی ہو سکتی ہے اور ایک دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اس کا کوئی ماڈل دیکھیں۔ ''ماڈل'' ایک جدید اصطلاح ہے لیکن افکار و تصورات کو ذہن میں واضح کرنے کے لیے عام طور پر یہ مفید ہوتا ہے۔

اگر ہم اسلام کو ماڈل سے سمجھنا چاہیں' تو قرآن مجید کی رو سے اس کا بہترین ماڈل حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت ہے۔ وہ پہلے سب سے نمایاں مسلمان تھے۔ پہلے سے

مراد زبانی طور پر یا اعداد کے لحاظ سے نہیں بلکہ بحیثیت مسلمان ان کی سب سے نمایاں شخصیت تھی۔

ان کے ماڈل پر اگر ہم غور کریں تو پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ ان کی زندگی کا پورا رخ اور اس کی سمت اللہ کی طرف متعین ہوگئی تھی۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝ (الانعام ۶: ۷۹)

میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

گویا مزاج، کردار اور اعمال میں جو تبدیلیاں آنی ہیں وہ بعد میں آتی رہیں گی، لیکن پہلی چیز شخصیت کا رخ ہے، وہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف مڑ گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سارے پرانے تعلقات کو کاٹ کر، ان سب کو اللہ کے ساتھ جوڑا۔ اگر غور کیا جائے تو انسان کی اجتماعی زندگی دراصل تعلقات کے مجموعے کا ہی نام ہے۔ وہ تعلقات جو آدمی خاندان سے، معاشرے سے، انسانوں سے اور مادی چیزوں سے، مال سے، مفادات سے، یا افراد سے، قائم کرتا ہے، ان سب کا نام ہی زندگی اور خاص طور پر اجتماعی زندگی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے فرمایا:

اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کَفَرْنَا بِکُمْ وَبَدَا بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ

(الممتحنہ ۶۰: ۴)

ہم تم سے اور تمھارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمھارے درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

یعنی ہم تم سے بری ہیں اور تمام تعلقات کو تم سے توڑ لیا خواہ یہ تعلق وطن سے ہو، والدین

سے ہو گھر سے ہو یا بیٹے سے۔ گویا ہر تعلق پر اللہ تعالیٰ کا تعلق غالب آگیا۔

تیسری بات، خود سپردگی کی ایک خاص کیفیت تھی یعنی جب یہ معلوم ہوا کہ یہ مولیٰ کی مرضی ہے تو بغیر کسی ہچکچاہٹ اور بغیر کسی تحفظ کے وہ اس کی تعمیل کے لیے تیار تھے۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ (البقرہ ۲:۱۳۱)

جب اس کے رب نے اس سے کہا: "مسلم ہو جا" تو اس نے فوراً کہا: "میں مالک کائنات کا "مسلم" ہوگیا"۔

گویا جب بھی ان کے رب نے ان سے کہا کہ اپنے آپ کو سپرد کردو تو انھوں نے کہا کہ میں حاضر ہوں یعنی وہ اپنے آپ کو سپرد کرنے کے لیے ہر وقت تیار تھے۔

چوتھی بات حضرت ابراہیمؑ کے اسوہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کو صرف اپنی ذات ہی کی فکر نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ وہ ادارے اور وہ معاشرہ قائم ہو جس کے نتیجے میں آنے والی نسلیں بھی اسی مسلک پر قائم رہیں۔ چنانچہ خانہ کعبہ کی تعمیر کی اور اس کے بعد اس بات کی دعا کی کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرے اور ایک ایسی امت پیدا ہو جو اس کی اطاعت کرنے والی ہو--- یہ تمام چیزیں ظاہر کرتی ہیں کہ کوشش اس بات پر بھی صرف ہو کہ ادارے وجود میں آئیں اور آیندہ نسلوں کو بھی اسی راہ پر قائم رکھنے کا اہتمام ہو سکے جو اللہ کی بندگی کی راہ ہے۔

ہم اگر صرف اس ایک شخص کے ماڈل کو سامنے رکھیں تو یہ "اسلامی" کی وہ تعریف ہے جو ہمارے سامنے آتی ہے۔ یہ بڑی جامع اور دل کش تعریف ہے۔ اس کے ذریعے وہ بات سمجھ میں آجاتی ہے جو بہت سی تقاریر اور کتابوں سے شاید سمجھ میں نہ آتی ہو۔ اسلامی تحریک کے امامِ اول حضرت ابراہیمؑ کی روش کا ماڈل جب تحریک کے ساتھ لگے گا تو اس کو وہ پوری طرح واضح کردے گا۔

اس ماڈل کو سامنے رکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے

لیے اللہ کی بندگی اختیار کرنا' اس کی دعوت دینا' اس کے غلبے کے لیے جدوجہد کرنا یہی وہ کام تھا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے سارے انبیاے کرام کے سپرد کیا تھا۔ انبیا نے بنیادی طور پر دو باتوں کی طرف دعوت دی۔ ایک یہ کہ اللہ کی بندگی کرو' دوسرے یہ کہ انبیا کی اطاعت کرو:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ط (الاعراف ۷: ۵۹)

اے برادرانِ قوم' اللہ کی بندگی کرو' اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔

اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌo فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ o

(الشعراء ۲۶: ۱۰۷-۱۰۸)

میں تمھارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں' لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

پہلی دعوت صرف ایک فلسفہ بن جائے گی اگر اس کے ساتھ دوسری دعوت شامل نہ ہو کہ قیادت دراصل انبیا کا حق ہے' یا جو ان کے پیروکار ہوں' ان کا حق ہے۔

یہاں ''الٰہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جسے عام طور پر مسلمان پوری طرح نہیں سمجھتے' بلکہ مسلمان ہی کیا بہت سے لوگ نہیں سمجھتے۔

''الٰہ'' کا لفظ قرآن مجید نے ہر اس چیز کے لیے استعمال کیا ہے جو انسان کی وفاداری اور وابستگی کا ایسا مرکز بن جائے جس کے پیچھے انسان اپنے آپ کو لگا دے اور دوڑے۔ یہ اپنی خواہش بھی ہوسکتی ہے' اور خود انسان کا اپنا نفس بھی ''الٰہ'' بن سکتا ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ط (الفرقان ۲۵: ۴۳)

کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنالیا ہو؟

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبة ۹: ۳۱)

انھوں نے اپنے علما اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے۔

حضرت عدیؓ بن حاتم عیسائی تھے۔ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ انھوں نے جب اس آیت کو پڑھا تو ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر ہم اپنے علما کو اپنا رب کیسے بنالیں گے؟ چنانچہ وہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا کہ ہم اپنے علما کو سجدہ نہیں کرتے' ان کی پرستش نہیں کرتے تو پھر یہ کیا بات ہوئی کہ قرآن نے کہا ہے کہ ہم ان کو اپنا رب بنالیں گے؟ حضورؐ نے فرمایا کہ جس کو وہ حرام قرار دیتے ہیں اس کو تم حرام سمجھتے ہو' جس کو وہ حلال قرار دیتے ہیں اس کو تم حلال سمجھتے ہو' قانون سازی کے سارے اختیارات تم نے ان کے حوالے کر دیے ہیں۔ گویا اس طرح انسان بھی ''الٰہ'' بن سکتے ہیں۔

قرآن کی دعوت صرف اتنی نہیں ہے کہ صرف اللہ کی بندگی کرنی ہے بلکہ اللہ کے علاوہ جتنے الٰہ ہیں وہ سب غلط ہیں اور ان کا خاتمہ ضروری ہے۔ اسی طرح انبیا کی دعوت بھی صرف اتنی نہیں ہے کہ اطیعونی' یعنی میری اطاعت کرو بلکہ اس کے ساتھ ارشاد فرمایا:

وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ o الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ o (الشعراء ۲۶: ۱۵۱-۱۵۲)

''ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے''۔

یعنی جو لوگ اللہ کی بندگی کی حد سے نکل جانے والے ہیں ان کی بندگی مت کرو۔

گویا صرف مثبت دعوت ہی نہیں ہے' بلکہ اس کا ایک منفی پہلو بھی ساتھ ساتھ موجود ہے' یعنی غیراللہ کا انکار اور انبیا کے علاوہ دوسروں کی قیادت سے بغاوت اور ان کی اطاعت نہ کرنا۔ یہ وہ پہلو ہے جو اُس انقلابیت کو جنم دیتا ہے جس کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ ہماری تحریک ایک انقلابی تحریک ہے۔

تحریک: ایک نئی اصطلاح

''انقلابی'' کا لفظ ایک جدید لفظ ہے۔ اس پر ماضی میں بھی بحث ہوتی رہی ہے اور اب پھر نئے سرے سے بحث شروع ہے کہ آیا یہ لفظ صحیح ہے یا غلط۔ لوگ چونکہ ''انقلاب'' سے ''انقلاب فرانس'' اور ''انقلاب روس'' ہی کو سامنے رکھتے ہیں' اس لیے اسی پیمانے پر ناپتے ہیں۔ لیکن جب ہم ''انقلاب'' کا لفظ بولتے ہیں تو ہمارے سامنے صرف یہ بات ہوتی ہے کہ یہ انسان کی پوری زندگی کی بنیادوں' یعنی اس کا رخ' سمت' قبلہ اور اس کے پورے ڈھانچے کا پلٹ جانا ہے۔ اس کے معنی محض کشت وخون یا خوں ریزی کے نہیں ہے' تاہم اگر اس کی ناگزیر ضرورت ہو تو وہ بھی ہو سکتی ہے۔

اس پورے مقصد کے کچھ اور پہلو بھی ہیں جن کو قرآن نے مختلف الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔ وہ اسی ایک مقصد کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں' یا ان کو ایک نئے انداز میں پیش کرتے ہیں' یا پھر کسی ایک پہلو پر زور دیتے ہیں۔

قرآن نے اس کے لیے ایک لفظ ''بلاغ'' اور ''دعوت'' کا استعمال کیا ہے۔ ظاہر ہے ابلاغ اور دعوت میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ آدمی کچھ کام کر دکھائے بلکہ بنیادی دعوت کا پہنچانا ضروری ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

وَمَا عَلَيْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ (یٰس ۳۶: ۱۷)

اور ہم پر صاف صاف پیغام پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

بعض حالات میں آدمی اس سے بڑھ کر کوئی کام نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی بات پہنچا دے۔ لیکن بات پہنچانے سے کم کسی اسلامی تحریک کا تصور نہیں ہو سکتا۔

اگر کوئی اسلامی تحریک بات پہنچانے کا کام ہی نہ کر رہی ہو' خواہ وہ نتائج نہ حاصل کر سکے اور خدا کی بندگی قائم نہ کر سکے لیکن اگر وہ دعوت پہنچانے کے فرض سے بھی دست بردار ہو جائے جو کہ بالکل بنیادی فرض ہے اور اس کے اختیارات سے باہر نہیں' تو اسے اسلامی تحریک نہیں کہا جا سکتا۔ یہ رسالت کی سب سے پہلی اور بنیادی ذمہ داری ہے

جو مجموعی مقصد کا ایک پہلو ہے۔ بات پہنچے گی' لوگ جانیں گے' مانیں گے' ساتھ آئیں گے اور جدوجہد ہو سکے گی اور پھر باقی مراحل طے پا سکیں گے۔اس لیے' پہلا قدم بات پہنچانا ہے۔ یہ وہی بات ہے جس کے بارے میں اس طرح سے اشارہ کیا گیا ہے:

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ (المائدہ ۵:۶۷)

جو کچھ تمھارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔

اسی طرح دوسرے الفاظ ہیں جو بولے بھی جاتے ہیں اور سنے بھی جاتے ہیں کہ دین قائم ہونا چاہیے' دین غالب ہونا چاہیے' اللہ کا کلمہ بلند ہونا چاہیے' اسلامی ریاست قائم ہونی چاہیے' یہ سب الفاظ اسی دعوت کے مختلف پہلو ہیں۔

ان میں سے کوئی بھی فی نفسہ بالذات مقصود نہیں ہے' بلکہ یہ سب اسی دعوت کی صورت گری اور اس کی تشکیل کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنا بڑا ضروری ہے کہ اس دعوت کا جہاں ایک پہلو یہ ہے کہ اللہ کی بندگی قائم ہو' وہاں اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں کی زندگی انصاف کے اوپر قائم ہو۔ دراصل جہاد اور تمام جدوجہد اسی مقصد کے لیے ہے۔ اس بات کو سورۃ الحدید میں بڑے واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ٥ (الحدید ۵۷:۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا' اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں' اور لوہا

اتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ کون اس کو دیکھے بغیر اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔

یہ نہایت اہم بات ہے۔ اس لیے اس کو نظروں سے کبھی اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔

اس ساری بحث کو سمیٹ کر قرآن نے ایک لفظ ''شہادت حق'' میں بیان کیا ہے:

لِتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ ۲: ۱۴۳)

تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔

یہی اس امت کا مقصدِ تشکیل ہے۔ آدمی کسی بات میں کامیاب ہو یا نہ ہو' لیکن جو کچھ بھی وسائل اور ذرائع اس کو میسر ہیں' جو وقت میسر ہے' جتنا کچھ وہ کر سکتا ہے' اس سب سے اسے اللہ کے دین کی گواہی کا کام ضرور کرنا چاہیے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب قرآن مجید میں یہ سارے لفظ موجود تھے تو پھر اس بات کی کیا ضرورت تھی کہ ہم ایک لفظ ''تحریک'' وضع کریں اور پھر اس کو استعمال کریں جس پر لوگ اعتراض بھی کرتے ہیں' اور اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ کثرت استعمال اور گردش زمانہ سے الفاظ اپنے معنی کھوتے رہتے ہیں۔ ایمان' اسلام اور جہاد کے وہ الفاظ جو ایک زمانے میں انقلابی دعوت کے مظہر تھے وہ بالآخر اپنی انقلابیت سے دستبردار ہو گئے۔ وہی اذان جس کو سننا لوگوں کو گوارا نہیں ہوتا تھا آج وہی اذان' واشنگٹن میں' مسجد میں پانچ وقت بلند ہوتی ہے اور امریکہ کا صدر اس مسجد کا خود افتتاح کرتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لا الہ الا اللہ کے الفاظ وہ معنی کھو چکے ہیں جو ابتدا میں تھے۔

جب قرآن کہتا ہے کہ:

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط (البقرہ ۲: ۲۸۴)

آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔

یہ جہاں ایک زبردست روحانی دعوت ہے کہ آدمی پورے کا پورا اللہ کا ہو جائے' وہیں اس کا انقلابی اور سیاسی پہلو بھی ہے' یعنی کوئی بھی چیز کسی دوسرے کی نہیں ہے' بلکہ ہر چیز اللہ کی ہے۔ اب ہم یہ بھی صبح و شام پڑھتے ہیں لیکن اس کے معنی بھی ضائع ہو چکے یا گم ہو چکے ہیں۔

خود ''تحریک'' کے لفظ کے ساتھ بھی یہ سانحہ آہستہ آہستہ پیش آنا شروع ہو گیا ہے۔ ہم ''تحریک'' میں جمود کی بات کرتے ہیں' غیر فعال کارکن کا لفظ بولتے ہیں حالانکہ دونوں لفظ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ہم باعمل مسلمان (practicing muslim) کا لفظ بولتے ہیں حالانکہ مسلم کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ جو عمل (practice) کرتا ہو' یعنی تابع فرمان ہو۔ کارکن کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو کام کرتا ہو لیکن ''غیر فعال کارکن'' کا لفظ ہماری لغت میں موجود ہے یا ایک اصطلاح بن چکا ہے۔ ''تحریک'' کے معنی ہی حرکت کے ہیں' جمود کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا مگر ہم ''جامد'' اور ''تحریک میں جمود'' کے الفاظ بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ یہی سرگزشت ان الفاظ کے اوپر گزری۔ اس لیے ہم نے ایک نئے لفظ کو استعمال کیا۔

نئے الفاظ کا استعمال مسلمانوں نے ہمیشہ کیا ہے۔ جب بھی ان کو اپنے معنی اور مفہوم کو سمجھانے کے لیے ضرورت پڑی ہے تو انھوں نے اس میں کبھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی کہ وہ اپنے مخاطبین کے فہم اور ان کی لغت کے لحاظ سے نئے الفاظ استعمال کریں بلکہ اللہ تعالیٰ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ ہم نے ہر نبی کو اس کی قوم کی زبان میں بھیجا تاکہ وہ اللہ کے پیغام کو واضح کر سکے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ (ابراھیم ۱۴:۴)

ہم نے اپنا پیغام دینے کے لیے جب کبھی کوئی رسول بھیجا ہے' اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انھیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔

یعنی ہم جس قوم سے‘ جس معاشرے سے‘ جس زمانے اور دور میں بات کریں گے‘ اس کی زبان ہی میں اس کو بات بہتر طور پر کہی اور سمجھائی جاسکتی ہے۔ مسلمان ایران گئے‘ وہاں پر ’’اللہ‘‘ کے ساتھ ساتھ ’’خدا‘‘ کا لفظ استعمال ہوتا تھا۔ انھوں نے اس پر اصرار نہیں کیا کہ ہم لازماً ’’اللہ‘‘ کا لفظ استعمال کریں گے بلکہ ’’خدا‘‘ کا لفظ اختیار کرلیا اور اس کو وہی معنی پہنا دیے جو اللہ کے لفظ میں پوشیدہ تھے۔ ’’صلوٰۃ‘‘ کے لیے ’’نماز‘‘ کا لفظ ایران میں مستعمل تھا۔ انھوں نے نماز کا لفظ اختیار کرلیا اور اسے وہی معنی پہنا دیے جو مطلوب تھے۔ اسی طرح جیسے جیسے ضرورت پڑی تو شریعت‘ تصوف اور فقہ کے الفاظ استعمال کیے گئے۔ اگرچہ یہ سارے الفاظ قرآن وسنت کے اندر موجود نہیں ہیں لیکن ہم نے ان اصطلاحات کو وضع کیا تاکہ ہماری بات پھیل سکے اور معروف ہو سکے۔

موجودہ دور میں اسلام کے تصور کو اجاگر کرنے کے لیے ہم نے لفظ ’’تحریک‘‘ اختیار کیا اور اس کے نظائر موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس لفظ کی خاطر‘ اصل اصطلاحات سے دستبردار نہ ہو جائیں۔ چنانچہ ایمان‘ جہاد‘ شہادت حق اور دعوت‘ یہ اصطلاحات بھی ساتھ ساتھ تحریک کے اندر رہنی چاہییں تاکہ ’’تحریک‘‘ کا لفظ خود وہی معنی رکھے جو معنی قرآن وسنت سے اخذ کیے جاسکتے ہیں۔

تحریک کی خصوصیات

تیسرا سوال یہ ہے کہ تحریک کی کیا خصوصیات ہیں اور کیا نہیں ہیں؟ یا تحریک کو کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ یعنی وہ باتیں جن کو سامنے رکھ کر ہم یہ سمجھ سکیں کہ یہ تحریک ایک اسلامی تحریک ہے۔

ابدی اور مستقل حیثیت: پہلی بات جو ایک اصولی اور معروف بات ہے‘ وہ یہ ہے کہ یہ ایک مستقل نوعیت کی تحریک ہو۔ یہ کسی مخصوص صورت حال کا ردعمل نہیں ہونی چاہیے۔ یہ بات الفاظ میں کہنا آسان ہے لیکن حالات اس چیز کو متاثر کرتے

ہیں۔ کہیں مسلمان غلام ہیں' کہیں ان پر اقوامِ غیر کی چیرہ دستی ہے' اور کہیں انھیں اپنا سیاسی نظام تشکیل دینا ہے' اور کہیں مسلمانوں نے نئی نئی آزادی حاصل کی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ اسلام کی راہ پر چلیں۔ یہ سب حالات مستقل نوعیت کے حالات نہیں ہیں بلکہ یہ سب مخصوص حالات ہیں۔ یہ حالات اگر ایک جگہ پائے جاتے ہیں تو دوسری جگہ مفقود ہوسکتے ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ یہ تحریک ایک مستقل نوعیت کی تحریک ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی مخصوص صورت حال کا ردعمل نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر اگر کہیں بادشاہت ہے تو اسلامی تحریک کا وجود محض اس لیے ضروری نہیں ہے تاکہ بادشاہت کا احاطہ کیا جا سکے' یا کہیں کوئی ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اس لیے وہاں اسلامی تحریک کی ضرورت ہے تاکہ ملک کو اسلام کی راہ پر لے کر چل سکے' یا کہیں اقوام غیر غالب ہوگئی ہیں' تو اسلامی تحریک اس لیے ضروری ہے کہ وہ ان کی غلامی سے نجات دلا سکے۔ غرض کیسے بھی حالات ہوں' یہ تحریک اپنی ایک ابدی اور مستقل حیثیت رکھتی ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا خدشہ ہے کہ گویا یہ ایک ایسی تحریک ہے جو مجرد (abstract) خیالات کے اندر رہتی ہے جس کا زمانے کے حالات و تغیر سے کوئی تعلق نہیں۔ بظاہر یہ دونوں باتیں متضاد محسوس ہوتی ہیں کہ ایک تحریک ابدی اور مستقل نوعیت کی بھی ہو' لیکن اس کو بڑی گہری دل چسپی ہو' ان حالات سے جو معاشرے کو درپیش ہوں۔ دراصل تحریک خلا میں کام نہیں کرتی بلکہ وہ ٹھوس زمین اور زندہ معاشروں میں کام کرتی ہے۔ اسی لیے انبیا علیہم السلام کی دعوت کا جہاں ایک جز یہ رہا کہ صرف اللہ کی بندگی اختیار کرو اور صرف میری اطاعت کرو' وہاں دوسرا جز ہمیشہ معاشرے کے بنیادی مسائل سے متعلق رہا۔ اگر بنی اسرائیل تھے تو سیاسی آزادی کا مطالبہ کیا۔ اگر قوم عاد تھی تو اس کی جہاں گیری (imperialism) کے خلاف آواز اٹھائی۔ اگر قوم نوح تھی تو اس کی طبقاتی کش مکش کے خلاف پکار بلند کی گئی' اور اگر قوم لوط تھی تو اخلاقی اباحیت کے

خلاف دعوت دی گئی۔ گویا ہر دعوت معاشرے کے زندہ مسائل اور دلچسپیوں سے متعلق تھی۔ اس کی حیثیت ردعمل کی نہیں تھی۔ وہ دعوت' اللہ کی بندگی کی بنیادی دعوت پر مشتمل تھی لیکن معاشرے اور انسان سے غیر متعلق نہیں تھی۔

ہمہ گیر نوعیت: دوسری بات ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک ہمہ گیر نوعیت کی تحریک ہے۔ جو بات آج کل خاص طور پر بڑی اہم ہے' وہ یہ ہے کہ اس کا کوئی جزوی مقصد نہیں ہے۔ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہم علم کو ترویج دیں' لیکن اسلامی تحریک کسی مدرسے کا نام نہیں ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تزکیہ ہو' لیکن اسلامی تحریک کسی خانقاہ کا نام نہیں ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی ریاست برپا ہو اور اقتدار صالحین کے ہاتھ میں ہو' لیکن اسلامی تحریک کسی سیاسی پارٹی کا نام بھی نہیں ہے۔ اسی طرح ادارے اور تنظیمیں بنانا اور ان کو چلاتے رہنا بھی اسلامی تحریک کا مقصد نہیں ہے۔

اسلامی تحریک کا مقصد تو یہ ہے کہ اللہ کی بندگی قائم ہو اور لوگ اللہ کی خوشنودی حاصل کر کے آخرت میں اس کی جنت کے مستحق ٹھہریں۔ اگر تحصیل علم ہو تو اسی لیے' تزکیہ ہو تو اسی لیے' سیاست ہو تو اسی لیے' اگر ادارہ بنایا جائے تو اسی لیے' غرض جو کام بھی ہو اسی بنیادی مقصد کے لیے ہو--- یعنی اگر یہ ہمہ گیر مقصد سامنے ہو تو جزوی کام بھی اپنی جگہ پر ہو سکتے ہیں۔

کسی کا یہ جملہ بہت خوب ہے کہ: اسلام تو نام ہے چلتی پھرتی خانقاہوں کا اور دوڑتے بھاگتے مدرسوں کا۔ گویا علم ایک جگہ پر ساکن نہیں ہے اور تزکیہ چار دیواری کے اندر محدود نہیں ہے بلکہ یہ خانقاہیں بھاگتی دوڑتی ہیں اور علم کے مدرسے چلتے پھرتے ہیں۔

مقصود و مطلوب' رضائے الٰہی: تیسری بات جو اس کی تعریف سے متعین ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کی ساری سرگرمیوں' پروگراموں' منصوبوں اور جدوجہد کا مقصود و مطلوب صرف اللہ کی رضا کو ہونا چاہیے۔ ہر عمل کا محرک' ہر کوشش کا محور اور

کامیابی کا آخری معیار یہی ہو۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اللہ کی رضا کی تعبیر جنت ہے۔ ان دونوں کا باہم گہرا تعلق ہے لیکن ہم میں سے اکثر اسے بھول چکے ہیں۔ اس بارے میں مختصراً چند باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔

اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ دنیاوی مقاصد کے لیے جدوجہد نہیں ہوگی۔ دنیاوی مقاصد کے لیے' اسلامی معاشرہ قائم کرنے کے لیے' اسلامی ریاست قائم کرنے کے لیے' اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے' تسخیر کائنات کے لیے--- یہ سارے کام ہوں گے اور کیے جانے چاہییں لیکن ان سب کی حیثیت ذرائع کی ہے۔ یہاں تک کہ اس پوری تنظیم کی حیثیت بھی ذریعے کی ہے' مقصد کی نہیں۔ یہ اسی وقت تک تحریک ہے جب تک یہ اپنا مقصد پورا کر رہی ہے۔ دنیا میں بہت سی ایسی تنظیمیں ہیں جو تحریک بن کر نمودار ہوئیں بالآخر صرف تنظیم اور ایک سوسائٹی بن کر رہ گئیں۔ یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی مقصود و مطلوب ہو اور اس کی رضا محور و محرک ہو' اور یہ بات ہمیشہ سامنے رہے۔ یہی چیز دراصل متعین کرتی ہے کہ یہ تحریک کہاں تک اس مقصد کے حصول کے لیے سرگرمِ عمل اور مخلص ہے۔

جب ذرائع مقصود بن جائیں اور آدمی ساری قوتیں انھی کے گرد لگا دے تو پھر اس کے معنی یہ ہیں کہ اب خرابی کا آغاز ہوگیا ہے۔ جب انسان کے حوصلے صرف دنیاوی کامیابی کے ہونے یا نہ ہونے سے بلند اور پست ہونے لگیں' تو اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ مقصود و مطلوب کے اندر فرق آگیا ہے۔ یہ ایک اور پیمانہ ہے جس سے یہ ناپا جا سکتا ہے کہ اسلامی تحریک کی خصوصیات موجود ہیں یا ان میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے۔

کامیابی اور ناکامی کا معیار: چوتھی بات جو یاد رکھنے کی ہے' اور میری نظر میں بہت بنیادی ہے' وہ یہ کہ فرد کا مقصود تو ضرور رضاے الٰہی اور جنت ہوگا' اور یہ ہمیشہ تازہ و تابندہ اور زندہ رہنا چاہیے' لیکن تنظیم اور جماعت کا مقصد یہ ہے کہ وہ افراد کی سعی و جہد کو اس طرح صرف کرے کہ فرد آخرت میں اپنے مقصد کے اندر کامیاب ہو' اور تحریک دنیا کے اندر کامیابی حاصل کر سکے۔ اس کو قرآن نے ''فتح'' کے لفظ سے تعبیر

کیا ہے۔

یہ خطاب کہ ''وہ تجارت جو تمھیں عذاب الیم سے نجات دے'' افراد سے ہے جن کی آخری منزل جنت ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بار بار صاف اور واضح طور پر کہی ہے کہ ہر فرد بحیثیت فرد کے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ کوئی جماعت خواہ وہ جماعت اسلامی ہو یا اخوان المسلمون' بحیثیت مجموعی کھڑے ہو کر اللہ کے سامنے جواب دہی نہیں کرے گی۔ یہاں سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بنیادی چیز ارادہ اور سعی ہے۔ ارادہ اور سعی فرد کا کام ہے' جماعت کا کام نہیں۔ ہر فرد اس بات کے لیے جواب دہ ہوگا کہ اس نے کیا کیا؟ اس کا کارنامۂ عمل اگر مقبول ہوگیا تو وہ کامیاب ہوگیا۔

تحریک کی ذمہ داری محض اتنی بھی نہیں ہے کہ یہ کہہ کر اطمینان حاصل کرلیا جائے کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے کرنے سے ہوتا ہے' اور جب تک افراد اللہ کی رضا کی طلب میں مصروف ہیں تو بس ہمارا کام ہوگیا۔ اس سے تحریک کی ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی۔

تحریک کی ذمہ داری یہ ہے کہ عقل و دانش استعمال کر کے اپنے وسائل کو بہترین طریقے سے صرف کرے' تاکہ دنیا میں جسے ''فتح قریب'' کہا گیا ہے اس کے حاصل ہونے کے امکانات پیدا ہوں۔ قرآن پاک میں اس طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے:

وَأُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط (الصف ۶۱:۱۳)

اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو' وہ بھی تمھیں دے گا' اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔

یہاں یہ بات بھی جان لینا ضروری ہے کہ یہ ممکن ہے کہ فرد کامیاب ہو اور جماعت ناکام۔ اگر فرد نے اپنا سب کچھ لگا دیا اور جماعت اپنی منزل تک نہ پہنچ سکی تو جماعت بظاہر دنیا کے پیمانوں سے ناکام ٹھہرے گی لیکن فرد کامیاب ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت اور تحریک اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے لیکن فرد ناکام ہو جائے۔ اس

لیے کہ اس کی نیت خالص نہیں تھی، اس کی کوشش میں کمی تھی یا اور بھی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

اگر ہم نے کامیابی کے ان دونوں معیاروں کو اپنے سامنے رکھا تو اپنے جائزے اور احتساب میں ہمیشہ آسانی ہوگی۔ فرد کی حیثیت سے اگر اللہ کی رضا کے حصول میں کوتاہی ہے تو خواہ وہ فرد کتنے ہی نعرے لگا لے، جلسے کر لے، تقریریں کر لے اور پوسٹر لگا لے، بہرحال وہ ناکام ہوگا۔ اسی طرح جماعت کی حیثیت سے افراد کتنا ہی اچھا کام کر رہے ہوں، قربانی کے جذبے سے سرشار ہوں لیکن جماعت اگر افراد کے جذبے کو صحیح راہوں پر، صحیح حکمت عملی سے، صحیح رخ پر نہ لگائے تو بہرحال جماعت اس دنیا کے اندر ناکام ہوگی۔ ممکن ہے کہ جماعت کے قائدین ذمہ دار ٹھہریں کہ انھوں نے کیوں ان وسائل اور ذرائع کو ضائع کیا اور صحیح مصرف میں نہ لگایا۔

فرد اور جماعت کا تعلق : پانچویں چیز فرد اور جماعت کا تعلق ہے جو دنیا کی ساری اجتماعی تنظیموں کا بڑا بنیادی مسئلہ ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اصل چیز فرد ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اصل چیز جماعت ہے۔ چونکہ جماعت اور معاشرہ فرد کی تشکیل کرتے ہیں، اس لیے فرد کو اپنی شخصیت کو اجتماعیت کی خاطر قربان کر دینا چاہیے۔ بعض کی رائے ہے کہ اصل چیز تو فرد ہے۔ اس لیے کہ پوری جماعت اور معاشرہ فرد کو آگے بڑھانے کے لیے وجود میں آتے ہیں۔ اسلام نے ان دونوں میں توازن پیدا کیا ہے۔ آخرت کی کامیابی کے لحاظ سے فرد ہی اصل ہے۔ اس لیے جماعت، ریاست اور معاشرے کی سب کوششوں کو اسی بات پر مرکوز ہونا چاہیے کہ فرد کے لیے ایسے مواقع اور امکانات پیدا ہوں جس سے وہ اپنے اس مقصد کو حاصل کر سکے۔

انسانی زندگی مجموعہ ہے باہمی تعلقات کا، اور وہ نام ہے معاشرے اور جماعت کا۔ اس لحاظ سے جماعت کی یہ اہمیت ہے کہ جماعت کے بغیر انسان اپنے مقصد کو حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جو کسی حسابی فارمولے سے حل ہو جائے بلکہ یوں

سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک طرح کا تناؤ (tension) ہے جو تنظیموں میں مستقل رہتا ہے اور رہے گا۔ اسی میں فرد کا اختلاف رائے کا حق اور اس کی آزادی' جماعت کا نظم اور ڈسپلن اور یہ سارے تصادم اور مناقشات جو اٹھتے رہتے ہیں' ان سب کی جڑ اسی چیز میں ہے۔ اس مسئلے کا کوئی مستقل ماڈل حل نہیں ہے جسے اپنایا جا سکے۔ اس کا حل یہی ہے کہ فرد اور جماعت اپنی کوششوں سے مستقل طور پر اس میں توازن پیدا کرتے رہیں۔ جب بھی غافل ہوں گے' یا تو فرد اپنی شخصیت کو گم کر دے گا جیسا کہ آج کل کی بہت سی اجتماعی تحریکوں میں ہوتا ہے' یا پھر یہ ہوگا کہ فرد اتنا غالب ہو جائے گا کہ جماعت کی تنظیم بکھرنا شروع ہو جائے گی۔ قیادت کا اصل کام ہی یہ ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان توازن رکھے اور انھیں صحیح طریقے سے لے کر چلے۔

یہ وہ پانچ چیزیں ہیں جنھیں سامنے رکھ کر ہم اس بات کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ جس مقصود کو سامنے رکھ کر ہم نے اسلامی تحریک کا نام لیا ہے' اس پر ہم کہاں تک پورے اترتے ہیں۔

تحریک اسلامی ہی کیوں؟

اس کے بعد اگلا سوال یہ ہے کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اسلامی تحریک ضروری ہے تو یہی کیوں ضروری ہے؟ اس لیے کہ جواز (justification) بڑا اہم ہے۔ یہ جواز صرف اپنے لیے ہی اہم نہیں ہے' بلکہ یہ دعوت کے لیے بھی اہم ہے۔ ہم کسی چیز کو اسی وقت صحیح طرح پیش کر سکتے ہیں اور اس کے لیے دل و دماغ کو جیت سکتے ہیں جب لوگ مطمئن ہوں کہ یہ کام انھیں کیوں کرنا ہے۔

اگر ہم قرآن مجید پر نظر ڈالیں تو اس میں بہ کثرت وہ وجوہ بیان کی گئی ہیں جن کی بنا پر یہ کام کیا جانا چاہیے' مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دراصل اس عہد ازلی کا مظہر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے پوچھا کہ:

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰی ۚ (الاعراف ۷: ۱۷۲)
کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا ''ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں''۔

اللہ کو رب بنانا اور واحد رب بنانا' اگر آپ مختصر الفاظ میں کہنا چاہیں تو یہی دراصل اسلامی تحریک کا مقصد ہے۔ چونکہ یہ عہد ہر شخص اپنے رب سے باندھ چکا ہے' اس لیے اس کی کوشش کرنا اس کے اوپر فرض ہے۔ پھر یہ محض عہد ازلی ہی نہیں ہے بلکہ اللہ کی ہدایت کا پایا جانا' اس کا وصول کرنا' اس کا امانت دار ہونا لازمًا اس فرض کو عائد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ لَتُبَیِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَکْتُمُوْنَهٗ ؗ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۸۷)
ان اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمھیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہوگا' انھیں پوشیدہ رکھنا نہیں ہوگا۔

یعنی جس کو بھی اللہ نے کتاب دی' اس سے اس نے یہ میثاق لیا کہ تم اس کتاب کے اوپر شہادت دو گے' اس کو ظاہر کرو گے' اس کو چھپا کر نہیں بیٹھ جاؤ گے۔ مسلمانوں سے اس نے خاص طور پر خطاب کیا:

وَاذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ وَمِیْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَکُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؗ (المائدہ ۵:۷)
اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اس کا خیال رکھو اور اس پختہ عہد و پیمان کو نہ بھولو جو اس نے تم سے لیا ہے' یعنی تمھارا یہ قول کہ ''ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی''۔

یعنی تم اللہ کی اس نعمت کو بھی یاد کرو اور اس میثاق کو بھی جو تم نے اللہ کے ساتھ اس نعمت کے حوالے سے کیا تھا۔ جب تم نے یہ کہا کہ ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی تو پھر حق کی

شہادت دو اور اسے چھپا کر نہ بیٹھ جاؤ۔ عام مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ ہم نے تو یہ عہد کبھی نہیں کیا اور ہم نے کبھی نہیں کہا کہ اطعنا۔ درحقیقت یہ بیعت تو اظہار ایمان کے اندر آپ ہی آپ مضمر ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان لایا' جس نے اللہ کی کتاب کو اللہ کی کتاب مان لیا' اس نے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا میثاق کرلیا۔ دراصل قرآن نے اسی میثاق کو یاد دلایا ہے۔

انبیا کو بھی اللہ تعالیٰ نے اسی کام کے لیے مبعوث فرمایا۔ اب اگر ہمارا یہ ایمان ہے کہ نبوت کا یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے--- اور ظاہر ہے کہ ہم سب کا یہ ایمان ہے کہ یہ سلسلہ ختم ہو چکا ہے--- تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ کیوں ختم ہوگیا؟ کیا اب اس کام کی ضرورت نہیں رہی جو انبیا اور رسول سرانجام دیا کرتے تھے؟ اگر جواب یہ ہو کہ اس کام کی ضرورت نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا' کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر اس کام کی ضرورت باقی ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کام کو کرنے کا کیا انتظام ہے؟ یہ وہی انتظام ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے بار بار ذکر کیا ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (البقرہ ۲: ۱۴۳)

اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک ''امت وسط'' بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

گویا رسولؐ نے جس طرح تم پر گواہی دی ہے اسی طرح تمھیں سارے انسانوں کے سامنے گواہی دینا ہے۔ چنانچہ ختم نبوت کا عقیدہ کوئی جامد عقیدہ نہیں ہے کہ بس اب رسالت کا سلسلہ ختم ہوگیا بلکہ ختم نبوت کو ماننے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اپنے اوپر بڑی متحرک ذمہ داری لے رہے ہیں۔ چونکہ رسالت کا سلسلہ ختم ہو چکا' اس لیے رسالت کا کام اب اس امت کو کرنا ہے جس کے پاس قرآن کی اور ہدایت الٰہی کی امانت موجود ہے۔ یہ سلسلۂ رسالت کے ختم ہونے کو ماننے کا لازمی تقاضا ہے۔ یہ محض کوئی عقلی یا فلسفیانہ بحث نہیں' کسی فرقے سے ہماری نزاع کا اس پر مدار نہیں' بلکہ یہ عقیدہ دراصل

ہماری ذمہ داریاں متعین کرتا ہے۔ کارِ نبوت کو سرانجام دینا اب ہمارے ذمے ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ سنت کی پیروی ہمارے لیے لازمی ہے۔ یہ اللہ سے محبت اور اس کے اوپر ایمان کا تقاضا ہے۔ قرآن نے خود کہا ہے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو' تو رسولؐ کی اتباع کرو:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ (اٰل عمرٰن ۳: ۳۱)

اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو۔

سنت کیا ہے؟ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ سنت کا لفظ سنتے ہی ایک مخصوص حلیہ یا لباس' کھانے پینے اور چلنے پھرنے کے آداب ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہم مسلمان ایک عرصے سے اسی کو سنت کے طور پر سنتے چلے آئے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہ سنت نہیں ہے' یہ سنت ہے' اور اہم سنت ہے کہ آدمی ہر چیز میں اللہ کے رسولؐ کی پیروی کرے۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ رسولؐ کی محبت اور اتباع کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ آدمی اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے میں وہی طریقے اپنائے جو اللہ کے رسولؐ کو محبوب تھے۔

حدیث کی تعریف یہ ہے کہ جو کام حضورؐ نے کیا' یا جو بات آپؐ نے کہی' یا جو کام آپؐ کے سامنے کیا گیا' یا کوئی بات آپؐ کے سامنے کہی گئی اور آپؐ اس پر خاموش رہے۔ یہ حدیث کی اصطلاحی تعریف ہے۔ اس حدیث سے جو نمونہ بن کر سامنے آتا ہے وہ سنت ہے۔

اگر ہم غارِ حرا سے حضرت عائشہؓ کے حجرے تک جہاں حضورؐ نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی' حضورؐ کی زندگی پر غور کریں کہ آپؐ نے عمر بھر کیا کیا' اور کیا کہا' آپؐ کے ساتھی کیا کرتے رہے اور کیا کہتے رہے جس کو آپؐ نے منظور کیا' قبول کیا' تو ہمارے سامنے سنت کی کیا تصویر بنتی ہے؟ وہ تصویر یہ بنتی ہے کہ آپؐ ہر لمحے دعوت و جہاد

اور غلبۂ دین کے کام میں مصروف رہے۔ مکہ کی گلیاں ہوں یا طائف کی وادی' بدر کا میدان ہو یا مسجد نبویؐ، ہر جگہ آپؐ تعلیم' تزکیہ اور دعوت میں مصروف نظر آتے ہیں۔ یہ آپؐ کی سب سے بڑی سنت تھی۔ جو آدمی سب سے بڑی سنت سے اعراض کر کے چھوٹی چھوٹی سنتوں کی پیروی کرتا ہے' دراصل وہ آپؐ کی اصل سنت کو بھول گیا ہے۔ اس اُمت کے لیے سب سے بڑی سنت' دعوت' جہاد اور تعلیم و تزکیہ کی سنت ہے۔

جہاد: ایک ناگزیر تقاضا

آخری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی ایمان کی تعریف کی ہے وہاں اس کے ساتھ جہاد کو ضرور شامل کیا ہے۔ ایمان کی تعریف میں جہاد شامل ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝
(الحجرات ۴۹:۱۵)

حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ (الانفال ۸:۷۴)

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔

گویا قرآن نے اس بات کو سمجھانے میں کوئی شک نہیں چھوڑا کہ جہاد ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی تحریک کے کام کے لازمی اور فرض ہونے کا یہ بنیادی

جواز ہے۔

وقتی حالات خواہ کچھ ہوں' مثلاً پاکستان' امریکہ' برطانیہ' یا ملائیشیا کے جو بھی حالات ہوں گے وہ اپنے الگ تقاضے رکھیں گے' لیکن وہ تقاضے بنیادی جواز نہیں ہو سکتے۔ بنیادی جواز ان چیزوں کا ہے جن کا اوپر تذکرہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا بنیادی حالات کے اپنے تقاضے ہوں گے اور عارضی حالات کے اپنے تقاضے اور مطالبے ہوں گے۔

یہ فرض ایسا فرض نہیں ہے کہ جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ وقت ہوگا تو کریں گے' یا پہلے اپنے آپ کو تیار کر لیں اور پھر اس کام کو کریں گے' یا پہلے کچھ علم حاصل کر لیں پھر اس کام کو کرنے کے لیے نکلیں گے' یا ہم اچھے اور پاکیزہ انسان بن جائیں تو پھر اس کام کو کریں گے۔ یہ بات صحیح نہیں ہے۔

یہ تو ایک ایسا فرض ہے جو ایمان لاتے ہی عائد ہو جاتا ہے اور عمر بھر عائد رہتا ہے۔ اس کو نہ ملتوی کیا جا سکتا ہے اور نہ ٹالا جا سکتا ہے اور نہ نظرانداز کر کے ٹھکرایا ہی جا سکتا ہے۔ یہ دعوت ہمارے ذہن میں بھی اسی انداز میں تازہ رہنی چاہیے اور ہمارے ساتھیوں کو بھی اس کا پورا مقصد اور جواز اسی طرح سمجھنا چاہیے۔

اگر ہم اس دعوت کو اسی طرح اپنی قوم کے سامنے پیش کریں گے تو یہ ان کے دلوں کے اندر زیادہ ہلچل پیدا کرے گی اور ان کو اس کی طرف آنے پر زیادہ آمادہ کرے گی۔ ان شاء اللہ!

راہ و منزل: جہاد و جنت

تحریک اسلامی کا بنیادی نصب العین آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ یہ موضوع بڑا اہم ہے۔ اس لیے کہ فی الواقع اسلامی تحریک کے لیے اور اس کے ساتھ چلنے والوں کے لیے سب سے زیادہ ضروری اور اہم بات یہی ہے کہ وہ اللہ کی رضا کو اپنی زندگی کا واقعی نصب العین بنائیں' اس پر ان کی نگاہیں جمی رہیں' یہی ان کی زندگی' اعمال' مساعی اور کوششوں کا واحد محرک ہو۔ ان کو یقین ہو کہ صرف جہاد کے راستے سے' یعنی اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد' جان و مال کی قربانی اور اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہونے سے یہ مقصد یقینی اور لازمی طور پر حاصل ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے دعوت' تنظیم اور تربیت سب میں مرکزی بات یہ رکھی ہے کہ جو انسان دعوت کو قبول کرے' جسے خود اپنی تربیت کرنا ہو یا جن کی تربیت تنظیم کر رہی ہو' ان کے لیے اور بحیثیت مجموعی خود تنظیم کے لیے یہ بات واضح رہے کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ط (آل عمرٰن ۳:۱۸۵)

کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔

قرآن مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر غور کیا جائے تو یہ بات

سامنے آتی ہے کہ جس نکتے پر ساری کوششیں سب سے بڑھ کر مرکوز ہوتی تھیں وہ یہ تھا کہ لوگ دنیا کے مقابلے میں آخرت کو اختیار کریں، دنیا کو نصب العین بنانے کے بجائے آخرت کو نصب العین بنائیں۔ دنیا میں جئیں، لیکن محض دنیا کے لیے ہی نہ جئیں۔ دنیا میں رہیں، اسے برتیں اور استعمال کریں لیکن مقصد آخرت میں کامیابی کا حصول ہو۔

جب افراد سے انفرادی طور پر اور جماعت سے اجتماعی طور پر کسی کمزوری اور لغزش کا ظہور ہوتا تھا تو قرآن مجید سب سے پہلے جس مرض کی نشان دہی کرتا تھا وہ یہی چیز تھی۔

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ (التوبة ۹ :۳۸)

کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کرلیا؟''

جب بھی کبھی ایسا مرحلہ پیش آیا جس میں کمزوریوں کا صدور ہوا تو جو وحی نازل ہوئی اس میں وحی کے ماننے والوں کو، اللہ پر ایمان لانے والوں کو، اللہ کی راہ میں جدوجہد کرنے والوں کو، اسی بات کی طرف متوجہ کیا گیا۔ اگر لوگ جمعہ کے وقت نبی کریمؐ کو منبر پر کھڑا چھوڑ کر قافلے سے خرید و فروخت اور تجارت کے لیے مسجد سے باہر نکل گئے تو قرآن نے کہا:

وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (الجمعه ۶۲ : ۱۱)

اور اللہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

یعنی تجارت، کاروبار اور دنیا کی ساری چیزوں سے جو چیز بہتر ہے، وہ اللہ کے پاس ہے۔ یہ ابتدائی دور کا واقعہ ہے۔ آخری دور میں جب غزوہ تبوک کے موقع پر انسانی کمزوریوں کا ظہور ہوا، تو قرآن مجید نے اس انسانی مواد کو اسی آگ میں تپا کر سونا بنانے کی کوشش کی کہ وہ اللہ کے لیے خالص ہو جائیں۔ وہ آخرت کے طلب گار بنیں، اور دنیا سے پوری دلچسپی لیں لیکن دنیا کے لیے نہ لیں بلکہ اپنی آخرت کمانے کے لیے لیں۔ بار بار فرمایا کہ یہاں کی تمام محنت و مزدوری اور جدوجہد کا اصل بدلہ تو قیامت کے روز

ہی ملے گا۔

وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَکُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ (اٰل عمرٰن ۳: ۱۸۵)

اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ تحریک اور جماعت جو اس دین کو قائم کرنے میں کامیاب ہوئی' اور جنھوں نے اس کے لیے والہانہ' سرفروشانہ اور جاں نثارانہ جدوجہد کی' ان کے اندر جہنم کی آگ سے بچنے اور جنت کو پانے کی آرزو جاگ چکی تھی۔ وہ اسی کی جستجو اور طلب میں زندگی گزارتے تھے۔ ان کے اور ایک راہب کے درمیان فرق یہ تھا کہ ایک راہب کے لیے جنت کی راہ جنگل' کھوہ' خانقاہ اور کسی گوشے میں عبادت کے ذریعے جاتی تھی' جب کہ ان کے نزدیک جنت کی راہ جہاد کے میدان اور راہوں سے گزر کر جاتی تھی۔ قرآن مجید نے بڑی شدت اور کثرت کے ساتھ اس کی تاکید فرمائی۔ انبیاے کرام اور خود نبی کریمؐ کی دعوت بھی اسی کی طرف تھی:

وَاللّٰهُ یَدْعُوْٓا اِلَی الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ (البقرہ ۲: ۲۲۱)

اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت کی طرف اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔

مشہور حدیث ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ میں تمھاری کمریں پکڑ پکڑ کر تمھیں آگ میں گرنے سے بچا رہا ہوں۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کا اصل مقصود' مرکز اور منتہیٰ کیا ہے۔ اسلامی تحریک میں شامل ہونے والے جس تجارت پر راضی ہو گئے تھے' وہ یہ تھی کہ وہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں گے اور اپنے جان و مال کا بدلہ عذاب الیم سے نجات اور جنت میں داخلے کی صورت میں پائیں گے۔ اللہ کی نصرت اور فتح اس پر مزید ایک بونس ہوگی۔ یہ لوگ عوام الناس کو بھی اسی بات کی طرف دعوت دیتے تھے۔

جب مسلمان عرب وعجم اور دنیا کو فتح کرنے کے لیے نکلے تھے تو کیا تھے۔ کسریٰ کے دربار میں ان سے یہی کہا گیا کہ تم لوگ کیا ہو' تم تو بھوکے ننگے ہو' تمھارے لباس

میں پیوند لگے ہوئے ہیں، تمھیں دو وقت کی روٹی تک نصیب نہیں، تم اٹھنے بیٹھنے اور تہذیب و تمدن کے آداب سے ناآشنا ہو۔ اگر تمھیں دولت کی ضرورت ہے تو ہم سے لے لو اور واپس چلے جاؤ۔ اس پر مسلمان سفیر نے کہا تھا کہ نہیں، ہم تو اس لیے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو دنیا کی تنگیوں سے نکال کر آخرت کی وسعت کی طرف لے جائیں۔

یہ وہ چیز ہے جس کی اہمیت خود اپنی ذات کے لیے، اپنی تنظیم کے لیے اور اس دعوت کے لیے بھی ہے جس کو ہم عام کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی مسلمان کی رگوں میں حرکت پیدا ہوئی ہے، وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ہے، اور اس نے جان و مال کی قربانی دی ہے تو وہ جہاد اور جنت کی خاطر ہی دی ہے۔ یہ دو لفظ اس کی نفسیات میں، اس کی تاریخ میں اور اس کی لغت میں بے پناہ کشش کے حامل ہیں۔ اس کی سرشت میں گھٹی کی طرح یہ بات پڑی ہوئی ہے کہ ایمان کا اصل مقصود یہ ہے کہ بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم وہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرے اور جنت حاصل کرے۔

اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیے ہیں، ان کے ساتھ اس نے یہ اہتمام کیا کہ آخرت کے عذاب اور جنت کی طلب جیسے محرکات کے ذریعے ان احکامات کی تعمیل کرائے۔ اس نے قانون بھی بنائے، حدود بھی تجویز کیں اور سزائیں بھی نافذ کیں مگر اس کا اصل انحصار نہ قانون پر رہا، نہ سزاؤں پر رہا، نہ حدود پر رہا بلکہ اسی محرک پر رہا۔ اس نے اسی کو جگایا، بیدار کیا، پروان چڑھایا، مضبوط کیا اور راسخ کیا تاکہ لوگ جنت کے طلب گار بنیں اور اللہ کی راہ میں کوشش اور جہاد کے ذریعے جنت کو حاصل کریں۔

قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ جنت اور جہنم کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ یہ بھی اسی محرک کی اہمیت کے پیش نظر ہے۔ آج ہماری گفتگوؤں، تقریروں اور دروس قرآن میں یہ بہت کم حصہ پاتے ہیں۔ کبھی بیٹھ کر اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ جو وحی اللہ کی طرف سے نازل ہو رہی تھی اس میں جنت اور جہنم کی ان تفصیلات کا تناسب کیا تھا، اور آج ہم جو گفتگو، تقریر، درس قرآن اور دعوت دیتے ہیں اس میں جنت اور جہنم کی

تفصیلات کا تناسب کتنا ہے' تو ایک واضح فرق محسوس ہوگا۔ شاید جدید دور کے اثرات کی بنا پر ہم میں سے بہت سوں کو اس میں شرمندگی سی محسوس ہوتی ہو کہ کیا out of date (دقیانوسی) بات ہو رہی ہے کہ جس میں باغات' نہروں' پھلوں' حوروں' بالاخانوں کا ذکر ہے' اور جہنم' آگ اور عذاب کی تفصیلات کا بیان ہے۔ ہم دلائل سے نظام اسلام کی حقانیت ثابت کرنے پر تو پورا زور صرف کرتے ہیں مگر جنت و دوزخ کے بیان کا ہماری دعوت' کلام و گفتگو' تقاریر اور دروس قرآن میں فی الواقع وہ تناسب نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام قرآن مجید میں اور اس کے وعظ و نصیحت اور دعوت اور انسانوں کی تربیت میں ہے۔ اس لحاظ سے یہ موضوع ہماری خاص توجہ اور اہمیت کا مستحق ہے۔

صحابہ کرامؓ کا عمل

نبی کریمؐ تو بچشم خود جنت و جہنم کا مشاہدہ کر کے تشریف لائے تھے' اس وجہ سے آپؐ کے ایمان کی کیفیت بالکل مختلف ہونا چاہیے تھی اور تھی۔ مگر وہ لوگ جو آپؐ کی صحبت میں بیٹھتے تھے' آپؐ کا کلام سنتے تھے' اور آپؐ سے فیض یاب ہوتے تھے' ان کی کیفیت بھی بالکل ایسی ہو جاتی تھی کہ گویا جنت و جہنم ان کی نگاہوں کے سامنے ہوں۔

مشہور واقعہ ہے جس میں حضرت حنظلہؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم نبی کریمؐ کی صحبت میں ہوتے تو معلوم ہوتا کہ گویا ہم ہر چیز آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں' اور ہر چیز ایک حقیقت بن چکی ہے۔ جب آپؐ کے پاس سے اُٹھ آتے ہیں تو ایمان کی اس کیفیت میں فرق آجاتا ہے۔ جب ہم گھر آتے ہیں' بیوی بچوں کے درمیان بیٹھتے ہیں' ان سے بات چیت کرتے ہیں' دنیا کے مشاغل میں محو ہوتے ہیں تو پھر وہ کیفیت نہیں رہتی جو آپؐ کی صحبت میں تھی۔ اس کے باوجود' خود حضورؐ کے لیے' اور آپؐ کے ساتھ چلنے والوں کے لیے' جس طرح دنیا کی مادی حقیقتیں یقینی تھیں اسی طرح جنت اور دوزخ کی حقیقت بھی یقینی تھی۔ اگرچہ وہ اس کو اپنی اس آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تھے

جو چہرے پر نصب تھی، لیکن اس آنکھ سے ضرور دیکھ سکتے تھے جو ان کے دل میں لگی ہوئی تھی۔ اسی لیے ان کی کیفیت اور قربانی کا جذبہ بالکل مختلف تھا۔ ان کے اور کسی دنیادار آدمی کے دنیا کو برتنے میں بظاہر کوئی بہت بڑا فرق نہیں تھا، لیکن ان کی کیفیت اور مطلوب ومقصود بالکل دوسرا تھا۔ دنیا میں رہنے کے باوجود وہ مردان دنیا نہیں تھے بلکہ مردان آخرت تھے۔ دنیا کو برتنے کے باوجود وہ دنیا کے غلام نہیں تھے بلکہ دنیا ان کی غلام تھی۔ جس طرح آدمی اپنے غلام سے کام لیتا ہے، اس طرح وہ دنیا سے کام لیتے تھے۔ وہ دنیا کی اس طرح فرماں برداری نہیں کرتے تھے جس طرح کوئی اپنے آقا کی فرماں برداری کرتا ہے۔

ان کے لیے جنت ایک حقیقت تھی۔ سیرت میں ایسے واقعات آتے ہیں کہ نبی کریمؐ منبر پر کھڑے ہیں، خطبہ دے رہے ہیں کہ اچانک ہاتھ بڑھاتے ہیں اور پیچھے کھینچ لیتے ہیں۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا معاملہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میرے سامنے جنت کے پھلوں کا ایک خوشہ تھا اور میں نے چاہا کہ میں اسے توڑ کر تمھیں آنکھوں سے دکھا دوں لیکن یہ سب ممکن نہیں تھا۔

لوگوں کو احد پہاڑ کے پیچھے سے جنت کی خوشبو آتی تھی۔ لوگ اپنے مال اموال، باغات جنت کے بدلے میں اس لیے دے دیا کرتے تھے کہ ان کے لیے جنت کے باغات، محلات، صحبتیں اور نعمتیں اتنی ہی حقیقی، وقیع اور کہیں زیادہ مطلوب تھیں جتنی حقیقی دنیا کی نعمتیں، اور مال واسباب تھا۔

جب آدمی اس مقام پر پہنچ جائے تو دنیا کی کسی بڑی سے بڑی نعمت سے بھی مستفید ہونے میں کوئی حرج نہیں رہتا، اس لیے کہ آدمی اس کو ٹھوکر مار کر الگ ہوسکتا ہے۔ اگر اسے کہا جائے کہ محل میں سوؤ تو وہ محل میں بھی اسی طرح آرام سے سوئے گا جس طرح کہ وہ ایک جھونپڑے میں ایک چٹائی پر سوئے گا۔ دنیا اس کے لیے ایک بے معنی چیز بن جاتی ہے۔ اسے محل میں لٹایا جائے یا جھونپڑے میں، اس کے سامنے

انواع و اقسام کے اعلیٰ کھانے رکھ دیے جائیں یا روٹی اور چٹنی' اس کے لیے دونوں یکساں ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر اگر اس کے سامنے دنیا آتی بھی ہے تو وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کا یہی کمال تھا کہ وہ راہبوں' صوفیوں اور عبادت گزاروں کی طرح دنیا کو چھوڑ کر الگ نہیں ہوئے بلکہ وہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے بے نیاز ہو گئے۔ یہ زیادہ سخت اور کڑا امتحان اور مرحلہ تھا۔ اگر آدمی دنیا کو چھوڑ کر کسی کھوہ میں جا بیٹھے' کسی جنگل میں نکل جائے' یا بیوی بچوں کو چھوڑ دے تو اس کے لیے دنیا کے قرب میں کوئی آزمایش نہیں ہے۔ لیکن بیوی بچوں کے درمیان رہتے ہوئے' گھر میں چلتے پھرتے ہوئے' روزی کماتے ہوئے' آدمی دنیا سے بے نیاز ہو اور اس کے دل کی کیفیت وہی ہو جو راہب کی کیفیت ہوتی ہے' مگر عمل ایک دنیادار کی طرح ہو' یہ زیادہ مشکل امتحان ہے۔

کہا جاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ کا ایمان راسخ تھا' ان کا ظرف وسیع تھا' وہ اس کٹھن مرحلے سے بخیر و خوبی گزر گئے۔ مگر جب لوگ اس سے محروم ہو گئے تو انھوں نے دنیا اور آخرت کی راہیں الگ کر دیں۔ ایک طبقہ وہ بن گیا جو آخرت کی طلب میں دنیا سے الگ ہو گیا اور اس نے دنیا کو ان کے لیے چھوڑ دیا جو دنیا کے طلب گار تھے۔ مسلمانوں میں دین و سیاست جدا جدا ہو گئے۔ جنت کے طلب گار خانقاہوں میں بیٹھ کر تزکیہ نفس کرنے لگے' اور دنیا کے طلب گار حکومت کے تخت پر بیٹھ کر دنیا کو چلانے لگے۔ وہ صحابہ کرامؓ کی روش کو سہار نہیں سکے لیکن انبیا کرامؑ کو جو روش مطلوب ہے وہ یہی ہے کہ آدمی دنیا میں رہے لیکن دنیا سے بے نیاز رہے۔ وہ جنت کا طلب گار ہو اور اس بات کا یقین رکھے کہ اللہ کی راہ میں کوشش و جدوجہد اور جان و مال اور وقت دینے سے ہی جنت کی راہ کھلتی ہے۔ جس میں یہ بات راسخ ہو جائے وہ بہت زیادہ علم کے بغیر بھی سونا اور کندن بن سکتا ہے۔ بہت بڑے اور منظّم تربیتی نظام کے بغیر بھی آدمی کھرا بن کر نکلے گا۔ اور جس میں یہ چیز کمزور ہوگی' علم کی بڑی سے بڑی مقدار اور تربیت کا بڑے سے بڑا نظام بھی اسے کھرا

سونا بنانے میں اور کندن بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

عمل میں کوتاہی اس لیے نہیں ہوتی کہ علم کی کمی ہوتی ہے۔ اس کی ایک معروف مثال یہ ہے کہ سگریٹ کے پیکٹ پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ سگریٹ پینے سے تمھاری صحت کو خطرہ ہے' کینسر اور ہارٹ اٹیک کا شکار ہو سکتے ہو۔ مگر اس کے باوجود کروڑوں آدمی سگریٹ پینے سے باز نہیں آتے۔ وہ جانتے ہیں' اس تنبیہ سے باخبر ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود پھر بھی سگریٹ پیتے ہیں۔ اگر علم کافی ہوتا تو یہ بات کبھی نہیں ہوتی۔ انسان علم کے باوجود خطرات مول لیتا ہے۔

اس کے برعکس جب مسجد نبویؐ میں یہ اعلان ہوا کہ شراب سے رک جاؤ تو مدینہ کے ہر گھر میں شراب کے جام اور مٹکے توڑ دیے گئے۔ اس لیے کہ وہاں علم کے ساتھ ساتھ استعداد اور قوت بھی تھی' جنت کی طلب اور آگ سے بچنے کی تڑپ بھی تھی۔ جب یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بات کی تعمیل میں جنت ملے گی' اس راہ میں جان لڑانے سے جہنم کی آگ سے نجات ملے گی تو پھر دل' فطرت اور سرشت میں وہ قوت و استعداد تھی جو احکام پر عمل کروا سکتی تھی۔ قرآن مجید نے اسی بنیاد پر فرد کی تربیت کی اور اسی بنیاد پر جماعت اور تنظیم کو بھی قائم کیا۔ اسی بنیاد پر اس نے وہ اجتماعی قوت پیدا کی جس نے چند برسوں میں اسپین سے لے کر چین تک اسلام کو پھیلا دیا۔ یہ علم کی بڑی بڑی مقداریں نہیں تھیں بلکہ جنت کی طلب اور جہنم کی آگ سے بچنے کا جذبہ ہی تھا جس کی بنیاد پر یہ کارنامۂ عظیم انجام پایا۔ یہی دراصل تقویٰ ہے۔ تقویٰ ہی پر اللہ نے دنیا میں سربلندی اور آخرت میں نجات کا وعدہ فرمایا ہے۔

علم کے باوجود انسان غیر متقی ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بہت کم علم کے ساتھ آدمی میں گہرا تقویٰ ہو سکتا ہے۔ اگر کسی کی فطرت میں جنت کی طلب اور جہنم کی آگ سے بچنے کی تڑپ اور استعداد موجود ہے تو اس کے پاس وہ قوت اور خزانہ ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ اس کے پاس وہ مضبوط چٹان ہے جس سے اسے کوئی سرکا نہیں سکتا۔

اس لیے کہ اس کی جڑیں اس کے دل کے اندر راسخ ہیں اور یہ ایک کھلی حقیقت کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ جس طرح وہ کھلی آنکھوں سے سورج اور چاند کو دیکھتا ہے' اسی طرح وہ دل کی نگاہوں سے اس جنت کو بھی دیکھتا ہے جو اس کی منتظر ہے۔ پھر وہ اس کے حصول کے لیے اپنے اندر ایک قوت پاتا ہے۔ جوانی ہو یا بڑھاپا' چہرے پر شباب و جوانی کی سرخی چھلکتی ہو یا بڑھاپے سے جھریاں پڑ چکی ہوں لیکن اس کا دل جنت کی طلب' اس کے شوق اور اس کی حرص میں برابر جوان رہتا ہے۔ لہٰذا جنت اور جہاد وہ بنیاد ہے جس پر کسی جماعت کی پوری تعمیر ہو سکتی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ دنیا کا امتحان وہ امتحان ہے جس میں دنیا ایک محسوس ہونے والی چیز ہے' قریب ہے' اسے آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اور آج مل سکتی ہے' مگر آخرت آنکھوں سے اوجھل ہے' غیر محسوس ہے' دور ہے' آج نہیں مل سکتی بلکہ اس کے لیے کل کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ''آج'' کی طلب پر ''کل'' کی طلب اسی وقت غالب آسکتی ہے جب ''کل'' پر آدمی کو یقین ہو۔ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ جذبہ رکھا ہے کہ وہ نفع عاجلہ کے پیچھے دوڑتا ہے: كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (القیامۃ ۷۵:۲۰) ''ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو''، یعنی تم اس چیز کو زیادہ پسند کرتے ہو جو فوری ملنے والی ہو' آج ملنے والی ہو' جس کا نتیجہ فوراً نگاہوں کے سامنے آجائے۔ اس لیے انسانی فطرت میں جہاں اللہ نے یہ جذبہ رکھا ہے' وہاں اس کی فطرت میں اس نے یہ بات بھی رکھی ہے کہ اگر اسے یقین ہو جائے کہ کل ملنے والا نفع یقینی ہے تو وہ اس کے لیے آج کا فائدہ اور آرام قربان کر سکتا ہے۔ ماں باپ کیوں اولاد کی خاطر اپنی رات کی نیندیں حرام کرتے ہیں؟ ماں کیوں بچے کو اپنے سینے کے ساتھ چمٹا کر رات بھر ٹہلتی ہے؟ اس کو اس کا کسی قسم کا نفع آج نہیں ملتا' لیکن اسے یقین ہوتا ہے کہ جب کل یہ بچہ بڑا ہوگا' جوان ہوگا تو نگاہوں کے لیے لذت' دل کے لیے سرور اور بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔ اسی طرح مستقبل

کی تڑپ بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں رکھی ہے۔ اسی لیے کسی فرد کی زندگی کے رخ کا انحصار اس پر ہے کہ کون سی چیز اس پر غالب آتی ہے۔

اللہ کی رضا اور جنت

شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ بات تو رضائے الٰہی کی ہو رہی تھی مگر تمام زور جنت پر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ جنت دراصل اللہ تعالیٰ کی رضا کی تعبیر' اور اس کا مجسم اظہار و بیان ہے۔ جب اللہ کی رضا مجسم ہو کر ظہور پذیر ہوتی ہے تو وہ جنت کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس بات کی طرف قرآن مجید میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک جگہ دین میں پورے کے پورے داخل ہونے کا مطالبہ کرتے ہوئے فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ (البقرہ ۲ :۲۰۸)

اے ایمان لانے والو تم پورے کے پورے اسلام میں آجاؤ۔

اس کے ساتھ فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ (البقرہ ۲ :۲۰۷)

دوسری طرف انسانوں ہی میں کوئی ایسا بھی ہے جو رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی جان کھپا دیتا ہے۔

ایک دوسری جگہ یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلے مومنین سے ان کی جان و مال خرید لیے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ (التوبۃ ۹ :۱۱۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔

ایک جگہ ''رضا'' کا لفظ استعمال ہوا اور دوسری جگہ ''جنت'' کا لفظ استعمال ہوا۔ اس سے بات واضح ہوگئی کہ اللہ کی رضا اور جنت کے حصول کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ آدمی نے اپنے آپ کو اللہ کی رضا کے لیے بیچا تھا اور اللہ نے کہا کہ ہم نے جنت کے بدلے خرید لیا۔

ان دونوں الفاظ کو مختلف پیراؤں میں استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس کی نگاہ میں جنت اور اس کی رضا دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ جس سے وہ راضی ہوگا اسی کو وہ جنت میں داخل کرے گا۔ جنت میں وہ آدمی نہیں جا سکتا جس سے اللہ تعالیٰ راضی نہ ہو۔ اگر وہ راضی ہوگا تو جہنم سے بچائے گا۔ وہ شخص جہنم سے نہیں بچ سکتا جس سے اللہ تعالیٰ ناخوش یا ناراض ہو۔ لہٰذا ''رضائے الٰہی'' اور ''جنت'' دونوں ایک ہی چیز کی تعبیر ہیں۔

قرآن مجید نے اس بات پر زور دیا ہے کہ جو کام بھی کرو اللہ کے لیے کرو (لِوَجْهِ اللّٰهِ)، یعنی اگر مال دنیا ہو تو اللہ کے لیے دو، جہاد کرنا ہے تو اللہ کی راہ میں جہاد کرو، اگر غریبوں کی خدمت کرنا ہے تو یہ کہو کہ

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدھر ۷۶:۹)

ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں۔

یعنی ہم تو تمھیں اس لیے کھلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اس کے بدلے میں انھیں جنت دی۔ یہاں جنت کا تفصیل سے بیان فرمایا۔ اس میں جو کھلایا پلایا جائے، جو پلایا جائے گا، جو نہریں بہائی جائیں گی اس کا بیان فرمایا:

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (الدھر ۷۶: ۲۱)

اور ان کا رب ان کو نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔

یہ وہ چیز تھی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے بدلے میں دی کہ وہ:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (الدھر ۷۶: ۸)

اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔

اور ان سے کہتے ہیں کہ:

اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا

(الدھر ۷۶: ۹)

ہم تمھیں صرف اللہ کی خاطر کھلا رہے ہیں' ہم تم سے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

جو بات کھانا کھلانے کے لیے اور جسمانی بھوک اور پیاس مٹانے کے لیے ہے' وہی بات روحانی بھوک اور پیاس مٹانے اور جہاد و دعوت کے لیے ہے۔ ہم دعوت کا کام یا جہاد اس لیے نہیں کرتے کہ ہمیں کوئی بدلہ یا جزا چاہیے۔ نظام حق اور نظام قسط کے قیام کا کام بھی ہم اس لیے نہیں کرتے کہ ہمیں کوئی جزا' بدلہ یا شکریہ چاہیے بلکہ جہاں نفس کی آمیزش ہو جائے گی' وہاں وہ جہاد' جہاد فی سبیل اللہ نہیں رہے گا' وہ موت' شہادت کی موت نہیں رہے گی۔ اس کی تصریح ایک حدیث میں نہیں بلکہ بے شمار احادیث میں کی گئی ہے کہ جب تک نیت خالص نہیں ہوگی کہ اللہ کی رضا اور جنت مطلوب ہے' اس وقت تک وہ جہاد' جہاد فی سبیل اللہ نہیں بنے گا۔

اب یہ بات بالکل واضح ہے کہ رضائے الٰہی اور جنت میں فی الواقع کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر دستور میں: ہمارا نصب العین اللہ کی رضا کا حصول ہے کے بجائے یہ درج کیا جاتا کہ: ہمارا نصب العین جنت کا حصول ہے تو کوئی فرق نہ پڑتا' اس لیے کہ دونوں ایک ہی بات ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اللہ کی رضا جنت ہے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ کی رضا کی تعبیر جنت ہے۔ اگرچہ اللہ کی رضا' جنت سے بھی زیادہ وسیع چیز ہے جو دنیا میں آدمی کا ساتھ دیتی ہے۔ اسی لیے ہم نے اس لفظ کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن قرآن مجید نے جتنا زور جنت کے لفظ پر دیا ہے' جتنی اس کی تصریح فرمائی ہے اتنی کثرت کے ساتھ اپنی

رضا کا ذکر نہیں کیا۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ ان چیزوں کو زیادہ تلاش کرتا ہے' ان کے پیچھے اپنے آپ کو لگاتا ہے' ان کی خاطر زیادہ محنت و مشقت کرتا ہے جو اس کو زیادہ یقینی' زیادہ محسوس اور زیادہ معلوم ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی اسی فطرت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی رضا کی اسی تعبیر پر زور دیا ہے جو تعبیر عام آدمی کے لیے زیادہ قابل قبول اور مطلوب ہے۔

جنت اور جہاد کا تعلق

آج مادیت کی جو یلغار ہے' اس کا کوئی علاج اس کے علاوہ نہیں ہے کہ انسانوں کو اس مادیت سے اوپر اٹھا کر جنت کے حصول وطلب کے لیے سرگرمِ عمل کیا جائے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے اور مسلمانوں کی ۱۴سو سال کی تاریخ شاہد ہے کہ اپنا جان و مال اسلام کے لیے قربان کرنے کے لیے عام آدمی اسی وقت کھڑا ہوگا جب وہ جنت کا طلب گار بن جائے گا۔ وہ کسی مجرد نعرے یا کسی مجرد نظام کے لیے جان و مال کی قربانی نہیں دے سکتا۔ اس صدی کے بے شمار واقعات اس بات پر گواہ ہیں۔ تیونس' مراکش' الجزائر اور افغانستان میں' یا جہاں بھی عام مسلمان اس بات کے لیے تیار ہوئے کہ جان و مال قربان کریں تو وہ اسی لیے تیار ہوئے کہ جان و مال اللہ کی راہ میں قربان کر کے جنت حاصل کریں۔ جب ان کی نگاہیں اس جنت کے اوپر جم گئیں جو موت کے بعد ملنے والی ہے تو پھر وہ اس بات کے لیے بھی سرگرم عمل ہوئے کہ دنیا کی یہ زندگی بھی جنت کا نمونہ بنے اور خدا کی اس زمین پر بھی عدل و انصاف کی جنت قائم ہو۔ اگر نگاہیں صرف اسی دنیا کے نظام پر مرکوز رہیں تو عام آدمی کے اندر وہ قوت اور طاقت نہیں آسکتی جس کے بل پر وہ کھڑا ہو کر اللہ کے دین کے لیے جہاد اور کوشش کرے۔ اس لحاظ سے تحریک کے لیے جنت کو راہ و منزل کے طور پر سمجھنا اور سمجھانا اور اس کی طلب کو اپنی تربیت اور دعوت کے نظام کے اندر سمونا ناگزیر ہے۔ اگر تحریک کو عوام کے اندر پھیلنا ہے' اگر اسے واقعی اس

راہ پر چلنا ہے جس راہ پر انبیا کرامؑ اور صحابہ کرامؓ چلے' اور جس راہ پر چل کر انھوں نے جنت حاصل کی اور دنیا کو بھی عدل و قسط پر قائم کر کے جنت بنا دیا تو جنت کی طلب کو قوت محرکہ بنانا ہوگا۔

قرآن نے اس کی دعوت جس طرح دی ہے اور جس انداز میں دی ہے' اس سے سب واقف ہیں۔ وہ آیات ان آیات کا ایک حصہ ہیں جن کو ہم کثرت سے پڑھتے ہیں۔ یہ نشان دہی کرتی ہیں کہ جنت کی طلب میں کیا کیفیت مطلوب ہے۔ سارعوا اور سابقوا کے صیغے استعمال کیے گئے ہیں کہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھو اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ مسابقت کرو تو جنت کی طلب میں کرو۔ فرمایا گیا: ففروا الی اللّٰہ (الذریات ۵۱:۵۰) ''پس دوڑو اللہ کی طرف''۔ بھاگنے اور دوڑنے کی کیفیت سکوت کی کیفیت نہیں ہے۔ وہ طریقے جن سے جنت حاصل ہو سکتی ہے ساکت' منجمد اور جامد نہیں ہیں۔ قرآن مجید کے یہ صیغے فعل کے صیغے ہیں' خود اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ دراصل فی الواقع کیا مطلوب ہے۔

وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ o (المطففین ۸۳:۲۶)

جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہیں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔

جنت کو بڑی تفصیل سے بیان کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

لِمِثْلِ ھٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ o (الصٰفٰت ۳۷:۶۱)

ایسی ہی کامیابی کے لیے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہیے۔

یعنی مزدوری کرنے والوں کو جنت کے لیے مزدوری کرنا چاہیے' اپنے آپ کو لگانے والوں کو اپنا آپ جنت کے لیے لگانا چاہیے' نہ کہ دنیا کے لیے جو آج ہے اور کل آخری سانس کے ساتھ چھن جائے گی۔

طلب کی یہ کیفیت خود جہاد کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ جہاں بھی جنت کی

طرف دوڑنے کی ترغیب دینے والی آیت آئی ہے' وہ جہاد کے سیاق میں ہی آئی ہے۔ یہ بات اس طرح نہیں کہی گئی کہ جہاد ہی وہ راستہ ہے جس سے آدمی جنت کی طرف جائے۔ جہاں بھی جہاد کا ذکر ہے' وہیں جنت کا وعدہ بھی ہے اور محض وعدہ ہی نہیں ہے بلکہ جنت کی ضمانت ہے۔ کسی اور جگہ قرآن مجید اتنے اصرار' اتنے اہتمام' اتنی تاکید' اور اتنے زور کے ساتھ جنت میں داخلے کی ضمانت نہیں دیتا جتنی وہ جہاد کے ساتھ دیتا ہے۔

سورہ آل عمران کے آخری نو رکوع اسی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ بار بار کہا گیا ہے کہ اگر صبر کرو گے' جہاد کرو گے' اللہ کی راہ میں قربانی دو گے' تو جنت میں جاؤ گے۔ ایک جگہ کہا گیا کہ جن لوگوں کو میری راہ میں ایذا دی گئی' گھروں سے نکالے گئے' اور جو لوگ میری راہ میں لڑے' جنھوں نے میری راہ میں لوگوں کو مارا اور مارے گئے' انھیں ضرور بالضرور جنت میں داخل کروں گا جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ الفاظ یہ استعمال کیے گئے:

وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ (اٰل عمرٰن ۳:۱۹۵)

اور انھیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

جو لوگ عربی سے تھوڑے بہت بھی واقف ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ **لادخلنھم** میں کتنی تاکید' کتنی ضمانت اور کتنی یقینیت پائی جاتی ہے' کہ میں لازماً ضرور بالضرور ان لوگوں کو جنت میں داخل کروں گا جن کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں' جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے' جنھوں نے میری راہ میں قتال کیا' مرے اور مارے گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے اللہ کا جنت کا یقینی وعدہ ہے۔ یہی دراصل ایمان کی تعبیر ہے۔

لوگوں نے یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ' ہم ایمان لائے ہیں' ہمارا انجام ابرار کے ساتھ کر۔ ایمان کی کیا تعبیر ہے؟ اللہ تعالیٰ نے اسے کھول کر بیان کر دیا کہ ہاں' میں کسی محنت کرنے والے کی محنت کو ضائع نہیں کروں گا۔ اگر تم واقعی ایمان لائے ہو تو تمھارا ایمان ضائع نہیں ہوگا۔ درحقیقت ایمان لانے والے تو وہ ہیں جو میرے لیے' میرے

دین کی خاطر گھروں سے نکالے جائیں' انھیں تکالیف دی جائیں اور وہ صبر کے ساتھ برداشت کریں۔ میری راہ میں لڑیں اور اگر جان دینے کی نوبت آئے تو جان دیں' اگر مال خرچ کرنے کی ضرورت پڑے تو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کریں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن سے میرا وعدہ ہے' جنھیں میں اس بات کی ضمانت دیتا ہوں کہ میں انھیں لازماً ضرور بالضرور جنت میں داخل کروں گا۔

جب آدمی جنت کا طلب گار بن جائے تو اس کی زندگی میں اس کے گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ جنت کا طلب گار اور دوزخ کا طلب گار' دونوں کی زندگی اس دنیا میں ایک جیسی نہیں ہوسکتی۔ آخرت میں بھی دونوں کا انجام بالکل مختلف اور متضاد ہوگا۔ ایک ٹھنڈے سائے میں ہوگا اور دوسرا گرم سائے میں۔ ایک کے لیے آرام دہ بستر ہوگا اور دوسرے کے لیے آگ کا بستر۔ ایک کو پینے کے لیے اچھے سے اچھے جام ملیں گے اور دوسرے کو پینے کے لیے پیپ اور خون ملے گا۔ قرآن مجید نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ آخرت میں دونوں کی کیفیت اور صورت حال مختلف ہوگی' بلکہ دنیا میں بھی فرق ہوگا۔ فرمایا ہے:

لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ط (الحشر ۵۹: ۲۰)

دوزخ میں جانے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہوسکتے۔

یہ نہیں ہوگا کہ آخرت میں جا کر یکا یک دونوں کی زندگی میں فرق واقع ہو جائے گا اور الگ الگ راہوں پر نکل جائیں گے' جب کہ دنیا میں دونوں' یعنی اصحاب الجنۃ اور اصحب النار ایک ہی طرح کی زندگی گزار رہے ہوں گے۔ دنیا میں ہی دونوں کے رہن سہن' طرز زندگی' سوچ' فکر اور برتاؤ میں آدمی نمایاں فرق محسوس کر سکے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اصحب الجنۃ ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو اصحب النار ہیں۔

اصحب الجنۃ کی خصوصیات اسی رکوع میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اصحب الجنۃ اور اصحب النار میں جو پہلا بنیادی فرق ہے وہ یہ ہے کہ جنت میں جانے والے وہ لوگ

ہیں جو ہر لمحے یہ سوچتے ہیں کہ ہم نے کل کے لیے کیا سامان کیا:

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ (الحشر ۵۹:۱۸)

اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔

آدمی یہ دیکھتا رہتا ہے اور اسے اسی بات کی فکر لگی رہتی ہے کہ آج میں وہ کام کروں جو کل جنت کی شکل میں واپس ملے۔ میرے پاس وہ ایمان' وہ عمل' وہ جہاد ہو جو کل جنت کی شکل میں تبدیل ہو سکے۔ وہ ہر لمحے اس فکر میں ہوتے ہیں کہ آج ہم وہ کون سا کام کریں' وہ کون سا سرمایہ آگے بھیجیں جس کے نتیجے میں ہم کو کل جنت نصیب ہو سکے۔ جو لوگ اصحب النار ہوتے ہیں وہ اس کو فراموش کر دیتے ہیں کہ کل انھیں اللہ سے ملاقات کرنا ہے۔ پھر وہ اپنے نفس کو بھی بھول جاتے ہیں۔ اور اپنے مفاد سے' اپنی بھلائی سے' اور اپنی بہبود سے خود غافل ہو جاتے ہیں:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (الحشر ۵۹:۱۹)

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ' جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انھیں خود اپنا نفس بھلا دیا' یہی لوگ فاسق ہیں۔

یہ غور طلب بات ہے کہ قرآن مجید نے یہ کیا بات کہہ دی کہ اللہ کو بھولنے کے نتیجے میں آدمی خود اپنے نفس کے مفاد سے' اور آخرت کے اندر جو بہتری پوشیدہ ہے اس سے غافل ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ ایسے کام کرتا ہے جس سے وہ اپنے آپ کو ہلاکت اور تباہی کے گڑھے کی طرف برابر بڑھاتا رہتا ہے۔ یہ پہلا فرق ہے جو دنیا کی زندگی کے اندر محسوس ہونا چاہیے۔

قرآن مجید نے جنت کا بیان مختلف انداز میں فرمایا ہے۔ جس بیان کو دیکھا جائے' اس کی کوئی نہ کوئی مماثل اور ملتی جلتی کیفیت دنیا کے اندر ضرور ہو گی۔ جنت کی وسعت وہ ہے کہ جس میں زمین و آسمان سما جائیں' چنانچہ جو آدمی جنت کا طلب گار ہو' اس

کا دل' اس کی نگاہ' اس کے مقاصد آفاقی ہوتے ہیں۔ وہ تنگ نظر اور تنگ دل نہیں ہوتا۔ اس کی نظر چھوٹے مقاصد پر نہیں ہوتی۔ دنیا کے اندر وہ اسی طرح بلند نظر اور وسیع الظرف ہوتا ہے جس طرح کے وہ جنت وسیع ہے جس کی طلب کے لیے وہ سرگرم ہوتا ہے اور جس کی وسعت میں زمین و آسمان سما جائیں۔

جس پہلو سے بھی دیکھا جائے' یوں محسوس ہوتا ہے کہ جنت میں رہنے والے آج بھی جنت میں رہتے ہیں۔ آج وہ وہی زندگی گزارتے ہیں جس کا وعدہ جنت میں کیا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ وہاں آدمی لغویات اور جھوٹ نہیں سنیں گے۔ جو جنت کے طلب گار ہیں ان کے معاشرے میں اور باہمی تعلقات میں لغو' جھوٹ اور بے معنی باتوں کی کوئی گنجایش نہیں ہے: اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (الواقعہ ۵۶:۲۶) ''وہاں وہ کوئی بے ہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے''۔ یہاں دنیا کے لیے بھی فرمایا گیا ہے کہ آپس میں سلام یا خیر کو پھیلاؤ۔ نبی کریمؐ نے فرمایا: سلام کو پھیلاؤ۔

جنت کا بیان کوئی خیالی بیان نہیں ہے۔ یہ تو اس لیے ہے کہ جنت کے اندر زندگی کا جو نقشہ اور جو جلوہ دکھایا جا رہا ہے اس کی جھلک ہماری نگاہوں کے سامنے رہے کہ اسی طرح کی زندگی ہم کو آج یہاں بھی گزارنا ہے۔ یہ بات خود قرآن مجید کے بیان سے واضح ہے اور لوگوں نے اس پر کام کیا ہے کہ جنت کے اندر جس چیز کا بھی وعدہ کیا گیا ہے وہ یہیں کے اعمال کا نتیجہ ہے۔

قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ کلمے کی مثال ایک بیج اور درخت کی ہے۔ اعمال صالحہ وہ نہریں ہیں جو زندگی کے درمیان بہتی ہیں' ایمان کو مضبوط کرتی ہیں اور درختوں کو سدابہار پھل دینے والا بناتی ہیں۔ یہ ایمان' کلمۂ اعمال صالحۂ اللہ پر یقین اور ایمان کے مختلف مدارج ہیں جو درخت کی صورت میں انسان کے سامنے ہوں گے۔ حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ سبحان اللّٰہ' الحمد للّٰہ اور اللّٰہ اکبر جنت کے میوے ہیں۔ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ آج کے کام' آج کے اعمال' آج کی نیتیں' آج کے

ارادے، وہاں درختوں، نہروں، بالا خانوں اور ان ساری نعمتوں کے اندر بدل جائیں گے جو جنت میں میسر ہوں گی۔ یہ اس بات کا انکار نہیں ہے کہ جنت کی نعمتیں واقعی محسوس ہوں گی اور اسی طرح سے محسوس ہوں گی جس طرح دنیا کی نعمتیں یہاں محسوس ہوتی ہیں۔

قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ لا وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ط (البقرہ ۲:۲۵)

وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے دنیا میں ہم کو دیے جاتے تھے۔

جنت میں لوگ کہیں گے کہ یہ تو ہمیں پہلے بھی دیا گیا تھا، یہ تو ان سے ملتی جلتی چیزیں ہیں جو ہم اس سے پہلے کھا چکے ہیں۔ جسے جنت میں محسوس ہو کہ پہلے سے ہی ان چیزوں سے آشنا تھا، وہ وہی ہو سکتا ہے جو یہاں اس طرح زندگی گزار رہا ہو جس طرح کی اصحاب الجنۃ کی زندگی ہوتی ہے۔

جتنا بھی غور کیا جائے، جنت کی طلب کا ایمان اور عمل سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اس بات کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جس طرح جنت سدابہار ہے، اس میں کوئی زوال نہیں ہے، اس کے اندر موت نہیں ہے، ہلاکت و تباہی اور فنا نہیں ہے، اس کے میوے اور درخت ہمیشہ کے لیے ہیں--- اس لیے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ نہریں بہائی جائیں۔ تجری من تحتها الانھٰر کہنے سے ہمیشہ اشارہ اسی طرف ہوتا ہے کہ یہ وہ باغات ہیں کہ جن کی فصلیں کبھی خشک نہیں ہوں گی--- اس کے معنی یہ ہیں کہ جنت اسی ایمان کے نتیجے میں ملے گی جو سدابہار ہوگا، جو ہمیشہ آدمی کے ساتھ رہے گا۔ وہ ایمان جس پر آج بہار کا عالم ہو اور کل اس پر خزاں طاری ہو جائے، جو جوانی میں تو جوش سے پُر ہو اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ سرد ہوتا چلا جائے، اس ایمان کے بدلے میں جنت نہیں مل سکتی۔ جنت تو اسی ایمان کے بدلے میں ملے گی جو ہر وقت تازہ اور شاداب ہو۔ جو زندگی میں ہمیشہ پھلتا پھولتا رہے۔

عروج کا راستہ

جنت کے بیان سے عملی زندگی کے لیے بے شمار نتائج نکالے جاسکتے ہیں۔ جنت کے بیان کو محض اس لیے نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ یہ ان باغات، محلات اور صحبتوں کا ذکر ہے جو کل پیش آنے والی ہیں۔ اگر آدمی جنت کو صحیح معنوں میں جان لے اور پہچان لے تو آج اس کی زندگی میں اس کے اثرات رونما ہوں گے۔ وہ آج اس طرح سے زندگی گزارے گا کہ کل اس کے حصے میں جنت آئے۔

جنت کی یقینی راہ جہاد ہے۔ قرآن مجید نے بڑی شدت کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے۔ یہ راہ آج امت کے ذہن سے محو ہو چکی ہے۔ اگر کوئی پکارتا ہے تو لوگ جاگ اٹھتے ہیں، انھیں دل کی گہرائیوں سے یہ پکار اٹھتی محسوس ہوتی ہے کہ واقعی جنت تو جہاد کے نتیجے میں ہی مل سکتی ہے۔ اس کی خاطر ۱۴ سو سال سے جہاد ہوتے رہے ہیں اور مسلمانوں نے اپنی جانیں اور اپنے مال اس راہ میں قربان کیے ہیں۔ انھوں نے اسی مقصد کے لیے اپنی زندگیاں دی ہیں۔ ہماری تاریخ کا یہ سبق ہے کہ مسلمانوں نے جب بھی قربانی دی، اسی جنت کی طلب میں دی۔ جب بھی اور جہاں بھی امت نے ان دونوں کے درمیان باہمی ربط کو ضائع کر دیا اور یہ سمجھا کہ مزاج خانقاہی سے، ذکروفکر سے، مراقبے اور مکاشفے سے اور محض نجی زندگی میں ایمان کو برتنے سے جنت حاصل ہو جائے گی، اس امت کا رشتہ اپنے مقصد سے اور اپنی تقدیر سے کٹ گیا۔ وہ اپنے عروج کے راستے سے بھٹک گئی اور زوال کی طرف چل پڑی۔ اس کے عروج کی ضمانت اس بنیاد پر تھی کہ وہ جنت اور جہاد کے رشتے کو قائم رکھے گی۔ جنت کی طلب اور جہاد کی راہ نے امت کو اس دنیا کے اندر بلندی اور غلبے کی اعلیٰ ترین منازل تک پہنچایا۔ جب اس نے اس کو ترک کر دیا تو پھر وہ پستی کی طرف گرتی چلی گئی اور دنیا کی دوسری قوموں نے، جو باطل کے لیے جدوجہد اور اس کی ترقی کے لیے کھڑی ہوئی ہیں، اس امت کو اپنے لیے تر نوالہ بنالیا اور اس کے اوپر ٹوٹ پڑیں۔ انھوں نے نہ صرف اس امت کے وسائل کو، اراضی کو، پٹرول اور معدنی

دولت کو لوٹا' بلکہ اس کے انسانی وسائل کو' اس کے نوجوانوں کو بھی غلط راستے پر لگا کر ضائع کر دیا۔

یہ اس لیے ممکن ہوا کہ مسلمانوں نے خود جنت و جہاد کا رشتہ منقطع کر دیا۔ ایک حدیث کے مطابق ایک وقت ایسا آئے گا جب دوسری قومیں مسلمانوں پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گے جس طرح بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ آج اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان دنیا کے اندر ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے ہیں۔

وہ مشہور آیت ضرور آپ کی نظر سے گزری ہوگی جس میں بنی اسرائیل نے طعامِ واحد پر اعتراض کیا تھا اور انواع و اقسام کے کھانوں کا مطالبہ کیا تھا۔ مگر شاید بہت کم لوگوں نے اس بات پر غور کیا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کس گہری حکمت اور مصلحت کے تحت اسے نازل کیا تھا۔ فرمایا:

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ (البقرہ ۲: ۶۱)

اور جب تم نے کہا تھا کہ "اے موسیٰ' ہم ایک ہی طرح کے کھانے پر صبر نہیں کر سکتے۔ اپنے رب سے دعا کرو کہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار' ساگ' ترکاری' کھیرا' ککڑی' گیہوں' لہسن' پیاز' دال وغیرہ پیدا کرے۔

عموماً اس پر نظر نہیں جاتی کہ اس میں اللہ کی کیا حکمت پوشیدہ تھی۔ لوگ سوچتے ہیں کہ آخر اس مطالبے میں ایسی کیا بات تھی جس پر اللہ نے گرفت کی۔ یہ سب چیزیں تو انسان کی ضرورت ہیں۔ قرآن نے کہا کہ اچھا! شہری زندگی اختیار کرو' کسی شہر میں جا رہو' تم نے جن چیزوں کا سوال کیا ہے وہ تمھیں مل جائیں گی۔ اور اس سے متصل یہ بات بیان کی:

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ

(البقرہ ۲: ۶۱)

آخرکار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ذلت وخواری اور پستی و بدحالی ان پر مسلط ہو گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔

یہ سزا محض لہسن پیاز یا دال وغیرہ طلب کرنے پر نہیں دی گئی۔ دراصل صحرائے سینا میں ان کی دشت نوردی جہاد کے لیے تھی' اور وہاں انھیں من وسلویٰ کھانے کو مل رہا تھا۔ ان کا مطالبہ یہ نہیں تھا کہ ہم من وسلویٰ نہیں کھانا چاہتے' بلکہ لہسن' پیاز اور مسور کی دال کے پردے میں ان کا مطالبہ درحقیقت یہ تھا کہ ہم دشت نوردی' مشقت اور جہاد کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ ہمیں کاشت کاری کی زندگی' امن وسکون کی زندگی اور settled زندگی چاہیے جہاں ہم آرام وسکون سے رہیں۔ اس لیے قرآن نے کہا کہ تم شہروں میں جاؤ' شہری زندگی اختیار کرو' دیہاتوں میں جاؤ اور کاشت کاری کرو' لیکن اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو جسے اس نے جہاد جیسے عظیم مقصد کے لیے پیدا کیا تھا' ذلت و مسکنت اور اپنے غضب کی وعید سنائی۔

یہ چھوٹا سا واقعہ جو سورۃ البقرہ میں بیان کیا گیا ہے امتوں کی تقدیر اور ان کے عروج و زوال کی طرف ایک بڑا گہرا اشارہ ہے اور اس حوالے سے ایک اہم اصول بیان کرتا ہے۔ جو امتیں اور قومیں جہاد کی زندگی گزارنے اور جدوجہد کرنے کے لیے تیار ہوں' اس کے لیے گھروں سے نکلنے اور قربانی دینے کے لیے تیار ہوں' وہی قومیں دنیا کے اندر غلبہ حاصل کرتی ہیں۔ وہ قومیں جو اس بات کے لیے راضی ہو جائیں کہ وہ جانوروں کی طرح جنگل میں جگالی کرتی رہیں' اور گھاس پھوس کھاتی رہیں' وہ قومیں دنیا کے اندر شیر کا تر نوالہ بن جاتی ہیں جس طرح کہ مسلمان تر نوالہ بن گئے۔ لہسن' پیاز اور دالیں وہ چیزیں نہیں ہیں جن کی طلب پر اللہ تعالیٰ اتنا خفا ہوتا' بلکہ وہ خفا اس بات پر ہوا کہ صحرائے سینا میں جہاد کی زندگی میں جو من وسلویٰ مل رہا تھا' اسے ترک کر کے بنی اسرائیل وہ زندگی چاہتے تھے جو جہاد کی زندگی نہ ہو اور جہاں آرام وسکون میسر ہو۔

آج اگر امت مسلمہ کی حالت پر غور کیا جائے تو اس کی زندگی اسی آیت کی تفسیر

ہے۔ جب اس امت نے جہاد کو ترک کر دیا اور تہذیبی مظاہر پر قانع ہو گئی تو اس کا زوال شروع ہو گیا۔ اس نے پہلی امت کے کیے ہوئے کام کا پھل ایک ہزار سال تک کھایا۔ یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ جہاد کے نتیجے میں درخت پر جو پھل لگا' مسلمان ایک ہزار سال تک اسے کھاتے رہے لیکن اسے کب تک کھایا جا سکتا تھا۔ بنک میں رکھا ہوا سرمایہ بھی ایک روز ختم ہو کر رہتا ہے۔ اس کے بعد اوور ڈرافٹ کی نوبت آئی' مسلمان مقروض ہوتے چلے گئے اور بالآخر دنیا کی قوموں کے سامنے وہ گروی ہوتے چلے گئے۔ مراکش گیا' تیونس گیا' الجزائر گیا' نائیجیریا گیا' ہندستان گیا' انڈونیشیا گیا' جو بھی مملکت تھی وہ ہاتھ سے نکلتی چلی گئی۔ دو سو سال کے عرصے میں وہ مسلمان جن کا ڈنکا دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بجتا تھا ان کی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ ۱۹۲۰ء میں دنیا میں صرف چار مسلمان ممالک' سعودی عرب' یمن' افغانستان اور ترکی آزاد تھے لیکن ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ دنیا کے نقشے پر ان کا کوئی مقام نہیں تھا۔ ہر مسلمان ملک' دوسروں کے لیے تر نوالہ بن چکا تھا۔ اس لیے کہ مسلمانوں نے جہاد کی زندگی کو ترک کر دیا تھا۔

تحریک اسلامی اس لیے برپا کی گئی ہے کہ امت مسلمہ تجدید ایمان کرے' جہاد کی راہ پر گامزن ہو' اور اپنے آپ کو بھی اور مسلمانوں کو بھی دوبارہ اسی راہ پر چلائے اور آگے بڑھائے۔ اگر یہ تحریک بھی اسی بات پر قانع ہو جائے کہ لہسن' پیاز اور دال پر گزر بسر کرے گی اور جدوجہد' سخت کوشی اور محنت کی زندگی اختیار نہیں کرے گی' تو اس تحریک کا بھی وہی حشر ہوگا جو بنی اسرائیل کا ہو چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت ایک ہے۔ کوئی اس کا چہیتا اور لاڈلا نہیں ہے۔ کوئی محض دعویٰ کرنے کی وجہ سے اس کی غیر معمولی نعمت کا مستحق نہیں ہو جاتا۔ اس کا قانون بے لاگ ہے۔ اس کی لاٹھی سب کے لیے یکساں طور پر چلتی ہے۔ اگر بنی اسرئیل کو سزا ملی' اور اُمت مسلمہ کو زوال کا سامنا کرنا پڑا تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی ایسے گروہ کو' کسی ایسی جماعت کو' اور کسی ایسی جمعیت کو کہ جو اپنے اس مقصد کو فراموش کر دے' اللہ تعالیٰ اسے اپنے اس قانون سے بری کر دے۔

یہودیوں کو اس بات پر بڑا زعم تھا کہ

نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ (المائدہ ۵:۱۸)

ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں۔

قرآن نے کہا: نہیں، کوئی ہمارا محبوب نہیں ہے۔ جو ہمارے راستے سے ہٹے گا اور اسے ترک کرے گا اس کے حصے میں وہی چیز آئے گی جس کی وعید ہم نے اپنے نافرمان بندوں کو دی ہے۔

یہ بات دین کے لیے، تحریک کے لیے، تربیت و دعوت کے لیے، تنظیم اور نظام کے لیے اصل جڑ اور کلید ہے کہ جنت کی طلب پیدا ہو، اور اس کے حصول کے لیے جہاد کا راستہ اختیار کیا جائے۔

جہاد کے معنی محض فوری طور پر تلوار سونت کر لڑنے کے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد سخت کوشی، محنت، قربانی اور انتہائی جدوجہد کی زندگی ہے۔ یہی وہ اصول ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ قوموں اور جماعتوں کو دنیا میں غالب اور سربلند کرتا ہے۔ جتنی جنت کی طلب کم ہوگی، آخرت کی طلب پیچھے جائے گی، دوسرے محرکات آگے آتے جائیں گے، اتنی ہی کمزوری پیدا ہوتی چلی جائے گی۔ جتنی کمزوری پیدا ہوگی، اتنا ہی قوت کے اندر ضعف پیدا ہوتا چلا جائے گا۔ جتنی قوت کم ہوگی اتنا ہی جمعیت، جماعت، تحریک، تنظیم، یہ سب چیزیں اپنے معیار سے گرتی چلی جائیں گی۔ ان کی اصلاح کے لیے جو دوا اور غذا ہے، ان کو دوبارہ سرسبز و شاداب کرنے کے لیے جو پانی ہے وہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ جنت کی طلب، آگ سے بچنے کی تڑپ اور اس کے لیے جہاد کی راہ کو اپنایا جائے۔

یہی وہ واحد راستہ ہے جس سے کامیابی کی منزل سر ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے!

حکمت تنظیم : اہداف اور منصوبہ بندی

حکمت تنظیم ایک نیا موضوع ہے۔ تنظیم کے بارے میں ہم اب تک جو کچھ سنتے اور بولتے رہے ہیں یہ اس سے ذرا کچھ مختلف قسم کی چیز ہے۔ اس میں سمع و طاعت' شوریٰ و احتساب' نظم و ضبط جیسے موضوعات نہیں ہیں بلکہ اس سے کچھ مختلف نوعیت کے موضوعات ہیں۔

حکمتِ دعوت اور حکمتِ انقلاب ایسے موضوعات ہیں جن سے آپ واقف ہیں۔ حکمتِ دعوت کے معنی یہ ہیں کہ وہ اصول اور تدابیر جن سے دعوت کا کام موثر ہوسکے۔ حکمتِ انقلاب کے معنی یہ ہیں کہ وہ اصول اور تدابیر جن سے انقلاب کی منزل قریب آسکے اور حاصل ہو سکے۔ اس لحاظ سے حکمتِ تنظیم کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ اصول اور تدابیر جن سے تنظیم اپنے مقاصد کے حصول کے لیے موثر اور کارگر ہو سکے۔ حکمتِ تنظیم کی یہ بہت مختصر تعریف ہم کر سکتے ہیں۔

ہر تنظیم کسی مقصد کے لیے قائم ہوتی ہے اور اس مقصد کے حصول میں وہ جتنی موثر (effective) اور جتنی کارگر (efficient) ہوگی اتنا ہی وہ تنظیم زیادہ کامیاب ہوگی۔ اس لحاظ سے ہم سب کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کون سے اصول اور تدابیر ہیں جو کسی ایسی تنظیم کے مقاصد کے حصول کے لیے موثر اور کارگر ہو سکتے ہیں جو اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے قائم کی گئی ہو۔

تنظیم کیا کرتی ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے؟

عمومی نقطہ نظر سے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تنظیم کے دو کام ہیں: ایک یہ کہ وہ افراد کو جمع کر کے ایک ایسا مجموعہ بنائے جس کی طاقت اور قوت افراد کے مجموعے سے کئی گنا زیادہ ہو۔ اگر آپ ریاضی کے جمع کے فارمولے سے افراد کی قوتوں اور طاقتوں کو جمع کریں تو تنظیم میں آکر وہ اَضعافاً مُضاعَفَة 'یعنی کئی گنا زیادہ بڑھ جائیں گی۔ اس کو اردو کے ایک عام محاورے کے لحاظ سے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک اور ایک کو جمع کر کے دو بنانا تنظیم کا کام نہیں ہے' بلکہ ایک اور ایک کو گیارہ بنانا تنظیم کا مقصد ہے۔ وہی افراد جو الگ الگ مختلف صلاحیتیں' قوتیں اور طاقتیں رکھتے ہیں جب وہ مل جائیں تو مل کر ان کی طاقت اور قوت اپنے مجموعے سے کئی گنا زیادہ طاقت ور اور زیادہ باصلاحیت بن جائے گی۔

تنظیم کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ کام جو افراد الگ الگ نہیں کر سکتے وہ کام تنظیم سرانجام دے۔

تنظیم اپنی مختلف صورتوں میں انسان کے ساتھ ہمیشہ موجود رہی ہے لیکن یہ بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تنظیم نے پچھلے ۱۰۰ سال میں' بحیثیت ایک ادارے اور تنظیم کو چلانے کے فن کے رہنما ترقی کی ہے۔ انسان نے بڑے بڑے عظیم الشان کارنامے اسی تنظیم کے بل پر سرانجام دیے ہیں۔

ایک شخص اپنے باغ میں سیب کو گرتا دیکھ کر یہ نتیجہ نکال سکتا تھا کہ پوری کی پوری کائنات کشش ثقل کے اوپر قائم ہے۔ لیکن ایک شخص کے بس میں یہ نہیں تھا کہ وہ انسان کو چاند کے اوپر پہنچا دے۔ اس کے لیے بڑی منظم جدوجہد کی ضرورت تھی۔ معمولی دکان دار اپنے مقام پر بیٹھ کر اپنا کاروبار چلا سکتا ہے لیکن یہ اس کے بس میں نہیں ہے کہ وہ کثیرقومی کارپوریشن بن کر اپنے کاروبار کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا دے۔

ایک شخص کہیں بیٹھ کر اپنے خیالات کی ترویج اور ان کی اشاعت کر سکتا ہے لیکن

یہ اس کے بس میں نہیں ہے کہ وہ پوری کی پوری قوم اور معاشرے کو مسخر کر کے اس کو کسی انقلاب کی راہ پر لگا دے۔ تنظیم وہ کام کر سکتی ہے یا اسے کرنا چاہیے جو افراد الگ الگ نہیں کر سکتے۔ یہ اس کا عام پہلو ہے۔

اگر تحریک اسلامی کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہماری ساری دعوت جو بے شمار الفاظ اور بے شمار صفحات کے اوپر پھیلی ہوئی ہے' اس کو سمیٹ کر اگر ہم خلاصہ بیان کرنا چاہیں تو صرف دو جملوں کے اندر بیان کر سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اقامت دین ہر مسلمان کے اوپر فرض ہے' اور دوسرا یہ کہ یہ فریضہ تنظیم اور اجتماعی زندگی کے بغیر ادا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تنظیم اور اجتماعی زندگی ناگزیر ہیں۔ اس کے علاوہ ہماری ساری باتیں وہ ہیں جو اس دور میں مانی جاتی تھیں جس دور میں اس تحریک کا آغاز ہوا۔ سب کو ان باتوں سے اتفاق تھا لیکن یہ دو منفرد باتیں اس ملک میں تحریک کی بنیاد بنیں۔ اس لحاظ سے تنظیم بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہے اور ہم نے جان بوجھ کر ہی یہ بات کہی ہے کہ انفرادی طور پر خواہ کتنے ہی کام ہو سکیں لیکن اقامت دین کا کام اور اسلامی انقلاب کا کام تنظیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ دینی اور تحریکی لحاظ سے یہ تنظیم کی اہمیت ہے۔

حکمتِ تنظیم

آیئے اب یہ دیکھیں کہ حکمتِ تنظیم سے فی الواقع ہمیں کیا حاصل ہوگا؟

حکمتِ تنظیم کے معنی یہ ہیں کہ وہ تنظیم کو اس قابل بنائے کہ جو چیز مطلوب ہو وہ ممکن بن سکے۔ انسان بہت سارے خواب دیکھتا ہے' بہت ساری تمنائیں اور آرزوئیں رکھتا ہے' وہ پوری نہیں ہوتیں۔ تنظیم کا کام یہ ہے کہ ان آرزوؤں اور ان تمناؤں کو ممکن بنائے اور ممکن سے بڑھا کر ایک حقیقت بنا دے۔ گویا جو چیز ناممکن نظر آتی ہو وہ ممکن بن جائے اور ایک حقیقت کا روپ دھار لے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ کام زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ ہو۔ ہم کوئی

رفتار کا تعین نہیں کرتے لیکن جتنی بھی تیز رفتاری سے یہ کام ہوگا اتنا ہی تنظیم زیادہ موثر اور کارگر ہوگی۔

تیسری بات یہ ہے کہ جو وسائل اور کوششیں اس کام میں لگیں' وہ زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز ہوں۔ کم سے کم کوشش اور کم سے کم خرچ سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو۔ انگریزی میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ effective (موثر) بھی ہو اور efficient (کارگر) بھی۔

وسائل کا لفظ جب میں بولتا ہوں تو آپ کے ذہن میں فوراً بیت المال اور پیسہ آئے گا۔ لیکن وسائل سے میری مراد محض بیت المال نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر وسائل انسان ہیں۔ ان کا وقت ہے' ان کی صلاحیتیں' ان کی وابستگی اور لگن ہے' اور ان کی اخلاقی صفات ہیں۔ یہ چیزیں وسائل میں شمار ہوتی ہیں۔ جب میں خرچ کا لفظ استعمال کروں تو آپ صرف مال ہی کے خرچ کرنے کا نہ سوچیں' بلکہ انسانوں کے اوقات' ان کی صلاحیتیں' ان کی استعداد' ان کو خرچ کرنا' وسائل کو خرچ کرنا ہے۔ تنظیم کا کل بجٹ صرف مال پر مشتمل نہیں ہوتا' اگرچہ مادی وسائل بھی اس کا ایک حصہ ہیں بلکہ انسانوں کا یہ سارا مجموعہ بھی اس کے بجٹ کے اندر شامل ہے۔ مثال کے طور پر آپ یہ کہیں کہ اس تربیت گاہ پر کتنے وسائل لگے' تو شاید آپ چند ہزار روپے کا حساب دیں گے لیکن میرے خیال میں کم سے کم ڈھائی تین ہزار دن کے وسائل اس تربیت گاہ کے اوپر خرچ ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے اوقات' صلاحیتیں' قوتیں' توجہات' وابستگی' لگن' یہ ساری چیزیں انسانوں کے وسائل کے اندر شامل ہیں۔

اگر تنظیم موثر نہ ہو اور وہ حکمت میسر نہ ہو جس سے تنظیم کو موثر کیا جا سکے تو اس کا امکان ہے کہ وسائل موجود ہوں' اور کام نہ ہو۔ بنک کے اندر سرمایہ موجود ہو اور نفع آور کاروبار میں نہ لگ سکے۔ بھاگ دوڑ اور کوشش ہو' اس کے باوجود بھی نفع نہ ملے۔ میں اگر کاروبار اور نفع کی اصطلاحات استعمال کر رہا ہوں تو اس سے آپ گھبرائیں نہیں' اس

لیے کہ ان سے بات کو سمجھنا آسان ہے۔ یہ خالص قرآن مجید کا استعارہ ہے کہ جو دینی کام کو بیع' شرع اور تجارۃ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر ہم آج کی بزنس اور کارپوریشن کی مثالیں لیں تو یہ بالکل عین قرآن مجید کے بیان کے مطابق ہوں گی۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ کاروبار میں روپیہ بنک میں رکھا رہے اور وہ نفع نہ دے' یا کاروبار میں لگایا جائے اور پھر بھی نفع نہ دے' تو دراصل اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانوں کے مجموعے کو جہاد کے کام کے لیے جمع کیا جائے اور وہ اس کام میں نہ لگے' اور لگے بھی تو جہاد کی منزل قریب نہ آئے۔ یہ دراصل اسی بات کو کہنے کا ایک معروف پیرایہ ہے جو قرآن مجید نے خود بار بار استعمال کیا ہے۔

تنظیم مختلف نوعیت اور قسموں کی ہوسکتی ہے۔ حکمت تنظیم کے معنی ہیں کہ کم سے کم وقت میں اور کم سے کم وسائل کے ساتھ تنظیم اپنے مطلوب مقصد کو ممکن اور حقیقت بنا سکے۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ تنظیم کا مقصد کیا ہے۔ مقصد اور نوعیت کے لحاظ سے تنظیموں کی بے شمار قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ وہ اس وقت زیر بحث نہیں ہیں۔ اس وقت میں صرف ایک تقسیم آپ کے سامنے رکھوں گا اس لیے کہ وہ میری گفتگو سے متعلق ہے۔ ایک قسم کی تنظیمیں وہ ہوتی ہیں جو چلتے ہوئے ادارے اور کاموں کو چلانے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ انگریزی میں ہم انھیں maintenance organizations کہہ سکتے ہیں۔ ایک قسم کی تنظیمیں وہ ہوتی ہیں جن کے سامنے maintenance سے زیادہ ترقی (development)' ارتقا (evolution) اور پیش رفت اور تحریک (movement) ہوتی ہے۔ ان کو میں movement organization کہوں گا۔ تنظیموں کی یہ تقسیم بڑی اہم ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی تنظیم خالص maintenance کی تنظیم ہوسکتی ہے اور کوئی تنظیم خالص movement کی تنظیم ہوسکتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمیشہ ملی جلی موجود رہیں گی۔

کسی کام کو آگے بڑھنے اور پیش رفت کرنے کے لیے کسی ڈھانچے کو برقرار رکھنا

ضروری ہوگا۔ جب تک کوئی ڈھانچہ موجود نہ ہو جس کے بل پر آگے پیش رفت ہو' وہ کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کسی چیز کو برقرار رکھنے کے لیے جو ڈھانچہ بنے گا' اگر وہ جان دار ہوگا' تو وہ سال بہ سال یہ تو سوچے گا ہی کہ میں کیسے اپنے آپ کو بہتر بناؤں۔ یہ کوئی ایسی تقسیم نہیں ہے کہ جس میں دونوں بالکل الگ الگ ہو جائیں۔ لیکن تنظیم کے مقاصد کی نوعیت کے لحاظ سے ان دونوں کے تناسب کے اندر فرق واقع ہوتا جائے گا۔ ہماری اسلامی تحریک ایک تحریکی تنظیم ہے' چلتی ہوئی چیزوں کو چلانا اس کا مقصود نہیں ہے۔ اس کا مقصود پیش رفت اور معاشرے کو مسخر کرنا ہے۔ اس کا مقصود پھیلنا' گرفت میں لینا اور غالب ہونا ہے۔ اس لحاظ سے اس کے پاس انسانی وسائل' صلاحیتیں ہیں۔ یہ تنظیم اُسی وقت کارگر اور موثر کہی جائے گی جب وہ اپنے اس مقصد اصلی میں کامیابی کے قریب پہنچے' یا اس کو حاصل کرلے۔ اگر وہ اس کو حاصل نہ کرے' تو خواہ وہ بظاہر کتنی ہی مضبوط اور پھیلی ہوئی نظر آئے وہ موثر اور کارگر تنظیم نہیں کہی جاسکتی۔ پھر ایسا ہوگا کہ تنظیم کے پاس وسائل ہوں گے اور وہ نرے وسائل رہیں گے۔ جس طرح ایک ست تاجر کے پاس بنک کے اندر لاکھوں روپیہ پڑا رہے اور تجارت کے مواقع آتے رہیں اور وہ ان کو کھوتا رہے۔ وہ سمجھے کہ میں تو بہت مال دار ہوں لیکن وہ اس مقصد کو پورا نہیں کر رہا ہے جو سرمایے کا مقصد ہے' یا یہ کہ وہ کوشش کرے اور سرمایہ لگائے' لیکن اپنی غفلت' لاپروائی' نادانی' یا اپنی کوتاہی سے نفع حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو۔ اگر حالات' ماحول' معاشرہ' مشیت خود راہ میں حائل ہو جائیں تو الگ بات ہے' لیکن اگر اپنا قصور اور خامی ہو تو پھر ہم کہیں گے کہ یہ تاجر اپنے مقصد میں ناکام ہے۔ اسی طرح اگر تحریکی تنظیم انسانی وسائل کو اسلامی انقلاب کی منزل قریب لانے میں نہیں لگا پاتی یا لگاتی ہے تو اپنی کوتاہی سے ان کو ضائع کرتی ہے' تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تنظیم غیر موثر (un effective) اور غیر کارگر (inefficient) ہے۔ اور اگر وہ کسی درجے میں اس میں کامیاب ہوتی ہے تو اُسی درجے تک ہم اس کو موثر اور کارگر کہہ سکتے ہیں۔

تین بنیادی اصول

اس تمہیدی بیان کے بعد اب میں آپ کے سامنے وہ چند اصول اور تدابیر بیان کروں گا جو اس حکمتِ تنظیم کا حصہ ہیں۔ ان اصول و تدابیر میں تین اصول بالکل بنیادی ہیں جو تنظیم کو موثر رکھنے کے لیے اِس کی حکمت عملی کا لازمی حصہ ہونے چاہئیں۔

مقصد نگاہ میں رہے: پہلا اصول یہ ہے کہ تنظیم کے لیے اس کا مقصد جان اور روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مقصد ہمیشہ شعور میں واضح رہے' نگاہیں اسی کے اوپر مرکوز رہیں' وسائل' اقدامات اور مساعی اسی کی خاطر ہوں۔

یہ پہلا اصول ہے جو تنظیم کو موثر بنانے کے لیے لازمی اور ناگزیر ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ تو بڑی آسان بات ہے۔ ہمارا مقصد ہمارے دستور میں لکھا ہوا ہے' ہمارے لٹریچر میں موجود ہے' ہر اجتماع' ہر تربیت گاہ میں ہم اس کو بار بار دہراتے ہیں تو آخر یہ اتنی اہم بات کیوں ہے کہ اس کو پہلے اصول کے طور پر پیش کیا جائے۔ میں اس بات کو اس لیے رکھ رہا ہوں کہ یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے کہ دستور میں مقاصد لکھے ہوئے موجود ہوں' زبانوں پر بھی مقاصد کا تذکرہ ہو' لیکن تنظیم اس مقصد کو اپنی نگاہوں سے اوجھل کر چکی ہو' یا وہ مدھم ہو چکا ہو' یا اس میں تغیر واقع ہو گیا ہو' یا اس میں کوئی آمیزش ہوگئی ہو۔ وہ لوگ جنھوں نے اپنے لٹریچر میں یہ تشبیہات پڑھی ہیں کہ قافلہ عازم پشاور ہو اور اس کے اوپر کراچی کا بورڈ لگا ہوا ہو' وہ کیسے اس بات سے غافل ہو سکتے ہیں کہ یہ حادثے تنظیموں اور تحریکوں کو پیش آسکتے ہیں۔ دستور کے اندر' تقریروں میں' کتابوں میں تذکرہ ہو اور سائن بورڈ بھی لگا ہو' لیکن کوششیں اور سمت کچھ اور ہو جائے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اور قرآن مجید میں جو چیز ہم کو تکرار محسوس ہوتی ہے وہ صحیح مقصد اور صحیح منزل کی تذکیر اور اعادہ ہے جو مکی زندگی کے پہلے دن سے لے کر مدنی زندگی کے آخری دن تک کیا گیا۔ یہ وہ بات ہے جس سے کوئی تنظیم یا تحریک غافل نہیں ہوسکتی۔ اس کے بغیر تنظیم بظاہر تنظیم نظر آئے گی لیکن وہ روح سے خالی ہو کر ایک

بے جان جسد کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ ایک مردہ اور زندہ انسان کو پہلو بہ پہلو لٹا دیں تو دُور سے کوئی آدمی بظاہر دونوں میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتا۔ جب وہ نبض پر ہاتھ رکھ کر دیکھے گا تو اس کو یہ معلوم ہوگا کہ کس جسد میں دل دھڑک رہا ہے' اور کون ہاتھ' پاؤں' ناک' آنکھ' کان سب کچھ رکھنے کے باوجود وہ وظیفۂ حیات پورا کرنے سے قاصر ہے جس کے لیے وہ بنا تھا۔ اس لحاظ سے مقصدِ اصلی کا شعور ہر وقت تازہ رہنا ضروری ہے۔

مستقبل کو پیش نظر رکھیں: دوسرا اہم بنیادی اصول جو صرف ایک تحریکی تنظیم کے لیے ہے وہ یہ ہے کہ تحریکی تنظیم کے لیے وہی کام اصل کام ہے جو مستقبل' یعنی' آنے والی کل کی تشکیل' اس کے منصوبے اور اس کے مقاصد کے مطابق کر سکے۔ کل وہی طلوع ہوگی جس کے لیے آج کام کیا جائے گا۔ اگر آج وہ نہیں ہو رہا جس سے ''کل'' کا سورج اس نقشے پر طلوع ہو جو ہم چاہتے ہیں' تو ایسا سورج کبھی طلوع نہیں ہوگا۔ ایک آج کے بعد دوسری آج' دوسری آج کے بعد تیسری آج آتی رہے گی لیکن وہ کل کبھی نہیں آئے گی جس کے لیے ہماری نگاہیں منتظر ہیں' اور انگریزی کا وہ مقولہ پورا ہو جائے گا کہ:

Tomorrow never comes

ہماری ہر پالیسی' ہمارے ہر فیصلے' ہمارے ہر اقدام' ہمارے ہر قانون' ہمارے ہر ضابطے اور ہمارے دستور کی ہر شق کو اس ''کل'' کے لیے وقف ہونا چاہیے' کل کے لیے بننا چاہیے' کل کے لیے ہونا چاہیے۔ اگر یہ اس کل کو لانے کے لیے مد اور معاون نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس تحریک کے مقصد کو موثر نہیں بنا رہے۔ اس بات کو کہنے کی ضرورت شاید ہر تنظیم کو ہے لیکن سب سے کم اس بات کو کہنے کی ضرورت ان لوگوں کو ہونا چاہیے جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ آج کی ساری زندگی فکرِ فردا میں بسر ہونی چاہیے۔ دنیا کی ساری زندگی میں وہی کام کارگر ہے جو آخرت میں نافع ہو۔ جس

قوم کے افراد کے دل و دماغ میں یہ بات رچی بسی ہو' ان کو یہ بات یاد دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ دنیا کے اندر بھی تنظیم کو اپنے کام' فیصلے اور اقدامات وہی کرنے چاہئیں جو کل نافع ہوں۔ آج کی زندگی آخرت میں وہ نقشہ نہ بنا سکے جو مطلوب ہے تو ضائع اور بیکار ہے۔ اسی طرح تنظیم کے آج کے وہ کام جو کل کا نقشہ بنانے میں ممد و معاون نہ ہوں وہ بھی بیکار ہیں اور تنظیم کو خواہ مخواہ بوجھل بنا کر یہ تاثر دیتے ہیں کہ تنظیم بڑی متحرک ہے اور بڑا کام کر رہی ہے۔ اگر وہ کل کو لانے میں مدد نہیں دے رہے اور آج کے مسائل کو آج نمٹانے کا کام کر رہے ہیں تو اس کے معنی ہیں کہ یہ تنظیم کو موثر نہیں بنا رہے۔

معاشرے پر اثرات : تیسرا بنیادی اصول' جس کا اطلاق ایک تحریکی تنظیم پر ہوگا کسی دوسری تنظیم پر نہیں ہوگا' اگرچہ دوسری تنظیمیں بھی ایک حد تک اس سے متاثر ہوں گی' وہ یہ ہے کہ تنظیم کے کام کے نتائج اِس کے اندر کو دیکھ کر نہیں قائم کیے جا سکتے۔ ایک تحریکی تنظیم کے کام کے نتائج اس معاشرے کے اندر ہی دیکھے جا سکتے ہیں جس میں وہ کام کر رہی ہے۔

پولیس کی کارکردگی کا اندازہ اس بات سے نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی ڈرل کتنی اچھی ہے' سپاہی کس نظم و ضبط سے حاضر ہوتے ہیں' ان کی وردیاں کتنی صاف ستھری ہیں بلکہ یہ دیکھ کر کیا جائے گا کہ جرائم پر قابو پانے میں وہ کس حد تک کامیاب ہے۔ ایک تعلیمی ادارہ بھی یہ نہیں کہے گا کہ ہماری عمارت اتنی عالی شان ہے' ہمارے اساتذہ کی تعداد اتنی ہے' ہمارے ہاں ۱۰ ہزار طلبا آتے ہیں بلکہ اس کو بھی شاید یہ دیکھنا پڑے گا کہ جو لوگ وہاں سے سند لے کر جاتے ہیں' معاشرے میں وہ کیا کرتے ہیں۔ ایک تحریکی تنظیم تو ہرگز اس بات پر مطمئن نہیں ہو سکتی کہ ہمارے اجتماع میں بہت لوگ آ گئے' ہماری تربیت گاہ کامیاب ہوگئی' ہم نے بڑے اچھے رسالے نکال لیے۔ اس لیے کہ ان کے وہی نتائج معتبر ہوں گے جو معاشرے کے اندر نمودار ہوں۔

اب اس کے بعد میں آپ کے سامنے سات اصول اور تدابیر ایسی پیش کروں گا جو ان بنیادی اصولوں سے نکلتے ہیں۔ یہ تین جڑیں ہیں جس کی سات شاخیں ہیں۔ اس میں کچھ اصول ہیں اور کچھ تدابیر۔ اگر آپ ان کو ملحوظ رکھیں اور عملی جامہ پہنائیں تو آپ ان کو اپنے لیے یقیناً مفید پائیں گے۔

محض تنظیم مقصود نہیں

۱- پہلی بات یہ ہے کہ تنظیم کو خود مقصد نہ بننے دیں۔

میں نے یہ بات کہی تھی کہ مقصد اصلی پر نگاہ مرکوز رہے۔ اس میں آمیزش بھی ہوتی ہے، تغیر بھی ہوتا ہے، یہ نگاہوں سے اوجھل بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا سب سے بڑا خطرہ جو کسی تنظیم کو پیش آ سکتا ہے وہ یہ ہے کہ تنظیم فی نفسہ خود ہی مقصود بن جائے۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ چیز جو ایک ذریعے کے طور پر بنائی گئی ہے، جس کا کام یہ ہے کہ معاشرے کو مسخر کرے، اسلامی انقلاب کی منزل کو قریب لائے، اس کی اپنی خدمت کے اندر لوگ مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ چیز ایک دینی تنظیم میں خاص طور پر پیش آ سکتی ہے۔ یہاں ایک بات یہ ہے کہ تنظیم لازمی اور ناگزیر ہے، اس کو ہم مسترد نہیں کر سکتے، چھوڑ نہیں سکتے۔ اور دوسری بات یہ کہ وہ خود بھی ایک مقدس چیز ہے۔ دینی اداروں پر یہ کیفیت اکثر طاری ہوتی ہے۔ وہ تنظیمیں، وہ ادارے، وہ مراسم جو کسی مقصد کے لیے قائم کیے جاتے ہیں، خود اپنی جگہ پر مقصد بن جاتے ہیں۔

نماز کے معاملے کو ہی لیجیے۔ نماز کا مقصد اقم الصلوۃ لذکری قرآن نے واضح کیا ہے۔ لیکن نماز کی حاضری اور مسجد خود اپنی جگہ پر ایک مقصد بن گیا ہے اور اس کی روح اور جان نکل چکی ہے۔ روح اور جان اس لیے نہیں نکلی کہ نماز کی جگہ کسی دوسری عبادت نے لے لی ہے، بلکہ وہ عبادت خود فی نفسہ مقصود بن گئی ہے اور اس سے آگے جو منزلیں ہیں ان سے نگاہیں ہٹ گئی ہیں۔ ایک دینی تنظیم کے لیے اس کا حقیقی امکان

موجود ہے۔ اس کی علامات میں سے ایک علامت جو بڑی صاف اور واضح ہے' یہ ہے کہ تنظیم کے پاس جو وسائل ہیں اس کا ایک حصہ لازماً تنظیم کی خدمت اور چلانے کے لیے لگتا ہے اور ایک حصہ اس مقصد کی خاطر کہ پیش رفت ہو' پھیلیں' مسخر کریں۔ جب تنظیم خود مقصد بننا شروع ہوتی ہے تو سب سے پہلے یہ تناسب بگڑنا شروع ہوتا ہے۔ وہ حصہ جو تنظیم کی خدمت میں لگتا ہے وہ بڑھتا جاتا ہے اور وہ حصہ جو تنظیم کے مقصد اور پیغام کو پھیلانے کے لیے لگنا چاہیے وہ گھٹتا جاتا ہے۔

بالکل ابتدا میں جب دو آدمی کام شروع کرتے ہیں تو ان کے وقت کا ایک فی صد حصہ تنظیم پر لگتا ہے اور باقی ۹۹ فی صد توسیع اور غلبے کی جدوجہد میں صرف ہوتا ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ جب لوگ بڑھیں گے تو تناسب تبدیل ہوگا۔ تنظیم بڑھے گی' زیادہ وسائل لے گی لیکن بالآخر یہ وسائل اپنے فطری مقام سے ہٹ جاتے ہیں۔ جب یہ ہوتا ہے تو تنظیم کی تاثیر میں کمی واقع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے کوئی فارمولا بیان نہیں کیا جاسکتا کہ اتنے فی صد وسائل تنظیم کو چلانے کے لیے لگنا چاہییں اور اتنے فی صد وسائل ترقی اور نشوونما اور توسیع کے لیے لگنا چاہییں۔ ملک کے بجٹ پر جب ہم کھڑے ہو کر تنقید کرتے ہیں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ غیر ترقیاتی اخراجات بڑھتے چلے جارہے ہیں اور ترقیاتی اخراجات کم ہوتے چلے جارہے ہیں اور یوں قوم کی معیشت زوال کی طرف جارہی ہے۔ تحریک کے وسائل کے بارے میں بھی اسی طرح سوچنے کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی غیر ترقیاتی اخراجات کی نفی نہیں کرے گا لیکن ہر ایک یہ چاہے گا کہ یہ کم سے کم ہوں اور زیادہ سے زیادہ اخراجات ترقیاتی ہوں۔ اخراجات سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں پیسہ خرچ کرنے کی بات کر رہا ہوں بلکہ انسان کے اوقات اور صلاحیتیں' یہ ان چیزوں میں شامل ہیں جن سے تحریک توسیع حاصل کرتی' پھیلتی اور معاشرے کو مسخر کرتی ہے۔ یہ ایک علامت ہے جو واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے اور جسے جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

دوسری علامت یہ ہے کہ تنظیم پیش رفت کرنے کے بجائے اپنے مقام پر کھڑے ہو کر وسائل خرچ کرتی رہتی ہے۔ ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں۔ موٹر کار کا مقصد یہ ہے کہ وہ راستے پر چل کر اپنی منزل پہ پہنچے۔ اگر موٹر کار میں ڈرائیور بیٹھا ہو' اس کا پاؤں ایکسیلیریٹر پر ہو' اس کے ہاتھ میں اسٹیرنگ ہو' مسافروں سے گاڑی بھری ہوئی ہو' پٹرول پمپ سے پائپ اس کے اندر لگا ہوا ہو اور برابر پٹرول جا رہا ہو' انجن چل رہا ہو' لیکن گاڑی اپنی منزل کی طرف آگے نہ بڑھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ گاڑی خود مقصود بن گئی۔ لوگ بیٹھے ہیں' جھاڑ پونچھ کر رہے ہیں' تیل ڈال رہے ہیں' سروس کر رہے ہیں' پٹرول بھی بھر رہے ہیں' مسافر بھی بیٹھے ہوئے ہیں' ڈرائیور بھی موجود ہے اور ہر طرح سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ بڑی مضبوط اور عمدہ گاڑی ہے جو اپنے مقام پر کھڑی ہے۔ لیکن اگر وہ پیش رفت نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ گاڑی خود مقصود ہے' منزلِ مقصود نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ یہ دو علامتیں ہیں جن پر آپ کبھی بھی جانچ پرکھ کر دیکھ سکتے ہیں کہ اس خطرے سے ہم کتنا قریب ہیں اور کتنا دُور ہیں۔

''کیوں'' کا سوال کیجیے

۲- حکمت عملی کا دوسرا اصول یہ ہے کہ تنظیم کو ایک سیدھا سادا سوال کرنے کی جرأت اور ہمت ہونی چاہیے۔ یہ سوال بڑا سیدھا ہے لیکن اس کو کرنا بڑا مشکل ہے۔ اس کے لیے بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ اس کے جوابات ایسے آسکتے ہیں جو تلخ اور ناگوار ہوں یا جن پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہو۔ وہ سادا مختصر سوال ہے: کیوں؟ جو کچھ بھی ہم کر رہے ہیں' کیوں کر رہے ہیں؟

یہ کیوں کا سوال ہم کرنے سے بچتے ہیں۔ بڑے بڑے پروگرام اور منصوبے بناتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ کیوں کر رہے ہیں؟ بڑے بڑے کام کر جاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ یہ ہم نے کیوں کیا؟ یہ کیوں کا سوال ایک چھوٹی سی چیز سے لے کر'

خواہ ایک سرکلر نکالنا ہو' ہفتہ وار اجتماع کرنا ہو' کوئی رسالہ نکالنا ہو' کوئی تربیت گاہ کرنی ہو' یا ملک گیر پیمانے پر کوئی انقلابی مہم چلانا ہو' یا بین الاقوامی سطح پر کوئی منصوبہ بندی کرنا ہو' ہر جگہ کرنا چاہیے۔ یہ کیوں کا سوال ایک ایسی کلید ہے جو آپ کے ہاتھ میں آئے تو آپ اپنی تنظیم کو موثر اور کارگر بنا سکتے ہیں۔ یہ ہر وقت کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر وقت سے میرا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو کرنے سے پہلے بھی' اسے کرتے ہوئے بھی' اور کرنے کے بعد بھی۔ دراصل یہ سوال ہر چیز کے بارے میں کرنے کی ضرورت ہے۔ جو کام روز کرنے کے ہیں' ان کے بارے میں روز کرنے کی ضرورت ہے۔ جو کام بہت ہی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں' ان کے بارے میں بھی وقفے وقفے کے بعد کیوں کا سوال کرنے کی ضرورت ہے۔ شوریٰ کا اگر اجتماع ہوا تو کیوں ہوا' دستور میں یہ ڈھانچہ بنا ہے تو کیوں بنا' کیا ہماری منزل اس سے قریب آ رہی ہے؟

بظاہر یہ سوال کرنا بڑا آسان نظر آتا ہے۔ مگر یہ اس لیے بڑا مشکل ہے کہ اس کے جوابات جب آنا شروع ہوں گے تو شاید آپ کو یہ محسوس ہو کہ بہت ساری چیزیں جن کو ہم سینے سے لگائے لگائے پھر رہے ہیں وہ ایک ماضی کا بوجھ ہے۔ ان کی حیثیت ایک لاش کی ہے۔ اگر ہم ان کو ہمت اور جرأت کے ساتھ اٹھا کر پھینک دیں اور نئی راہیں تلاش کریں تو شاید ہمارا قافلہ منزل کی جانب زیادہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھ سکتا ہے۔ لیکن ایک باپ اپنے بیٹے کی لاش آخر وقت تک اپنے گھر سے نکالنا گوارا نہیں کرتا۔ تحریک اور تنظیم کے لیے بھی جن چیزوں کو وہ برسوں سے کرتے چلے آئے ہوں' خواہ وہ بہت معمولی چیزیں ہوں' ان کو چھوڑنے کے لیے ہمت اور جرأت کا فقدان ہوتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ''کیوں'' کے جواب میں اگر یہ محسوس ہو کہ یہ چیزیں غیر موثر ہیں تو سب کو ترک کرنا لازمی ہے۔ آپ یہ نہ کہیں کہ میں سارے ڈھانچے کو ملیا میٹ کرنے کی بات کر رہا ہوں۔ اس سے کم سے کم جو فائدہ ہوگا' وہ یہ ہے کہ آپ یہ سوچیں گے کہ جو چیز ہم کرتے چلے آئے ہیں' اگر غیر موثر ہے تو اس کو موثر کیسے بنائیں۔ ہم دیکھیں کہ ہم

یہ کیوں کر رہے ہیں' اس سے کیا حاصل ہو رہا ہے' اصل مقصد کی طرف اس سے پیش رفت میں کیا مدد مل رہی ہے۔

میری نظر میں یہی کام اصل میں جائزے کا کام ہے۔ ہم نے جائزے کا کام اس کو سمجھ لیا ہے کہ ہم کئی لوگ جمع ہوتے ہیں' گھنٹوں صرف کرتے ہیں' ۵۰' ۶۰ آدمی دو دو دن بیٹھ کر رپورٹیں سنتے ہیں' وہی باتیں سنتے ہیں جو اچھی طرح وہ جانتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے کام کا جائزہ مکمل کر لیا۔ یہ جائزہ نہیں ہے۔ یہ بس معلومات فراہم ہو گئی ہیں۔ جائزے کا کام یہ ہے کہ جو کچھ ہوا' کیوں ہوا' اس سے کیا حاصل ہوا' اور اس سے ہمارے مقصد کی طرف پیش رفت میں کیا مدد ملی؟ جو چیزیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے لازم کی ہیں' ان کو تو کسی صورت میں ترک نہیں کیا جا سکتا۔ نماز مفید نہیں ہو رہی تو اُسی کو مفید بنانا ہے' اس کو چھوڑ کر کوئی دوسری تدابیر اختیار نہیں کی جا سکتیں۔ جو روایات تحریک کی جان ہیں انھی کو کارگر اور موثر بنانا ہے' لیکن اس کے علاوہ انسان کی بنائی ہوئی کوئی چیز بھی اتنی مقدس نہیں ہے کہ اس کو ترک نہ کیا جا سکے' اس میں ترمیم نہ کی جا سکے' اور اس میں تغیر نہ کیا جا سکے۔ ''کیوں'' کے سوال کے نتیجے میں جو جائزہ ہوگا' میرے خیال میں وہی جائزے کی اصل روح ہے۔

منصوبہ بندی

۳- تیسرا اصول منصوبہ بندی ہے۔

منصوبہ بندی کا لفظ ہماری زندگی کے اندر بڑا عام ہے۔ اس لیے یہ بتانے سے پہلے کہ منصوبہ بندی سے میرا مطلب کیا ہے' یہ جاننا شاید زیادہ ضروری ہے کہ منصوبہ بندی کیا نہیں ہے۔ بعض دفعہ یہ جان لینے سے کہ چیز کیا نہیں ہے' یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہے؟

منصوبہ بندی اس بات کا نام نہیں ہے کہ کاموں کی ایک فہرست مرتب کر لی

جائے: ایک تربیت گاہ' دو ضلعی اجتماعات' مہینہ میں چار دفعہ تبلیغی وفود کی روانگی' اور بس منصوبہ بن گیا۔ یہ تو کاموں کی ایک فہرست ہے' ایک پروگرام ہے' یہ پلان نہیں ہے۔ پلان اور پروگرام میں تھوڑا سا فرق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیے ہوئے کاموں کو کرتے چلے جانا بھی منصوبہ بندی نہیں ہے۔ جو کام پچھلے سال منصوبے میں شامل تھے' بیٹھ کر پھر ان کو منصوبے میں شامل کر دیں تو یہ کام منصوبہ بندی میں شمار نہیں ہوگا۔ تیسری بات یہ ہے کہ خواہشات اور تمناؤں کا نام بھی منصوبہ نہیں ہے۔ دعوت کو تیز کرو' تربیت کو اور زیادہ کرو' پھیل جاؤ--- یہ منصوبہ نہیں ہے۔ یہ آپ کی خواہشات ہیں اور خواہشات کبھی عملی جامہ پہنتی ہیں اور کبھی نہیں پہنتیں۔ منصوبہ وہ ہے جو واضح طور پر یہ طے کرے کہ کیا کرنا ہے۔

اس سے بھی پہلے اس بنیادی سوال کا جواب حاصل کرنا چاہیے: کیوں کرنا ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے بعد منصوبے کے اندر چار سوالوں کے جواب دینے کی ضرورت ہے۔

پہلا یہ کہ کیا کرنا ہے' دوسرا یہ کہ کس طرح کرنا ہے' تیسرا یہ کہ کون سے وسائل درکار ہوں گے' اور چوتھا یہ کہ وہ کہاں سے فراہم ہوں گے۔ آپ کو کوئی چھوٹا سا کام کرنا ہو' تقریر ریکارڈ کرنی ہو یا تربیت گاہ کرنا ہو' یا اس سے بھی بڑا کام ہو' پورے ملک میں تحریک کو پھیلانا ہو' لیکن ان چار سوالوں کا جواب آپ کو دینا ہوگا۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ آپ جیبیں ٹٹولتے رہیں کہ کرنے کو کام موجود ہے' لیکن وسائل موجود نہیں ہیں۔ آپ نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس چیز کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

منصوبہ مستقبل کی طرف پیش قدمی کا نام ہے۔ صبح سے لے کر شام تک جو کام کر لینا ہے' ان کی فہرست کا نام نہیں ہے۔ منصوبہ اس بات کا نام ہے کہ آج میں وہ کون سے کام کروں جن سے مستقبل اور کل میری مرضی کے مطابق ہو جائے۔ دوسرے الفاظ میں مستقبل کی طرف پیش قدمی کرنے کے لیے واضح اقدامات کرنے کا نام منصوبہ ہے۔

منصوبہ بندی: قابل توجہ امور

اس منصوبہ بندی کے بارے میں چند اہم باتیں قابل توجہ ہیں:

۱- منصوبہ بنانے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ آپ کے پاس مستقبل کا ایک اندازہ موجود ہو۔ آپ غیب کا علم تو نہیں رکھتے لیکن انسانی استطاعت کے اندر آپ یہ قیاس کرنے کے قابل ہوں کہ کل کیا ہوسکتا ہے۔ کون سے حریف ہیں اور کل وہ کہاں پر ہوں گے' اور کون سے حلیف ہیں اور کل وہ کہاں پر ہوں گے' اور کون سے مخاطبین ہیں اور کل وہ کون سی صورت اختیار کریں گے۔ اس کا اندازہ کیے بغیر کوئی منصوبہ نہیں بن سکتا۔

۲- آپ کے سامنے کُل کام کا اندازہ ہونا چاہیے۔ ورنہ آپ ایک قدم سے دوسرا قدم اٹھاتے رہیں گے لیکن اصل منزل سے اتنی ہی دور رہیں گے جتنا کہ شروع میں تھے۔ آپ کہیں کہ آج دو ارکان تھے اب تین ہو گئے' اب پانچ ہو گئے' اب سات ہو گئے لیکن یہ ناکافی ہے۔ جن تنظیموں کے سامنے کوئی منزل ہو ان کے سامنے منزل کا پورا اندازہ ہونا چاہیے۔

مستقبل کے اندازے لازمی اور ناگزیر ہیں اور کُل کام کا اندازہ بھی ضروری ہے' یعنی کام کا جو ہدف ہے اور اس میں سے جو ممکن ہے' یہ سارے اندازے نگاہوں کے سامنے ہونے چاہییں۔ اس کے بغیر منصوبہ بندی نہیں ہوتی۔ زندہ قومیں ۲۰'۲۰ سال کے اندازے لگا کر غور اور پلاننگ کرتی ہیں۔ ابھی اسلامی تحریکیں بالکل ابتدائی دور میں ہیں۔ لیکن بڑی طاقتوں کے پاس وہ مراکز موجود ہیں جو اس امکانی خطرے سے نمٹنے کی تیاری کر رہے ہیں جو ممکن ہے کہ آج سے ۲۵'۳۰ سال بعد پیش آئے۔

۳- مستقبل کے لیے اہداف کا تعین ضروری ہے۔ جو کام کل کرنا ہے وہ آپ پہلے ہی منصوبہ بندی میں شامل نہیں کر لیں گے لیکن جو کام کرنا ہے وہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔ کل کا آپ ٹارگٹ بنائیں گے تو جو ممکن ہے وہ آپ کو حاصل ہو جائے گا۔ لیکن یہ کہ اگر آپ چھوٹی چیزوں پر قناعت کر جائیں گے تو چھوٹی چیزیں ہی آپ کو حاصل

ہوں گی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اہداف بلند ہوں۔ وہ جماعتیں اور قومیں جو اونچے اور بلند اہداف رکھنے سے قاصر ہیں' دنیا میں کبھی اعلیٰ مقام حاصل نہیں کرسکتیں۔ جو ہمیشہ تھوڑی مدت کے لیے تھوڑی چیز پر قانع ہو جائیں' ان کے قدم کبھی آگے نہیں بڑھ سکتے۔

۴- ترجیحات کا قائم کرنا بڑا ضروری ہے۔ کسی وقت بھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ جو کام آپ کرنا چاہیں گے' اس کے لیے آپ کے پاس پورے وسائل موجود ہوں۔ یہ انسانی زندگی میں بالکل ناممکن شے ہے۔ کام اس لیے کرتے چلے جائیں کہ یہ کام تو بڑا اچھا اور بڑا ضروری ہے' اس کام کا تو بڑا تقاضا ہے تو کاموں کا بوجھ لدتا چلا جائے گا اور تنظیم بوجھل اور غیر موثر ہوتی چلی جائے گی۔ اس لیے ترجیحات قائم کرنا ناگزیر اور لازمی ہے۔ ترجیحات کے مطابق کام نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ہم کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا کام زیادہ اہم ہے اور کون سا کام کم اہم ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم میں ''نہیں'' کہنے کی جرأت اور ہمت نہیں ہوتی۔ ہر وہ کام جو پسند آجائے کر لینے کا نہیں ہوتا۔ ہم میں یہ کہنے کی جرأت ہونی چاہیے کہ ہم اس کام کو اس وقت تک ہاتھ میں نہیں لے سکتے جب تک اس کے لیے وسائل نہ ہوں۔ ترجیحات قائم کرنے کے لیے یہ فیصلہ ضروری ہے۔

۵- آخری بات یہ ہے کہ جو کچھ بھی آپ طے کریں اس کو فیصلے کی صورت دینا ضروری ہے' اور اس کے لیے چھ کاف (ک) کا جواب ہونا چاہیے۔ جس طرح کن فیکون ہوتا ہے' یہ بھی (ک) سے ہی بنا ہے' اسی طرح یہ چھ کاف ہیں۔ اگر ان کا جواب دے کر کوئی فیصلہ کریں گے تو وہ فیصلہ فیکون ہو سکے گا' یعنی کیوں' کیا' کس طرح' کون' کہاں' کب۔ ورنہ میرے بھی علم میں ہے اور میرا تجربہ آپ میں سے بہت سوں سے زیادہ طویل ہے' اور آپ کے بھی علم میں ہوگا کہ بے شمار فیصلے' رودادوں اور کاغذوں کی زینت بنے رہتے ہیں اور عملی جامہ نہیں پہنتے۔

امکانات پر توجہ رہے

حکمت تنظیم کا چوتھا اصول یہ ہے کہ تنظیم کو اپنے وسائل' مسائل کے بجائے امکانات پر مرتکز کرنا چاہئیں۔

مسائل ہر تنظیم کے ساتھ ہوتے ہیں۔ انسانوں کے مسائل بھی ہوتے ہیں' فلاں آدمی کمزور ہوگیا' فلاں آدمی خراب ہوگیا' فلاں جگہ بیت المال میں خرد برد ہوگئی وغیرہ وغیرہ۔ جیسے جیسے تنظیم پھیلتی جاتی ہے' مسائل کی مقدار بھی بڑھتی جاتی ہے۔ اگر آپ ان سب مسائل سے الجھنا چاہیں گے' سب کو حل کرنا چاہیں گے تو آپ کے پاس کوئی وقت اس کے لیے نہیں بچے گا کہ آپ کل کے بارے میں کچھ سوچ سکیں' بلکہ کچھ اپنی گرہ سے دے کر ہی آپ چھوٹیں گے۔ تب بھی یہ مسائل اُسی طرح آپ کے سر پر سوار رہیں گے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مسائل کو حل کرنے کی کوشش نہ کریں لیکن آپ یہ سمجھ لیں کہ سارے مسائل حل نہیں ہوں گے اور تنظیم کو اپنی قوتوں کا ایک حصہ اگر مسائل کو حل کرنے میں لگانا چاہیے تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ بعض مسائل کو حل کرنے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ مسائل حل کرنے میں جتنی قوت کھائیں گے اُس قوت سے ہم کئی گنا زیادہ قوت اور پیدا کر سکتے ہیں۔

ایک آدمی کو سدھارنے میں ایک مہینہ لگتا ہے تو اس ایک مہینے میں شاید ۱۰ نئے آدمی ہمارے ساتھ آسکتے ہیں اور مجھے یہ بات کہنے میں کوئی باک نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت عملی بھی یہی تھی۔ اسی لیے آپؐ کے معاشرے میں اچھے' برے' منافق' خراب' سب انسان موجود تھے اور سب کو آپؐ لے کر چل رہے تھے لیکن آپؐ کی توجہ اسی بات پر مرکوز تھی کہ اصلاح کا کام بھی کرو اور ساتھ ساتھ اپنی دعوت بھی پھیلاتے جاؤ اور پھیلتے جاؤ اور اس خطرے سے کہ خراب اور غلط لوگ آرہے ہیں' اس پھیلاؤ کو مت روکو۔ اسی پالیسی کے نتیجے میں مدینہ کی ریاست ۱۰۰ برس کے عرصے میں اسپین سے لے کر چین تک پھیل گئی' ورنہ یہ اُسی جزیرے کے اندر' اُسی کوزے کے اندر' اُسی کلھیا کے اندر گڑ پھوڑتی

رہتی اور لوگوں کو مانجھتی رہتی اور ان کی اصلاح کرتی رہتی اور مسائل کو حل کرتی رہتی۔

ہر موقع پر بعض چیزیں آپ کے سامنے امکانی (potential) ہوتی ہیں۔ ان کو اگر آپ گرفت میں لے لیں تو تنظیم اپنے مقصد میں کہیں آگے بڑھ سکتی ہے' اور بعض چیزیں اس کے دامن کو کھینچتی ہیں' ان کو بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ لیکن آپ امکانات اور مواقع پر توجہ زیادہ مرکوز کریں' مسائل پر توجہ ذرا کم کریں' اس لیے کہ اس وقت ساری توجہ مسائل کھا جاتے ہیں۔

ہلکی پھلکی تنظیم

پانچواں اصول یہ ہے کہ تنظیم کو ہلکا پھلکا ہونا چاہیے۔

ہلکی پھلکی چیز زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ سکتی ہے۔ بھاری بھرکم اور بوجھل چیز کے لیے چلنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے اندر مسائل و امراض بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ انسان زیادہ وزن جمع کر لے' موٹا ہو جائے تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ بھئی اپنا وزن کم کرو۔ دنیا کی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ وہی فوجیں کامیاب ہوئیں جن کے پاس ہلکے پھلکے تیز رفتار ہتھیار تھے۔ ہاتھی کے مقابلے میں اونٹ غالب آیا۔ اونٹ کے مقابلے میں گھوڑا غالب آیا اور گھوڑے کے مقابلے میں ٹینک غالب آیا۔ ٹینک کے مقابلے میں ہوائی جہاز غالب آیا اور ہوائی جہاز کے مقابلے میں وہ میزائل جو چند منٹوں میں ہزاروں میل چلا جائے۔ جو بات فن حرب کے لیے صادق آتی ہے وہی بات تنظیموں کے لیے بھی ہے۔

جو چیزیں تنظیموں کو بوجھل بناتی ہوں وہ چلنے کے اندر رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا چیزیں بوجھل بناتی ہیں؟ وہ تعداد میں بہت زیادہ ہیں لیکن میں آپ کی توجہ دو باتوں کی طرف ضرور دلاؤں گا۔

۱- پہلی چیز اجتماعات کی کثرت ہے۔ اجتماعات تنظیم کے لیے ناگزیر ہیں۔ لوگ سر جوڑ کر نہیں بیٹھیں گے تو تنظیمی زندگی پیدا نہیں ہوسکتی۔ میں اجتماع کی اہمیت کو کم نہیں

کررہا ہوں' یہ بتارہا ہوں کہ اجتماعات کی کثرت تنظیم کو بوجھل بنا دیتی ہے۔ ہر اجتماع کے بارے میں آپ ''کیوں'' کا سوال کریں کہ آخر یہ اجتماع کیوں ہو رہا ہے؟ محض اس لیے کہ ہوتا چلا آیا ہے؟ یا اس لیے کہ اس میں تنظیم کے لیے واقعی کوئی افادیت اور فائدہ ہے؟ صرف اس بنیاد پر فیصلہ کرنے سے ہی آپ بہت ساری میٹنگز اور اجتماعات سے پیچھا چھڑا سکیں گے۔

۲- دوسری بات کمیٹیوں کے حوالے سے ہے۔ کمیٹیاں بھی ضروری اور مفید ہیں لیکن کمیٹیوں کی زیادتی تنظیم کے بوجھل ہونے کی علامت ہے۔ اس بات کا جائزہ لیں کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ کام جو کہیں اور ہو جانا چاہیے تھا وہ کام نہیں ہوا' اور جو کام افراد کو کرنا چاہیے وہ کام اب کمیٹیاں کر رہی ہیں۔

وقت کی قدر

چھٹا اصول یہ ہے کہ تنظیم کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کا وقت ہے۔

تاجر کے لیے آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ پیسہ اصل سرمایہ ہے۔ لیکن اگر آپ آج کی business management کی کتابیں پڑھیں تو وہاں بھی یہی نظر آئے گا کہ اصل سرمایہ آئیڈیا اور انسان ہیں' پیسہ نہیں۔ آئیڈیا ہوگا' انسان ہوگا تو تجارت بڑھے گی' پیسہ بھی آجائے گا۔ تحریک کے پاس جو سب سے بڑا سرمایہ ہے وہ انسانوں کا وقت ہے۔ وقت کا حساب اور استعمال بڑا ضروری ہے۔

کسی بڑی تربیت گاہ میں لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں' اور چند ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ اگر ۵۰۰ افراد کی سہ روزہ تربیت گاہ ہے تو میرے حساب سے اس میں ڈیڑھ ہزار افرادی دنوں کا سرمایہ صرف ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ۵۰ آدمیوں کی شوریٰ چھ دن بیٹھتی ہے تو ذمہ دار افراد کے ۳۰۰ افرادی دن اس میں صرف ہوتے ہیں۔ دیکھنا چاہیے کہ یہ صرف اجتماع برائے اجتماع ہوا یا اس سے کوئی فائدہ بھی ہوا؟

پیسہ تو آپ بنک میں رکھ سکتے ہیں اور آج کا پیسہ آپ کل استعمال کر سکتے ہیں لیکن وقت کو آپ کہیں ڈیپازٹ نہیں کر سکتے۔ پیسہ آپ کے پاس نہ ہو تو آپ کہیں سے قرض مانگ کر خرچ کر سکتے ہیں' وقت آپ کہیں سے قرض پر لا کر خرچ نہیں کر سکتے' نہ اس کو آپ ڈیپازٹ کر سکتے ہیں' اور نہ فارورڈ کر سکتے ہیں۔ یہ تو بس آیا اور گیا اور اسی وقت کے اندر وہ پیش رفت کرنا ہے جس سے منزل قریب آئے۔ تنظیم کو سب سے بڑھ کر یہ فکر کرنی چاہیے کہ اس کے اجتماعی وقت کا استعمال کس طرح ہو رہا ہے۔ ایک آڈیٹر بڑی محنت سے یہ دیکھتا ہے کہ بیت المال میں پیسہ کہاں سے آیا اور کہاں گیا۔ آپ کو ایک ایسے آڈیٹر کی بھی ضرورت ہے جو یہ دیکھے کہ وقت کیسے آیا اور کہاں گیا؟ یہ محاسبہ بیت المال کے پیسے کے محاسبے سے کہیں زیادہ کڑا اور ضروری ہے۔ پیسہ تو ہاتھ کا میل ہے' آئے گا' چلا جائے گا' ضائع بھی ہوگا' کل بہت کچھ اور آجائے گا' اللہ تعالیٰ جب چاہے گا بہت عطا کر دے گا لیکن وقت وہ دوبارہ نہیں دے گا۔ جو وقت اس نے دیا ہے وہ جب چلا جائے گا تو دوبارہ نہیں ملے گا۔ ہم پیسے کے حساب کے لیے بڑا اہتمام کرتے ہیں' اس میں گھنٹوں ضائع کرتے ہیں۔ میں روپے پیسے کے حساب کی نفی نہیں کر رہا ہوں' آپ کو سمجھانے کے لیے مثال دے رہا ہوں' میں بھی حساب رکھتا ہوں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب کوئی تنظیم جس کو انقلاب لانا ہو' وہ ۶۰ شرکا کے اجلاس میں ایک گھنٹہ اس بحث پر صرف کرتی ہے' یعنی ۶۰ گھنٹے لگاتی ہے' کہ رپورٹ اکتوبر تک کی ہے' منصوبہ جنوری سے ہے تو آخر ہم حساب کیسے کریں؟ اصل میں وقت کا حساب اور خصوصاً تنظیمی وقت کا حساب کرنا نہایت ضروری ہے۔

قوتِ اجتہاد

ساتواں اصول یہ ہے کہ کسی بھی حکمت کو نافذ کرنے کے لیے اجتہاد کی قوت اور صلاحیت ناگزیر ہے۔

اجتہاد کے معنی یہ ہیں کہ ہر وقت آپ سوچ سکیں' کبھی سوچ کے دروازے بند نہ کریں۔ اب تک میں نے آپ کو کافی باتوں پر سوچنے اور غور کرنے کی دعوت دی ہے۔

آپ کو ہر مرحلے پر سوچ کر نئی راہیں نکالنا سیکھنا چاہیے۔ نئی صورت حال پیدا ہو تو اس سے نبٹنے کے لیے آپ کے پاس نئے منصوبے موجود ہوں' اور پرانے مسائل ہوں تو ان سے نمٹنے کے لیے بھی آپ کے پاس اتنی قوت اجتہاد ہو کہ آپ وہ پالیسیاں وضع کرسکیں کہ بعد میں آپ کا وقت بار بار ضائع نہ ہو۔ ایک ہی مسئلہ ہر سال سر اٹھا کر کھڑا ہوتا ہے' ہم پھر گھنٹوں صرف کر کے اس کو حل کرتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایسی پالیسی بنانے سے قاصر ہیں کہ ایک ہی اصول سے مسئلہ حل ہوتا چلا جائے۔ اگر کوئی نئی صورت حال پیدا ہوتی ہے جس میں ہم اجتہاد نہ کریں تو ٹھٹھر کر رہ جائیں گے' ماضی کے بوجھ تلے دب جائیں گے۔

میں اس وقت فقہ اور شریعت کی بات نہیں کر رہا' میں حکمت تنظیم کی بات کر رہا ہوں۔ زندہ معاشروں کی بات کر رہا ہوں۔ میں ایک مثال دوں گا۔ مسلمانوں نے عراق کی سرزمین فتح کی۔ یہ ایک نئی صورت حال تھی۔ اب تک کے جو رائج تصورات' قوانین اور اصول تھے ان کے لحاظ سے اس زمین کو فاتحین کے درمیان تقسیم ہو جانا چاہیے تھا۔ اس وقت کا حکمران اگر اجتہاد کی قوت سے عاری ہوتا تو اسلامی حکومت آیندہ برسوں میں بہترین وسائل سے محروم ہو جاتی اور عراق میں ایک بدترین جاگیرداری نظام نافذ ہو جاتا۔ مسجد نبویؐ میں تین دن کی بحث کے بعد ایک نئی راہ یہ نکالی گئی کہ یہ زمین تقسیم نہیں ہوگی۔ یہ ایک بڑا زبردست اجتہاد تھا جس کے بڑے گہرے اثرات معیشت اور سیاست کے رخ پر پڑے۔ لیکن اگر وہ اس پر اٹک جاتے کہ فے کے بارے میں تو یہی اصول ہے' اس سے ہٹا نہیں جا سکتا تو وہ جماعت دنیا کے اندر ایک زندہ تہذیب بن کر غالب نہیں ہو سکتی تھی۔

جو بات بڑی جماعتوں اور بڑی تہذیبوں کے لیے صحیح ہے' وہی بات چھوٹی

جماعتوں اور چھوٹے گروہوں کے لیے بھی ضروری ہے' وہی بات بزنس کارپوریشن کے لیے بھی ضروری ہے۔ کوئی تجارتی ادارہ جو آج سے ۱۰ سال بعد کی مارکیٹ کا جائزہ لے کر آج اجتہاد کر کے نئی مصنوعات لانے کا منصوبہ نہیں بنا سکتا' اس کے حریف آ کر اس کو میدان سے ہٹا دیں گے۔ روز حالات بدلیں گے اور نئے نئے منصوبوں کی ضرورت پڑے گی۔ پھر یا تو وہ خالی میدان میں کھڑا ہوگا اور اسے سمجھ میں نہیں آئے گا کہ وہ کیا بیچے' کیا کہے' یا کس بات کی دعوت دے' اور یا دوسرے حریف اس کا مال اُچک کے لے جائیں گے اور اس کے دعوے دار بن کر کھڑے ہو جائیں گے' اور وہ ششدر دیکھے گا کہ میرا مال اب دوسروں کے ہاتھ میں ہے' میری مارکیٹس دوسروں کے پاس ہیں' میرے گاہک دوسری دکانوں پر کھڑے ہوئے ہیں۔ میرے پاس ان کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ پیش بینی کے ساتھ اجتہاد کی صلاحیت کو استعمال کرنا تبدیلی کی قوت ہے۔ تغیر کے لیے ہمت بھی ضروری ہے۔ اجتہاد اس کے بغیر بیکار ہے۔

میں نے صرف سات اصول منتخب کر کے آپ کے سامنے پیش کیے ہیں۔ حکمت تنظیم کا موضوع بڑا وسیع موضوع ہے۔ اس کے تحت بہت ساری باتیں کہی جا سکتی تھیں۔ میں نے صرف منتخب باتیں رکھی ہیں۔ ہر بات اپنی جگہ تفصیل کی محتاج ہے۔ میں نے سمیٹ کر بات کی ہے لیکن کوشش کی ہے کہ نظریاتی باتیں نہ کروں۔ آپ ان باتوں کو صرف ایک تفریح سمجھ کر نہ پڑھیں بلکہ آپ خواہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوں یا ضلع کی سطح پر ہوں یا ملک کی سطح پر' ان کو سامنے رکھ کر ہمت اور جرأت سے تبدیلیاں کریں' اور ہمت اور جرأت سے ان چیزوں کو نافذ کریں۔ جتنا آپ نافذ کریں گے' مجھے یقین ہے کہ جو تنظیم جہاں بھی اسلامی انقلاب کے لیے کام کر رہی ہے وہ زیادہ موثر اور کارگر ہوتی چلی جائے گی۔

موثر قیادت: کیا اور کیسے؟

تنظیم اور قیادت ایک پہلو سے افراد کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کی حیثیت افراد کے مجموعے سے مختلف بھی ہوتی ہے۔ وہ سارے افراد جو اپنے اپنے مقام پر تحریک کی کسی ذمہ داری کو اٹھاتے ہیں' قیادت کا حصہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہماری قائد کی اس تعریف کے مطابق تحریک اسلامی کا ہر کارکن اپنے مقام پر دوسرے انسانوں کے لیے ذمہ دار ہے اور اس لحاظ سے وہ بھی ایک قائد ہے۔ اس لیے ہر فرد کو بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اپنی ذات کو اور اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے کیا تدابیر اختیار کر سکتا ہے۔

ذمہ داری کے مناصب پر فائز افراد کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے' ان سب کا کوئی مجموعی اور اصولی حل تو ممکن نہیں ہے' لیکن چند راہنما اصول ایسے وضع کیے جا سکتے ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ آئیڈیل بننے کی بھی کوشش کی جا سکتی ہے لیکن آئیڈیل بننا ممکن نہیں۔ یہ بات بار بار واضح کی گئی ہے کہ انسان کمزوریوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ خواہ کوئی انسان سب سے اونچے منصب پر پہنچ جائے یا ایک عام کارکن ہو' اس کی کارکردگی میں کچھ نقائص ہمیشہ رہ سکتے ہیں اور رہیں گے۔ اسی طرح اس کی ذات میں بھی نقائص رہ سکتے ہیں اور رہیں گے۔ لیکن جس طرح ہمارا یہ فرض ہے کہ تنظیم کے لحاظ سے بہتر سے بہتر اور خوب سے خوب تر کی تلاش

کریں' اور اس راستے میں جو تدابیر ہماری مدد و معاون ہوں اُن سے فائدہ اٹھائیں' اسی طرح ہر فرد کو اپنی ذات کو سامنے رکھ کر تنظیم سے الگ ہٹ کر اور مجموعی قیادت سے الگ ہٹ کر' یہ سوچنا چاہیے کہ وہ اپنی کارکردگی کو کیسے بہتر بنا سکتا ہے۔

احساسِ ذمہ داری

اس سلسلے میں سب سے پہلی چیز ذمہ داری کا احساس ہے۔ ذمہ داری کے احساس میں تین چیزیں شامل ہیں۔ ایک یہ کہ ذمہ داری کا دائرہ کیا ہے؟ دوسرے' اس کی جواب دہی کا احساس۔ تیسرے' جواب دہی کے احساس کے باوجود ذمہ داری کو اعتماد کے ساتھ قبول کرنا' اور اس کو بجا لانے کے لیے اپنی ساری قوتیں لگا دینا۔

ذمہ داری کا تعین: ذمہ داری کا دائرہ کیا ہے؟

جو آدمی کسی ذمہ داری پر فائز ہو اس کو تین پہلوؤں سے ہمیشہ غور کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ وہ اپنی ذات کے لیے ذمہ دار ہے لیکن وہ اپنی ذات کے لیے ان دوسرے انسانوں سے بڑھ کر ذمہ دار ہے جو اس کے ساتھ چل رہے ہیں۔ اگر وہ سب سے اونچے منصب پر ہے تو وہ اپنے سارے ساتھ چلنے والوں سے زیادہ اس بات کے لیے ذمہ دار ہے کہ وہ اپنی ذات کی فکر کرے۔ اگر وہ ایک عام کارکن ہے تو وہ کم سے کم اس بات کے لیے ذمہ دار ہے کہ جس محلے میں اور جس حلقے میں یا جس ادارے میں جن افراد کے درمیان وہ دعوت کا کام کر رہا ہے' ان کی ہدایت سے زیادہ اپنی ذات کی ہدایت اور اس کی تربیت کی فکر کرے۔ یہ اس کی ذمہ داری کا پہلا دائرہ ہے۔ لیکن یہاں کوئی تقدیم و تاخیر کا اصول نہیں ہے کہ پہلے اپنی ذات کی تعمیر کرے' تربیت کر لے تو پھر کوئی ذمہ داری قبول کرے۔

اپنی ذات سے نگاہ اٹھائے تو پھر اس کو ہمیشہ یہ احساس ہونا چاہیے کہ ذمہ داری بڑی ہو یا چھوٹی' یہ اُسی عظیم الشان ذمہ داری کا ایک حصہ ہے جسے **شھدا علی الناس**

کہا گیا ہے اور یہ سارے انسانوں کی طرف ایک ذمہ داری ہے۔ اس تصور کے مطابق ادارہ، محلہ، قوم، ملک اور ساری انسانیت اس ذمہ داری کی موجب ہے۔ خواہ ہم ایک آدمی پر انفرادی ربط کا کام کر رہے ہوں، یا ہم کسی ایک یونٹ، زون، یا حلقے اور محلے کے ذمہ دار ہوں، لیکن یہ کہ یہ بہرحال مجموعی ذمہ داری ہی کا ایک حصہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس پوری امت کے اوپر واجب کیا ہے۔ یہ احساس ذمہ داری کا دوسرا پہلو ہے۔

ذمہ داری کے احساس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ تنظیم نے جو بھی دائرہ کار طے کر دیا ہے، اس کے لحاظ سے وہ اپنی ذمہ داری کا جائزہ لے اور دیکھے کہ میں کہاں تک اپنی اس ذمہ داری کو ادا کر رہا ہوں۔

یہ دائرے، مناصب اور سطحیں بہت ساری ہیں۔ اس پوری گفتگو میں جگہ جگہ مثالیں دینی پڑیں گی۔ اس لیے میں نے چار چیزیں مثالیں دینے کے لیے منتخب کی ہیں۔ ایک یہ کہ کسی کے اوپر کسی شہر کی ذمہ داری ہو، دوسرے یہ کہ شہر کے اندر کسی حلقے کی ذمہ داری ہو، تیسرے یہ کہ وہ ایک عام کارکن ہو، اور چوتھے یہ کہ اس کے پاس کسی شعبے کی ذمہ داری ہو۔ ذمہ داریاں بہت ساری ہوسکتی ہیں لیکن جہاں کسی مثال کی ضرورت پڑے گی تو میں ان میں سے کسی ایک کی، دو کی یا چاروں کی مثال دے کر اپنی بات سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

احساسِ جواب دہی: ذمہ داری کے دائرے کے تعین کے بعد ذمہ داری کے احساس میں دوسری چیز احساسِ جواب دہی ہے اور یہی باقی سارے کاموں کے لیے کلید ہے۔ یہ ایک اسلامی تحریک ہے اور آپ کا مقصد بالآخر اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے، اس لیے ہر ذمہ داری کے ساتھ اس کی جواب دہی کا احساس بڑا ضروری ہے۔ اس معاملے میں قرآن کی متعدد آیات اور کئی احادیث ہیں۔ ان سب کو دہرانا میرا مقصود نہیں ہے۔ ایک روایت کے مطابق جو ۱۰ آدمیوں کے اوپر بھی ذمہ دار بنایا گیا وہ اُلٹی چھری

سے ذبح کر دیا گیا' یا گویا وہ آسمان سے لٹکا دیا گیا۔ ایسی ہی دیگر احادیث ہیں جن میں ذمہ داری کے احساس کا ذکر ہے۔ یہ حدیث کئی دفعہ آپ نے پڑھی اور سنی ہوگی: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ (تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور تم میں سے ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا)۔ اس میں تو یہ بات بالکل واضح ہے۔ کارکن اپنی رعیت کے لیے ذمہ دار ہے۔ شعبے کا ناظم اپنی رعیت کے لیے ذمہ دار ہے۔ شہر کا امیر اپنی رعیت کے لیے ذمہ دار ہے۔ یہاں اپنی رعیت کسی بادشاہ اور اس کی رعیت کے لیے استعمال نہیں ہو رہا' بلکہ اس سے مراد وہ بھیڑیں ہیں جو اس کے سپرد کر دی گئی ہیں کہ وہ ان کو صحیح راہ پر لائے' صحیح راہ پر رکھے۔ وہ ان کا چرواہا ہے۔ ان کے لیے وہ ذمہ دار ہوگا' اور اسی طرح جواب دہ ہوگا جس طرح انبیاے کرام اپنی قوموں کے لیے جواب دہ ہوں گے۔ فرمایا گیا ہے کہ ہم تم سے سوال کریں گے' ہر اُس شخص سے سوال کریں گے جو ذمہ دار بنایا گیا کہ تم نے کیا کیا اور کس طرح اپنے فریضے کو انجام دیا؟ ذمہ داری کا یہ احساس ہونا ضروری ہے۔

احساسِ جواب دہی کی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس کی بہترین مثال ہے۔ اپنی رسالتؐ کی ذمہ داری کے تصور سے تو آپؐ کی جان گھلتی رہتی تھی' آنکھیں نم ناک ہو جاتی تھیں' اور چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ مشہور واقعہ ہے کہ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے قرآن مجید کی تلاوت کی خواہش کا اظہار کیا۔ انھوں نے جب اس آیت کی تلاوت کی:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۝

(النساء ۴: ۴۱)

پھر سوچو اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر اُمت سے ایک گواہ لائیں گے اور ان لوگوں پر تمھیں (محمدؐ کو) گواہ کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔

آواز آئی: عبداللہ اب بس کرو۔ نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو حضورؐ کی آنکھوں سے

زاروقطار آنسو بہہ رہے تھے۔ قرآن نے خود آپؐ کو جگہ جگہ تسلی دی ہے اور یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپؐ دن رات اپنی ذمہ داری کے احساس سے اس کے غم میں گھلتے رہتے تھے۔ اسی طرح کسی خلیفہ کا یہ کہنا ہے کہ اگر فرات اور دجلہ کی وادی میں کوئی بکری بھی بھوکی مر جائے گی تو اللہ تعالیٰ مجھ سے اس کے بارے میں سوال کرے گا۔

اگرچہ یہ اسلامی ریاست کے عہدوں سے متعلق ہے، تاہم جو آدمی کسی مقام پر یا کسی یونٹ میں دعوت کے کام کا، تحریک کو پھیلانے کے کام کا ذمہ دار ہو، اس کے دل و دماغ پر یہ احساس طاری رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے بارے میں مجھ سے سوال کر سکتا ہے۔ اگر میں کسی حلقے کا ذمہ دار ہوں، کسی شہر کا ذمہ دار ہوں تو اللہ تعالیٰ مجھ سے ان کے بارے میں سوال کر سکتا ہے۔ صرف یہ احساس اپنی جگہ بہت ساری خوبیاں پیدا کرنے اور ذمہ داریوں کو احسن انداز میں ادا کرنے کی کلید ہے۔ یہ ساری جواب دہی دراصل آخرت کی جواب دہی ہے۔ جواب دہی کا یہ احساس اور یہ بار ایسا زبردست ہے کہ جو آدمی فی الواقع اس کو محسوس کرے، اس کے لیے آگے بڑھ کر اپنی گردن پیش کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ ہماری تنظیم کی بڑی درخشاں روایات میں سے یہ رہا ہے کہ لوگوں نے کبھی ذمہ داری کو خوش دلی کے ساتھ قبول نہیں کیا اور یہ تصور کبھی نہیں دیا کہ یہ ایسا منصب ہے کہ جس کے اوپر آدمی خوش ہو اور مبارک باد قبول کرے۔

ذمہ داری اٹھانا: تیسری بات یہ ہے کہ اس کام کو ہونا ہے، اس کام کو کرنا ہے اور اگر کوئی اس کام کو کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھے گا، ذمہ داری کو نہیں سنبھالے گا، خواہ وہ چھوٹے درجے کی ہو یا بڑے درجے کی، تو یہ کام ہی رک جائے گا۔ اس لیے اللہ پر، اس کی نصرت پر اور اس کی تائید پر اعتماد کر کے، اور یہ جان کر کہ یہ ذمہ داری اس کی طرف سے آرہی ہے اور وہ مدد کرے گا، ذمہ داری کو پوری خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھ کر قبول کرنا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح کام آگے بڑھ سکتا ہے۔

ایک چھوٹا سا واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ ۱۹۵۰ء میں پہلی دفعہ ہم لاہور آئے۔ یہ

ہمارا لاہور آنے کا اور تحریک کے اکابر سے ملنے کا پہلا موقع تھا۔ ہم پہلی مرتبہ مولانا مودودیؒ سے اور مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے اور دوسرے لوگوں سے ملے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے کہا کہ مولانا مودودیؒ کا علم' ان کی ذاتی وجاہت اور ان کا تدبر اپنی جگہ پر' ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے آگے بڑھ کر ذمہ داری لے کر وہ کام شروع کر دیا جو کوئی شروع کرنے کو تیار نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ فرض ہے۔ سب کہتے تھے کہ اس کو ہونا چاہیے۔ سب سمجھتے تھے کہ اس کی ضرورت ہے' لیکن سب کانپتے تھے کہ ہم کیسے اس کام کو کریں گے۔ یہ مولانا مودودیؒ کا سب سے بڑا contribution ہے کہ انھوں نے اس کام کو خود آگے بڑھ کے ذمہ داری لے کر شروع کر دیا۔

کام تو ہونے ہی ہیں۔ ذمہ داری جتنی گراں بار ہو' اس کا اجر بھی اتنا ہی بڑا ہے۔ جو بھی خلوص کے ساتھ سعی کرے گا' ہمیں یقین ہے اللہ تعالیٰ اس کی تائید بھی کرے گا اور مدد بھی' اور پھر وہ اس کو پورا بھی کرے گا۔ ذمہ داری کے دائرے کے تعین اور احساسِ جواب دہی کی شدت کے باوجود' جب ذمہ داری آئے تو پھر خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھ کے اُسے قبول کرنا اور اس کو نبھانے کی پوری کوشش کرنا' یہ بھی ذمہ داری کے اسی احساس کے اندر شامل ہے۔

اللہ کی تائید پر بھروسا

ذمہ داری کے احساس کے بعد دوسری چیز اللہ کی تائید اور اس کو حاصل کرنے کی کوشش ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کو اتنی بڑی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اپنی اپنی جگہ اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ وہ جہاں بھی ہو' ایک ادارے کی ذمہ داری ہو' یا ایک عام کارکن ہو وہ اپنے لیے بھی اور جو دعوت کا کام کر رہے ہوں' ان کے لیے بھی روئے' گڑگڑائے۔ آدمی کے پاس خواہ ایک شعبہ ہو' خواہ وہ نشرواشاعت کا ہی شعبہ ہو' تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے کام کو بہتر سے بہتر انداز میں کرنے کی توفیق عطا

فرمائے۔ یہ صرف بلند مناصب والوں کے لیے نہیں ہے کہ دعائیں کریں اور روئیں اور گڑگڑائیں۔ ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ سے استمداد اور استعانت اور طلبِ توفیق ضروری ہے۔ اگر کسی کو کتابیں بھی چھاپنا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ سے درخواست کرے کہ مجھے بہتر لکھنے کی' چھاپنے کی اور تقسیم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو بھی کام ہو' اللہ ہی سے مدد مانگنا چاہیے:

واذا استعنت واستعن باللّٰہ (ترمذی' مسند احمد)

جب تو مدد طلب کرے تو اللہ ہی سے طلب کر۔

یہ نہیں کہ بڑی ذمہ داری آئی تو آدمی رو لیا' گڑگڑا لیا اور چھوٹے چھوٹے کاموں کو ہم نے سمجھ لیا کہ یہ کام خود ہی کر لیں گے۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اللہ کی مرضی سے' اس کے چاہنے سے' اس کی مدد اور توفیق سے ہی ممکن ہوتا ہے' **(ماشا اللّٰہ ولا قوۃ الا باللّٰہ)**۔

خود اعتمادی: اللہ تعالیٰ پہ اس انحصار کا ایک نتیجہ خود اعتمادی ہے۔ خود اعتمادی کا لفظ ہماری لغت میں عام طور سے معدوم ہے کہ ہم اپنے اوپر کیوں اعتماد کریں' ہمیں تو اللہ کے اوپر اعتماد ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارا اپنے اوپر اعتماد ان معنوں میں اعتماد نہیں ہے جن معنوں میں کہ ایک دنیادار کا اعتماد ہوتا ہے۔ یہ احساس کے رب' رحمٰن و رحیم نے مجھے پیدا کیا ہے اور میرے اوپر ایک ذمہ داری ڈالی ہے' اور مجھ سے جواب طلب کرے گا اور عدل کے ساتھ کرے گا' اس بات کا یقین پیدا کرنے کے لیے کافی ہے کہ مجھے وہ صلاحیتیں یا تو اس نے دی ہیں یا دے گا جن کے ذریعے سے میں اس امتحان میں کامیاب ہو جاؤں۔ کسی امتحان میں ڈالنا اور امتحان میں پورا اترنے کی صلاحیت اور ذمہ داری نہ دینا یا اس کا امکان نہ ہونا' یہ عدل کے خلاف ہے۔ کم سے کم میری منطق تو یہ رہی ہے' اور میں نے اسی منطق پر ہمیشہ کام کیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذمہ داری آتی ہے اور میں نے خود آگے بڑھ کر نہیں اٹھائی ہے' تو وہ اس کی طرف سے امتحان ہے۔ اس

امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے اُس نے مجھے وہ چیزیں لازماً دی ہوں گی جن کو شاید میں نے اب تک محسوس نہیں کیا' جن کو میں پروان چڑھاؤں تو چڑھ جائیں گی' جن سے میں اس امتحان میں کم سے کم پاس ہوسکوں' اگرچہ فرسٹ کلاس نہ بھی لے سکوں۔ اس لیے میں اپنے اوپر یہ اعتماد رکھتا ہوں اور میرا یہ اعتماد اپنے اوپر نہیں ہے بلکہ میرے اللہ کے اوپر ہے کہ اس نے مجھے کم سے کم اتنا دیا ہے یا وہ دے گا جس سے میں اس امتحان میں ناکام نہ رہوں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ اُس کے عدل کے خلاف ہے کہ مجھے وہ ایک امتحان میں تو ڈال دے اور مجھے وہ چیزیں نہ دے جن سے میں امتحان میں کامیاب ہوسکوں۔ ہماری خود اعتمادی کی یہ منطق مادی دنیا کی منطق سے ذرا مختلف ہے۔ لیکن کسی کام کو اچھی طرح کرنے کے لیے' اور اس کو اچھے انجام تک پہنچانے کے لیے خود اعتمادی بڑی لازمی اور ضروری صفت ہے اور یہ اللہ کی تائید اور دعا ہی کا ایک حصہ ہے کہ اسی سے یہ چیز پیدا ہوتی ہے۔

خود اعتمادی کا سرچشمہ اور منبع اپنی صلاحیتوں کے اوپر فخر اور غرور نہیں ہے' اور نہ یہ کسی مادی چیز کا احساس ہے۔ یہ خالص تائید الٰہی اور اس کی رحمت اور اس کے عدل کے اوپر یقین ہے۔ خود اعتمادی اس سے پیدا ہوتی ہے' اور دعا سے اور استمداد سے اور استعانت سے تقویت پاتی ہے۔

اب ہم کچھ تدابیر کی طرف آتے ہیں:

وقت کا صحیح استعمال

ایک ذمہ دار آدمی کے لیے ہر چیز سے بڑھ کر جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنا وقت صحیح استعمال کرے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ ذمہ دار افراد کی سب سے بڑی شکایت یہی ہوتی ہے کہ ایک منٹ کی فرصت نہیں ملتی۔ کاش! کسی طرح ۲۴ گھنٹے نہ ہوتے ۲۶ گھنٹے ہوتے۔ صبح سے شام ہو جاتی ہے' اور وقت نہیں ملتا۔ کام ختم نہیں ہوتے۔ کیا

کریں یہ کام آج نہیں ہوا' کل کریں گے' کل نہ ہوا تو پرسوں ہوگا--- اسی مخمصے کا شکار رہتے ہیں۔ ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ وقت ہوتا ہے' جب کہ وقت ہی ہمارا اصل سرمایہ ہے۔ ہر کام کے لیے لازمی ہے کہ ہمارے پاس وقت ہو۔

ہوتا یہ ہے کہ ہم ایک کام سے دوسرے کام' اور دوسرے کام سے تیسرے کام کی طرف جاتے رہتے ہیں۔ وقت صرف ہوتا ہے' کچھ ضائع ہوتا ہے' کچھ بے نتیجہ رہتا ہے اور کچھ نتیجہ خیز بھی ہوتا ہے۔ کچھ صحیح مصرف میں لگتا ہے اور کچھ غلط مصرف میں لگتا ہے۔ ہم منصوبے بناتے ہیں۔ منصوبے سب صحیح ہوتے ہیں' لیکن جیسا میں نے کہا کہ بہت سارے منصوبے' مثلاً یہ کہ مجھے اس ہفتے میں پانچ کارکنوں سے ملاقات کرنا ہے' وہ منصوبے بھی عام طور سے ڈائری میں لکھے اس لیے رہ جاتے ہیں کہ وقت نہیں ملتا۔ یا یہ ہوتا ہے کہ مصروفیت کی وجہ سے بہت سے کام صرف ڈائری یا کاغذ پر رہ جاتے ہیں' یا ذہن میں ہی رہ جاتے ہیں۔ منصوبہ بندی کے لیے ڈائری بھی بہت کم لوگ استعمال کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وقت نہیں ملا' اب کیا کریں۔ یہ کام اگلے ہفتے ہوگا۔ بعض دفعہ جو کام اس ہفتے ہونے والا تھا' ۵۲ ہفتے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہیں ہے جہاں پہلے لکھا ہوا تھا۔ لہٰذا وقت سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

اس سے پہلے کہ اپنے آپ کو موثر اور کارگر کرنے کے لیے کہ کوئی منصوبہ بندی کریں اور یہ سوچیں کہ کیا کرنا ہے' ہم کو سب سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ ہم اپنا وقت کیسے استعمال کریں کہ وہ موثر اور کارگر ہو۔

اپنے وقت کا آڈٹ کیجیے: اس کا طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ معلوم کریں کہ وقت کہاں جاتا ہے۔ اس لیے کہ وقت تو بہرحال گزر رہا ہے اور کہیں نہ کہیں خرچ بھی ہو رہا ہے۔ ہم جو کہتے ہیں کہ ۲۴ گھنٹے میں ایک منٹ کی فرصت نہیں ملی' تو گویا ہمیں یہ معلوم ہے اور ہمیں یہ احساس ہے کہ پورا وقت خرچ ہوگیا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم اس پر تھوڑا سا باضابطہ (systematic) کام کریں تاکہ معلوم ہو کہ ہمارا

وقت کہاں جاتا ہے۔ عام طور سے ہم اپنے احساس' تاثر اور حافظے پر اعتماد کرتے ہیں' اور حافظہ اور تاثر اکثر ہم کو غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ ہم تو بہت مصروف ہیں اور بہت کام کر رہے ہیں۔ اگر ہم کبھی باضابطہ جائزہ لیں تو یہ معلوم ہوگا کہ اس میں سے واقعی کام کتنے ہیں اور صرف وقت گزارنے والی چیزیں کتنی ہیں۔

حافظے یا اندازے پر بھروسا کرنے کے بجائے ایک چھوٹی سی ٹیکنیک یہ ہے کہ آدمی ہر چھ مہینے بعد یا تین مہینے بعد اپنے دو ہفتے کی سرگرمیوں کا مکمل ریکارڈ رکھے اور جائزہ لے کہ پورا وقت کن کاموں میں صرف ہوا۔ دن میں ۲۴ گھنٹے ہوتے ہیں' وہ کہاں کہاں گئے؟ یعنی جس طرح مال کا آڈٹ ہوتا ہے اور ہم ایک ایک پیسے کا حساب کتاب کرتے ہیں کہ کہاں کہاں خرچ ہوا' اسی طرح ہم ۲۴ گھنٹے' ایک ہفتہ' دو ہفتے باقاعدہ ریکارڈ لکھ کر رکھ لیں کہ ہمارا وقت ان کاموں میں صرف ہوا۔ اس طرح ہمارے پاس ایک آڈٹ شیٹ بن جائے گی کہ ہمارا وقت ان ان کاموں کے اندر جاتا رہا۔

جب یہ پہلا کام ہو جائے تو پھر دوسرا کام ہم یہ کریں کہ جائزہ لے کر دیکھیں کہ اس میں سے کون سا وقت ضائع ہو رہا ہے' اور کون سا وقت ایسے کاموں میں لگ رہا ہے جو کوئی نتیجہ نہیں دے رہے' لیکن اپنا وقت لے رہے ہیں۔ ہم ان میں سے کس کس کو کاٹ سکتے ہیں اور کس طرح اس وقت کو بچا سکتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھیں کہ اس ساری مشق کے بعد بھی وقت ضائع ضرور ہوگا اس لیے کہ کچھ انسان کی فطرت اور افتاد ہی ایسی ہے کہ انسان کا وقت اس کے اپنے پورے قابو میں نہیں ہوتا۔ جن کے اوپر ذمہ داری ہوتی ہے' ان کے قابو میں تو ان کا اپنا پورا وقت ہو ہی نہیں سکتا۔ بہت سارے لوگ ان کا وقت لیتے ہیں' آتے ہیں' بیٹھتے ہیں' باتیں کرتے ہیں۔ ہمارا کام انسانوں کے ساتھ ہے اور انسانوں کے بارے میں کسی نے کہا ہے کہ سب سے زیادہ وقت خرچ کرنے والے اور ضائع کرنے والے انسان ہی ہوتے ہیں۔ بہرحال وقت صَرف بھی ہوگا اور ضائع بھی ہوگا لیکن ہمارا کام ہر جگہ یہ ہے کہ ہم بہتر سے بہتر کام کریں۔ یہ نہیں ہے کہ ہم بالکل

آئیڈیل ہو جائیں اور ہمارا ہر ہر منٹ بالکل صحیح صرف ہونے لگے۔

اس جائزے کے بعد ہمیں کچھ اقدامات کرنے چاہییں تاکہ ہم اپنے وقت کو کچھ بہتر انداز میں صرف کرنے کی پوزیشن میں ہوں۔ یہ میں آپ کو پہلے بتا دوں کہ اس مشق کے بعد جب ایک دفعہ آپ وقت کو صحیح استعمال کرنے لگ بھی جائیں گے' تو چھ مہینے بعد اگر آپ پھر جائزہ لیں گے تو پھر آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ نہیں پھر فضول خرچی شروع ہو گئی ہے اور پھر وقت غلط راہوں میں ضائع ہونے لگا ہے۔ یہ تو ایک مسلسل کام ہوگا جو آپ کو کرتے رہنا ہوگا۔

اہم اور غیر اہم کاموں کا جائزہ: ہم اپنے وقت کو غیر ضروری کاموں سے کیسے بچائیں اور یہ پتا چلائیں کہ اس میں سے ہم کتنا وقت بچا سکتے ہیں اور کتنا وقت ہم کو صحیح معنوں میں ملتا ہے؟ اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ جو بھی کام کر رہے ہوں اس کے بارے میں اپنے آپ سے یہ سوال کریں--- اور سوال کرنے سے بڑی راہیں کھلتی ہیں--- اگر میں یہ نہ کروں تو کیا فرق پڑے گا اور کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ آپ کو یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوگا کہ بہت سارے کام ایسے ہیں کہ اگر آپ نہ بھی کریں تو کوئی قیامت نہیں ٹوٹے گی' نہ تحریک پر' نہ تنظیم پر' نہ آپ کے اوپر اور وہ کام جیسا ہے ویسے کا ویسا ہی چلتا رہے گا۔ یہ ایک بہت معمولی سی بات ہے مگر مجھے اس کا تجربہ اس وقت ہوا جب میں اپنے دل کے پہلے آپریشن کے بعد دو مہینے ہسپتال میں رہا۔ میں نے ایک دن بھی اخبار نہیں دیکھا' دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ جب میں دو مہینے بعد واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ دنیا کے اندر کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی' اور میرے اخبار کے نہ دیکھنے سے کوئی قیامت نہیں ٹوٹی۔ میں نے ایک دو دن میں جو بھی واقعات ہوئے تھے ان کی معلومات حاصل کر لیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اخبار نہ پڑھیں' ضرور پڑھیں لیکن ضروری نہیں کہ ایک ڈیڑھ گھنٹہ اخبار پڑھنے میں لگے۔ یہ میں نے ایک مثال دی ہے۔ آپ خود صرف یہ دیکھ لیں کہ کون سا کام میں ایسا کر رہا ہوں جس

کے نہ کرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا' اور آپ اپنے کام جتنا کم کر دیں گے اتنا ہی آپ کو اس کا فائدہ ہوگا۔

کام تفویض کرنا: دوسرا سوال آپ یہ کریں کہ وہ کون سا کام ہے جو کوئی دوسرا میری طرح اتنا ہی اچھا کرے گا جتنا کہ میں کرتا ہوں۔ ممکن ہے مجھ سے کچھ کم تر درجے کا کرے لیکن کام ہو جائے گا۔ کوئی دوسرا اگر کرنے والا موجود ہے تو میں اس کام کو خود کیوں کروں۔ اس سے بھی خرابی پیدا ہوتی ہے کہ ہم اعلیٰ معیار کا اور اعلیٰ درجے کا کام چاہتے ہیں اور جب دوسرا نہیں کر سکتا تو ہم خود کرتے ہیں' اور بہت سے لوگ جو کر سکتے ہیں وہ بے کار بیٹھے رہتے ہیں۔ Management Science میں اسے delegation (کام تفویض کرنا) کہا جاتا ہے کہ اچھا آدمی یا اچھا لیڈر وہ ہے جو اپنا کام دوسروں کو تفویض کر سکتا ہو۔ لیکن تفویض کرنے میں رواداری' وسعت قلب' اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ممکن ہے دوسرا آدمی وہ کام اتنی اچھی طرح نہ کرے جتنا آپ چاہتے ہیں' لیکن جو کام ۹۰ فی صد اچھا ہو رہا ہے اگر وہ ۷۰ فی صد اچھا ہو جائے تو پھر میں شاید یہ کہوں گا کہ ۲۰ فی صد اچھا نہ ہونے سے اتنا عظیم الشان نقصان نہیں ہوگا جتنا یہ کہ آپ کا جو وقت بچ جائے گا اس کو آپ شاید زیادہ بہتر طریقے سے کسی اور کام میں لگا سکیں گے جس سے زیادہ فائدہ ہوگا۔

جو آدمی ذمہ دار ہو اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالے اور ان سے کام لے' اس میں کام ٹالنے کی بات نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اپنے وقت کو اُن کاموں سے بچائے جس کو کرنے کے لیے دوسروں کے پاس وقت ہے' اور ایسے کاموں میں لگائے جو واقعی نتیجہ خیز ہوں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہر میٹنگ میں ہر آدمی موجود ہو' اور اگر میں اس میٹنگ میں نہیں گیا تو اس کے بغیر میٹنگ ہی نہیں ہوگی۔ حالانکہ آپ میٹنگوں میں نہ بھی جائیں تو میٹنگیں اسی طرح ہو جائیں گی۔ ان کے فیصلے بھی ہو جائیں گے اور کوئی شاید بڑا فرق

نہیں پڑے گا' الا یہ کہ جانا شرعی طور پہ ضروری ہو' مثلاً شوریٰ میں یا دوسری چیزوں میں' لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہر میٹنگ میں ہر آدمی موجود ہو۔ اس طریقے سے آپ اپنے کام تفویض کر سکتے ہیں لیکن اس کے اندر بڑے صبر وتحمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ کام تھوڑا سا خراب بھی ہو تو ہم اس کو قبول کرلیں اور وہ وقت جو میں نے دو گھنٹے بیٹھ کر فائلیں ٹھیک کرنے میں لگایا' وہی وقت اگر میں انسانوں کے اوپر لگا دوں تو تحریک کی زیادہ پیش قدمی ہو جائے گی۔ میں دفتری کام کی اہمیت کم نہیں کر رہا۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ جو کام کوئی دوسرا آدمی کر سکتا ہو' اگرچہ کم درجے کا کرے' اور تھوڑا سا خراب کرے' کہ جس کام میں آپ اپنے کئی گھنٹے صرف کرتے ہیں' وہ دوسروں کو تفویض کرنا مفید ہوگا۔ اس لحاظ سے ایک ذمہ دار آدمی یہ سوچ سکتا ہے کہ میں اس کام کو دوسرے کے سپرد کر دوں۔

اجتماعات میں شرکت: تیسرا سوال آپ یہ کر سکتے ہیں کہ کیا میں دوسروں کا وقت ضائع کر رہا ہوں؟ میں خوامخواہ ہی لوگوں کو میٹنگ میں بلا کر بٹھاتا ہوں' حالانکہ ان کے بغیر بھی کام چل سکتا ہے' نہ کوئی مسئلہ ہے نہ کوئی گفتگو ہوگی' تعلقات بڑھانا ہوں تو الگ بات ہے۔ اگر آپ لوگوں کو تنظیمی کام کے لیے موقع فراہم کریں اور میٹنگوں میں ان کو خوامخواہ طلب نہ کریں تو آپ اپنا وقت بھی بچائیں گے اور دوسروں کا بھی۔ ہر میٹنگ کے بارے میں سوال کر کے جائزہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اگر اس میٹنگ میں فلاں آدمی نہ آئے تو آپ کو کیا کمی یا نقصان ہوگا۔ نہ آئے گا تو شاید وہ کوئی دوسرا کام کر سکے جو میٹنگ میں آنے کی وجہ سے وہ نہیں کر سکتا۔

بروقت فیصلہ: چوتھی چیز یہ ہے کہ ایک ہی فرد کا کوئی مسئلہ بار بار سامنے آ جاتا ہے۔ جب گفتگو ہوتی ہے اس کے ایک گھنٹے بعد پھر وہ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر اُسی قسم کا ایک اور مسئلہ سامنے جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تھوڑی سی پیش بینی کی کمی ہے۔ لیڈر کو' ذمہ دار فرد کو کچھ چیزیں پہلے سے دیکھنا چاہییں۔ بعض صورتوں میں اگر انتظام

پہلے سے کر لیا جائے تو اس کے بعد کا وقت بچ سکتا ہے۔ communication میں' اور فیصلے پہنچانے میں اور بہت ساری چیزوں میں اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ ایک فیصلہ ہوا لیکن اس کا اہتمام نہیں کیا گیا کہ یہ کون کس کو پہنچائے گا؟ اور ذمہ دار فرد دفتر سے اٹھ کر چلا گیا۔ اگلے دن کئی گھنٹے وضاحتوں' شکایتوں اور ذمہ داری کے تعین کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اگر پہلے سے پیش بندی کر لی جائے' ذمہ داری کا تعین کر لیا جائے اور فیصلوں کے موثر ابلاغ کا اہتمام کر لیا جائے تو بہت سا وقت بچایا جا سکتا ہے۔

اجتماعات کی تعداد میں کمی: پانچویں چیز یہ ہے کہ دنیا بھر کی تنظیموں میں سب سے زیادہ وقت کھانے والی چیز' اجتماعات اور میٹنگیں ہیں۔ اجتماعات اور میٹنگیں لازمی ہیں' ناگزیر ہیں۔ ان کے بغیر کوئی تنظیم نہیں چل سکتی۔ لوگ مل کر کام کر رہے ہیں' ضروری ہے کہ مل کر بیٹھیں' سوچیں' ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کریں' اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کون سے اجتماعات اہم ہیں اور ہونے چاہییں اور کون سے غیر اہم ہیں اور نہیں ہونے چاہییں۔ اجتماعات کے نظام پر بھی غور کرنا چاہیے۔ اس قسم کی چیزوں میں اصول یہ نہیں ہونا چاہیے کہ چونکہ میٹنگ ہو رہی ہے اور جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ یہ غیر مفید ہے' اس وقت تک یہ میٹنگ جاری رہے گی۔ آپ دیکھنے اور سوچنے کا زاویہ بدل دیں۔ جب تک یہ میٹنگ ثابت نہ کرے کہ اس کا ہونا مفید ہے تو اس کو ختم کر دیا جائے۔ اب ہر میٹنگ کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کی ضرورت اور افادیت کو ثابت کرے۔ میٹنگ تو بے چاری بے جان چیز ہے۔ میٹنگ کرنے والے ثابت کریں کہ ہاں' اس میٹنگ کی ضرورت ہے' اس کا فائدہ ہے۔ اس سے تحریک کو یہ حاصل ہو رہا ہے' لہٰذا ایسی میٹنگ ضرور ہونی چاہیے۔ جو میٹنگ ویسے ہی ہو رہی ہو' ہوتی چلی آ رہی ہو' اسے نہیں ہونا چاہیے۔

جب تحریک میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو اجتماعات کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔

ابتدا میں ہفتے میں دو اجتماعات ہوتے تھے: ایک اجتماع کارکنان ہوتا تھا' اور ایک اجتماع عام۔ پھر دو سے بڑھ کر تین ہوئے۔ پھر چار ہوئے' پھر پانچ ہوئے۔ اس کے بعد معلوم یہ ہوا کہ مہینے میں ۳۰ دن میں سے ۱۶ دن تو اجتماعات کے اندر چلے جاتے ہیں۔ٹھیک ہے' اب تنظیم بڑھ گئی ہے' اجتماعات یقیناً زیادہ ہوں گے۔ بہرحال یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم کچھ اجتماعات کم کر سکتے ہیں' کوئی ایسا نظام بنا سکتے ہیں جس سے میٹنگیں کم ہوں' لوگوں کا وقت بچے' وہ اپنے اداروں میں یا محلوں میں لوگوں سے مل سکیں' ہوٹلوں میں جا سکیں' بیٹھ سکیں' محلوں میں گپ لگا سکیں' عام آدمیوں میں اپنا اچھا تاثر پیدا کریں اور تحریک کی دعوت کو عام کریں۔ یہ بات سوچنے کی ہے اور اس کے سوچنے سے ایسی راہیں نکل سکتی ہیں جس سے وقت بچے اور اجتماعات کم ہوں۔

یہ پانچ سوال کر کے آپ اس بات کی کوشش کر سکتے ہیں کہ اپنے وقت میں سے وہ کچھ کم کر دیں جن سے یہ ضائع ہو رہا ہو' یا غیر مفید استعمال ہو رہا ہو۔

وقت کے طویل دورانیے کا استعمال: ذمہ دار افراد کو جن کے ذمے منصوبہ بندی' لوگوں سے ربط اور ان کی تربیت کا کام ہو انھیں اس کے لیے وقت بڑے بڑے حصوں کے اندر ملے۔مثال کے طور پر آپ نے پانچ پانچ منٹ ۲۰ آدمیوں کو دیے۔ آپ کے ۱۰۰ منٹ لگ گئے۔ اس سے ۲۰ آدمی خوش تو ہو جائیں گے اور ان کو ہونا چاہیے کہ بھئی ہمارے ناظم نے ہماری طرف دیکھا' ہم سے بات کی اور کبھی یہ ضروری بھی ہوگا' لیکن بالعموم اس سے انسانوں کی تربیت یا ان کے جائزے کا کام نہیں ہوتا۔ اس کے بجائے اگر آپ آدھا آدھا گھنٹہ تین آدمیوں کو دیں تو اس سے آپ کو تحریک کے لحاظ سے زیادہ فائدہ ہوگا۔ ان لوگوں کو آپ پہچانیں گے' ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگا' ان کو استعمال کرنے کا آپ کے پاس ایک منصوبہ بنے گا۔ وہ بھی آپ سے کچھ حاصل کریں گے' آپ بھی ان سے کچھ حاصل کریں گے اور بہتر منصوبہ بندی سے کام کر سکیں گے۔

میں نے اکثر دیکھا ہے اور آپ کا بھی تجربہ ہوگا کہ ایک چیز توجہ کے لیے آئی' پانچ منٹ پورے نہیں ہوئے' تو دوسری بات آگئی' پانچ منٹ اس کی طرف توجہ کی' پھر تیسری چیز آگئی۔ دفتر میں بیٹھے ہوئے امرا اور ناظمین کو آپ دیکھ لیں' یا کہیں اور آپ دیکھ لیں' یہ کیفیت بہت عام ہوتی ہے۔ ایسا ہوگا' میں یہ نہیں کہہ رہا کہ بالکل نہیں ہوگا لیکن جب آپ دیکھیں کہ سارے کام اور وقت کا آڈٹ کر لیا' اور پورے وقت میں سے دو گھنٹے ایسے ملتے ہیں جو میرے اپنے disposal پر ہیں تو یہ دو گھنٹے آپ کو مسلسل ملنے چاہییں' خواہ وہ صبح سات سے نو مل جائیں یا شام کو تین سے پانچ۔ لیکن آپ کے پاس ایک وقت ہونا چاہیے کہ آپ اس کو لگ کے کسی کام کے اندر لگا دیں۔

اسلامک فاؤنڈیشن' برطانیہ میں جہاں مجھے کچھ کام کا موقع ملا یہی شکایت تھی کہ صبح سے شام تک ٹیلی فون آتے ہیں' لکھنے والوں کو لکھنے کا وقت نہیں ملتا۔ ملنے والے ہر وقت چلے آ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ صبح ۹ سے ۱۲ بجے تک کوئی ٹیلی فون کسی کو نہیں دیا جائے گا' کوئی ملنے والا نہیں آئے گا' تین گھنٹے لوگ بیٹھ کر اپنا کام کریں گے۔ اس طرح دو ماہ میں بڑا کام ہوا۔ پھر یہ چیز ختم ہوگئی۔ پھر ٹیلی فون آنے لگے۔ پھر ہدایت دی گئی' پھر یہ چیز شروع ہوگئی اور مزید دو تین ماہ کام اچھا ہوا۔ پھر معلوم ہوا کہ ٹیلی فون ڈائرکٹ ہوگیا۔ کمرے میں ٹیلی فون چلا آ رہا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز ایک دفعہ کرنے سے نہیں ہوگی۔ لیکن اگر ہم کوشش کریں تو وقت کے بڑے بڑے حصے کاموں کے لیے مل جائیں گے۔ لکھنے والے کو ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے کہ تین چار گھنٹے اس کو یکسوئی کے ساتھ ملیں تو وہ کچھ لکھ سکتا ہے۔ پانچ منٹ لکھا اور پانچ منٹ ٹیلی فون پر بات کی' پانچ منٹ کوئی ملنے والا آ گیا تو لکھنے کا کام نہیں ہو سکتا۔ آپ کچھ سوچ کر اپنے شہر یا ادارے کے لیے منصوبہ بنا رہے ہیں تو آپ کو دو ایک گھنٹے چاہییں جس میں آپ بیٹھ کر یکسوئی کے ساتھ سوچیں کہ دعوت' تربیت' تنظیم اور مسائل ان سب کو مجھے اس ایک مہینے میں کیسے لے کر چلنا ہے۔ اس کے لیے آپ کو جو وقت چاہیے وہ بٹا ہوا نہ ہو بلکہ یکمشت

آپ کے ہاتھ میں ہو۔

اعلیٰ مقاصد پر نظر

اپنے آپ کو موثر اور کارگر بنانے کے لیے اپنے سے یہ سوال کرنا چاہیے کہ میں اپنے آپ کو اور اپنی صلاحیتوں کو کس طرح صرف کروں کہ جو ذمہ داری میرے اوپر ہے اس کو اطمینان بخش طریقے سے ادا کروں' اور تحریک اور تنظیم کے مجموعی مقاصد کے لیے مفید ہو سکوں۔ مجموعی مقاصد کی بات بڑی اہم ہے۔ کارکن سے لے کر اعلیٰ سطح تک' یہ مجموعی مقاصد ہمیشہ سامنے رہنا چاہئیں۔ چھوٹا کام ہو یا بڑا کام' ہر کام میں اسے سامنے رکھنا چاہیے۔ اسی طرح ہر ذمہ داری رکھنے والے آدمی کو اپنے کام کے چھوٹے چھوٹے حصے بنا کر اور ساری تنظیم اور سارے کام سے بے نیاز ہو کر نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سوچنا کہ میرے پاس تو بس یہ ادارہ ہے' میں نے اس کا کام کر لیا' یا میرے پاس تو بس نشرواشاعت ہے' میں نے اس کام کو کر لیا' مجھے اس سے کیا مطلب کہ ساری تنظیم کہاں جا رہی ہے۔ یہ بات درست نہیں ہے بلکہ یہ سوچنا چاہیے کہ میرا جو کام ہے--- نشرواشاعت کا' یا مجھے کتابیں چھاپنا ہے' یا پوسٹر چھاپنا ہے' یا ایک ادارے کا نظام چلانا ہے' پورا شہر اور پوری جماعت اور پورا پاکستان اس کے لحاظ سے کس سانچے میں فٹ ہوگا اور میرے کام سے انھیں کیسے تقویت پہنچے گی' میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں' میں کیا دے سکتا ہوں کہ جس سے یہ کام آگے بڑھے اور بہتر ہو--- جتنا آپ اس بات کو سوچیں گے کہ مجموعی طور پر کام کیسے بہتر ہو' اس کے کئی فوائد ہوں گے۔ آپ کا معیار اور سوچ بلند ہو جائے گی۔

ممکن ہے آپ کا کام تو بہت تھوڑا ہو' ایک کتاب چھاپنا ہو' یا ادارے کا نظم چلانا ہو' یا شہر کو چلانا ہو' آپ کے قدم تو زمین پر ہی رہیں گے لیکن آپ کی نگاہ آسمان پر رہے گی۔ اس طریقے سے آپ کے کام کے اندر وسعت اور بلندی پیدا ہو گی۔ آپ بڑی

بڑی چیزوں کو سوچیں گے۔ پھر یہ نہیں ہوگا کہ اگر آپ اسلامی جمعیت طلبہ کے ادارہ مطبوعاتِ طلبہ کے ناظم ہیں تو جو کتاب دی گئی' وہ چھاپ دی' بلکہ آپ منصوبہ بندی کریں گے کہ جمعیت کے مجموعی مقاصد کیا ہیں اور ان مقاصد کو سامنے رکھ کر اب مجھے اس سال کے اندر کون سی کتابیں چھاپنی چاہئیں۔ اسی طریقے سے ہر کام کو' مثلاً تقریر کرنی ہو' جب بھی آپ کو سوچنا چاہیے کہ تقریر میں مجھے کیا پیغام پہنچانا ہے' کیا بات کہنی ہے کہ جس سے یہ مجموعی مقصد آگے بڑھے۔ بات کو سمجھ لیجیے کہ ہر تقریر اسی طرح کی ہوگی' ہر کتاب اسی طرح کی چھپے گی لیکن سوچ اور فکر کے پیمانے اور زاویے بدلنے سے کام کے معیار اور کارکردگی کے اندر خاصا فرق پڑ سکتا ہے۔ اس میں قناعت نہیں ہونی چاہیے۔ دین کے معاملے میں قناعت بڑی نقصان دہ ہے۔ اچھے سے اچھے اور خوب سے خوب تر کی تلاش ضروری ہے۔

ترجیحات کا تعین

پانچویں چیز ترجیحات کا معاملہ ہے۔ پورا وقت صحیح استعمال ہونا ممکن نہیں ہے۔ وقت ضائع ضرور ہوگا۔ جب بھی آپ وقت کا آڈٹ کریں گے' بیلنس شیٹ بنائیں گے تو آپ کو خسارے کا بجٹ ملے گا' کام زیادہ ہیں' وقت کم ہے۔ تحریکوں کے لیے بھی یہی صورت ہے' اجتماعیت کے لیے بھی یہی صورت ہے' اور فرد کے لیے بھی یہی صورت ہے۔ جتنا کام سامنے ہے' کرنا ہے' اس کے لحاظ سے وقت کم ہے۔ گویا کہ خسارے کا بجٹ ہمیشہ سامنے موجود ہے۔ اس لیے ضروری یہ ہے کہ آپ ترجیحات قائم کریں۔

ترجیحات قائم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ آپ کاموں کی ایک فہرست بنائیں کہ یہ کام پہلے کرنا ہے' یہ بعد میں کرنا ہے اور یہ اس کے بعد کرنا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ جو کام مشکل ہے اور جس کے بغیر صحیح معنوں میں آپ کا وقت صحیح صرف نہیں ہوگا وہ یہ ہے کہ آپ کے اندر اتنی ہمت اور جرأت ہو کہ آپ ''نہیں'' بھی کہہ

سکیں۔ کہیں مروت میں' کہیں اس لیے کہ کام تو بہرحال ہونا ہی ہے' چلو لگے ہاتھ اسے بھی کر ہی لوں' آدمی کے اندر ''نہیں'' کہنے کی جرأت بہت کم ہوتی ہے۔ میں نے تحریک کے بڑے اچھے اچھے باصلاحیت افراد کو ایسے کاموں میں اپنے اوقات صرف کرتے دیکھا ہے جن کا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ کسی سے بھی ''نہیں'' نہیں کہہ سکتے۔ میرا مطلب انسانوں کو ناراض کرنے سے نہیں ہے' انسانوں کو تو خوش رکھنا ہی چاہیے لیکن بہرحال گفتگو سے' خوب صورتی سے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ جو کام نہیں کرنے کا ہے اس پر نہیں کہہ دینا چاہیے۔

میں ترجیحات کے تعین کے ضمن میں ایک ذاتی مثال پیش کرتا ہوں۔ ایک موقع پر آزاد کشمیر کے قیم جماعت اسلامی میرے پاس آئے اور کہا کہ میں دو دن مزید رُک جاؤں اور ان کی تربیت گاہ میں شامل ہو کر جاؤں۔ میں نے کہا: نہیں' یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں اتنے ہی کام کے لیے آیا تھا۔ اب مجھے اسلامک فاؤنڈیشن واپس پہنچنا ہے' وہاں میرے کاموں کی پوری فہرست تیار ہے جو مجھے کرنا ہیں۔ میرے دل کے اندر بھی کشش تھی۔ انھوں نے کہا کہ پورے آزاد کشمیر کے ارکان آئیں گے' کارکن آئیں گے' سب منتظر ہیں' آپ چلیے۔ میں نے کہا نہیں' اب اس وقت تو میں نہیں جاؤں گا۔

ہمیں ایسی فضا اور ماحول پیدا کرنا چاہیے جس میں لوگ خاموشی کے ساتھ سن سکیں' برداشت کر سکیں۔ ممکن ہے میری پوزیشن ایسی ہے کہ وہ خاموشی سے سن کر چلے گئے۔ آپ کہیں گے کہ ہم میں سے کوئی کہے تو آدمی برا سمجھے گا' ناراض ہو کے جائے گا۔ یہ سب انسانی situations ہیں جو پیدا ہو سکتی ہیں۔ مجھے ان کا احساس ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ تھوڑا سا عزم اور ہمت پیدا کریں تو بہت سارے کام ہیں جن سے انسان انکار اور معذرت کر سکتا ہے۔

میں نو سال سے انگلینڈ میں ہوں۔ میرے پاس دعوت ناموں کی بھرمار رہتی ہے' نائیجیریا سے' جنوبی افریقہ سے' سعودی عرب سے' مڈل ایسٹ سے' امریکہ سے۔ اس

پورے نو سال میں' میں صرف دو دفعہ امریکہ گیا ہوں' ایک دفعہ جنوبی افریقہ گیا ہوں۔ نائیجریا والے چھ سال سے بلا رہے ہیں' میں نہیں گیا۔ جنوبی افریقہ والوں نے ایک سال بعد پھر کہا کہ آپ ہر سال آ کر ہمارے پاس چند مہینے گزاریں۔ میں نے کہا نہیں' میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ دوسرے کام کرنے کے ہیں اور اس طریقے سے میں نے یہ کوشش کی کہ میں تھوڑا بہت اپنا وقت بچا کر لکھنے کے جس کام کے لیے وہاں گیا تھا وہ کرسکوں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ میں کچھ نہ کچھ چیزیں تیار کر سکا ہوں۔ اگر میں دوروں پر نکل جاتا تو فاؤنڈیشن کا ڈائریکٹر بھی رہتا اور اس کی فہرست بھی چھپتی رہتی۔ لیکن جو کام میرے پیش نظر تھا وہ شاید نہ ہوتا۔

بحالی صحت کے بعد جب سے میں کہیں آنے جانے کے قابل ہوا ہوں' ہر جگہ سے دعوت نامہ آ رہا ہے' فرینکفرٹ سے' مانچسٹر سے گلاسکو سے' کہ آپ ایک دفعہ یہاں آ کر مل جایئے۔ میں نے کہا کہ اگر میں ایک جگہ کا دعوت نامہ قبول کروں گا' تو مجھے ۲۰ جگہ جانا پڑے گا۔ ۲۰ جگہ جانے کا مطلب ہے کم سے کم ۴۰ دن۔ اتنا وقت میرے پاس نہیں ہے۔ ان شاء اللہ کسی ایک جگہ میں آپ سب سے ملاقات کروں گا۔ اس طریقے سے آدمی اپنے آپ پر تھوڑا سا ضبط کرے لیکن کسی کو ناراض نہ کرے۔ میں نے کسی کو خدا کے فضل سے ناخوش نہیں کیا' حکمت کے ساتھ اچھی طرح ٹال دیا۔

میں روحانی تزکیے کی ایک مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ یہ مثال ہر چیز کے اوپر عائد ہوتی ہے۔ یہ بڑا دل چسپ واقعہ ہے۔ یہ واقعہ میں نے بہت شروع میں پڑھا تھا اور ہمیشہ میرے سامنے رہتا ہے۔ اس سے میری امید بھی بندھتی ہے' ہمت بھی بڑھتی ہے اور جب میرا اپنا گراف نیچے جاتا ہے تو مجھے اپنے کو اوپر اٹھانے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ واقعہ حضرت حنظلہؓ کا ہے۔

ایک دفعہ گھر میں بیٹھے ہوئے انھوں نے یہ سوچا کہ جب ہم حضورؐ کی صحبت میں ہوتے ہیں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جیسے جنت کو بھی دیکھ رہے ہیں اور دوزخ کو بھی دیکھ

رہے ہیں۔ جب گھر آتے ہیں' بال بچوں میں بیٹھتے ہیں' کھانے پینے کی بات ہوتی ہے' سب بھول جاتے ہیں۔ اس زمانے میں بھی یہ ساری چیزیں ہوتی تھیں' یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں یہ سب مسائل ہمارے ساتھ ہی مخصوص ہیں۔ آدمی غور سے صحابہ کے واقعات پڑھے تو معلوم ہوگا کہ وہ بھی انسان تھے اور انسانی مسائل کا انھیں بھی سامنا تھا۔ آج کل جو سارے مسائل آپ پیش کرتے ہیں وہ سارے مسائل کسی نہ کسی صورت میں انھیں بھی پیش آئے ہیں۔ حضرت حنظلہؓ کو بھی ایک ایسا ہی مسئلہ درپیش تھا۔ چنانچہ انھوں نے سوچا یہ تو خالص منافقت ہے۔ وہ بے چین ہو کر اٹھے کہ حضورؐ کی خدمت میں جاتا ہوں اور عرض کرتا ہوں کہ میں منافق ہوں۔ راستے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ ملے۔ انھوں نے پوچھا: حنظلہؓ کہاں چلے؟ انھوں نے کہا میں تو منافق ہو گیا ہوں۔ حضرت ابوبکرؓ بڑے پریشان ہوئے کہ حنظلہؓ جیسے صحابی کو یہ کیا ہو گیا۔ انھوں نے اپنی کیفیت بیان کی۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ پھر تو میں بھی منافق ہوں' اس لیے کہ میرے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ جب حضورؐ کی صحبت میں ہوتے ہیں تو یہ کیفیت ہوتی ہے' گھر آتے ہیں تو کیفیت بدل جاتی ہے' تو پھر ہم دونوں ہی منافق ہیں۔ چنانچہ دونوں مل کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضورؐ نے کہا: کیا بات ہے' کیسے آئے؟ انھوں نے کہا کہ حنظلہؓ تو منافق ہو گیا' برباد اور تباہ ہو گیا۔ آپ نے کہا: کیوں کیا بات ہوئی؟

حضرت حنظلہؓ نے اپنی کیفیت بیان کی تو آپؐ مسکرائے۔ آپ نے فرمایا: ہاں' کبھی ایسا ہوتا ہے' اور تمھاری وہی کیفیت رہتی تو پھر فرشتے گلیوں میں اتر کر تم سے مصافحہ کرتے۔ مطلب یہ کہ تم فرشتے ہوتے' انسان نہ ہوتے۔ انسان تو ہے ہی وہ جس کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ اگر تھوڑی سی کوشش کرے تو نشیب کے بعد جب وہ اوپر اٹھے گا' تو تھوڑا سا مزید اوپر چلا جائے گا۔ یہی دراصل ترقی ہوتی ہے۔ یہ نہیں کہ جب نشیب میں اترے تو پھر اسی مقام پر آگئے جہاں سے چلے تھے۔

ہر دفعہ نیچے آنے کے بعد جب آدمی جستجو کرتا ہے تو پہلے مقام سے وہ تھوڑا سا

اوپر اٹھ جاتا ہے۔ پھر گرے گا' اور پھر اٹھے گا تو پھر تھوڑا سا اوپر چلا جائے گا۔ روحانی اور اخلاقی کاموں میں اور اپنی صلاحیتوں کے نشوونما اور کارکردگی کی تربیت کے اندر یہی کشمکش جاری رہتی ہے۔ لہٰذا ذمہ دار افراد اگر اس پہلو کو نگاہ میں رکھیں تو یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ان ساری کوششوں کے بعد بھی وقت نہ ہونے کی شکایت رہے گی' وقت ضائع بھی ہوگا اور نشیب و فراز بھی آئیں گے لیکن مایوسی کا شکار نہیں ہوں گے' اور اس سب کے باوجود وہ پھر بھی اس کوشش میں لگے رہیں گے کہ وقت کو کیسے بہتر استعمال کریں۔

میں یہ مثالیں اس لیے دے رہا ہوں کہ جو چیز ہم سمجھتے ہیں کہ ضروری کرنا ہے' دورہ تو کرنا ہی ہے' اجتماع تو کرنا ہی ہے' سوچنا تو یہ ہے کہ اس میں سے اگر کوئی کام ہماری ترجیحات میں نہیں آتا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہیں' یہ کام ابھی نہیں کرنا ہے۔ اس کے بغیر' نہیں کہے بغیر' ترجیحات جو کچھ بھی آپ قائم کریں گے ان کا مفید اور کارگر ہونا بڑا مشکل ہوگا۔ یہ بات ضروری ہے کہ آپ کے وقت پر آپ کا کنٹرول ہو۔ پورا کنٹرول ممکن نہیں ہے' اس لیے کہ ہمارا کام انسانوں سے ہے۔ انسان کسی وقت بھی ٹپک سکتا ہے۔ ابھی ہم کام کر رہے ہیں' کارکن دفتر میں گھس آیا۔ کارکن کو تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ بھئی باہر نکل جاؤ۔

حضورؐ کے زمانے میں بھی یہ ہوتا تھا کہ لوگ آ کر پکارتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم باہر آؤ بات کرو۔ لوگ آتے تھے اور بیٹھے رہتے تھے۔ باتیں کرتے کرتے رات دیر ہو جاتی تھی' تو قرآن کو کہنا پڑا کہ کھانا کھا کے ذرا جلدی اٹھ جایا کرو' زیادہ دیر تک مت بیٹھو۔ تربیت اُس زمانے میں بھی ہوتی تھی' وہی اب بھی ہوتی ہے۔ لوگ توقع رکھتے ہیں کہ ہم جب بھی آ جائیں ہم کو وقت دیا جائے۔ بہرحال کارکن کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہمارا اصل سرمایہ ہیں۔ لیکن یہ کوشش بھی کرنا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ وقت ہمارے کنٹرول میں ہو' اور دباؤ کے تحت خرچ نہ ہو۔ جب حالات اور واقعات کے دباؤ کے تحت ترجیحات قائم ہونے لگتی ہیں' اس کے تحت ہم کام کرتے رہتے ہیں تو پھر اس سے یہ

نتیجہ نکلتا ہے کہ جو کام کل ہونا ہے وہ ملتوی ہو سکتا ہے' ہو جاتا ہے۔ وہ بے چارہ تو کبھی ہوا ہی نہیں اس لیے کہ کل آئی ہی نہیں۔ پھر جو کام لیڈر کو کل کے لیے آج کرنا ہے' وہ کام سب سے پہلے ملتوی ہو جائے گا۔ اس کو وقت ہی نہیں ملے گا کہ کل کا سوچے۔ اس لیے کہ وہ تو ہمیشہ آج کا کام کرے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کی ساری توجہ پھر زیادہ تر اندرونی مسائل پر رہے گی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب ہم دباؤ کے تحت کام کرتے ہیں تو ہمارا اپنے کام پر کوئی کنٹرول نہیں ہوتا کہ ہم اپنے فیصلے پر کام کریں۔ اب یہ ہوتا ہے کہ دفاتر میں جو لوگ بیٹھتے ہیں' ان کے اُوپر باہر کے لوگوں کا دباؤ اور اندر کے حالات کا دباؤ ہوتا ہے۔ اس دباؤ کے تحت وہ کام کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ذمہ دار افراد کے وقت کا زیادہ تر حصہ اندر ہی کے لوگ لے جاتے ہیں اور باہر کے لوگوں کو جہاں تحریک کا اصل مقصد ہے' بہت کم توجہ ملتی ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ آپ کا اپنے وقت کے اوپر اتنا کنٹرول ممکن ہو' کہ اس میں سے کچھ حصہ ایسا نکال سکیں جو آپ کے disposal پہ ہو' اسے آپ دوسروں کے دباؤ کے تحت صرف نہ کریں بلکہ اپنی منصوبہ بندی کے لیے' اور اپنے کام کے بارے میں سوچنے کے لیے استعمال کریں۔ کل کیا ہو' یہ آپ آج سوچ سکیں۔ کل کیا ہوگا' اس کو سوچنے کے لیے آج آپ کے پاس وقت ہو۔ اگر آپ ترجیحات قائم کر سکیں تو ان شاء اللہ آپ کی کارکردگی اور تاثیر میں اضافہ ہوگا۔

مجموعی کام پر نظر

چھٹی بات مجھے ذمہ داری کے دائرے کے اندر کہنا چاہیے تھی لیکن میں نے اس کو الگ سے اس لیے رکھا ہے کہ اس کی اہمیت آپ کے سامنے واضح ہو۔ جب آپ اپنے کام کے دائرے کا تعین کریں' تو ایک منظر' جسے کام کا whole view (کلی منظر نامہ) کہتے ہیں' اسے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

آپ کے پاس کسی ادارے کی' شہر کی' یا حلقے کی یا کسی شعبے کی ذمہ داری آئی تو آپ کو اپنے کام کا پورا اندازہ کرنا چاہیے۔ حلقے کا ناظم صرف یہ نہ سوچے کہ بس یہ پانچ کارکنوں کا ایک اجتماع مجھے ہر ہفتے کرنا ہے' رپورٹ لکھنا ہے' رپورٹ جا کے اپنے ناظم کو یا امیر کو دے دینا ہے اور میرا کام ختم ہو گیا۔ اس کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس کے علاقے میں ۴۰ ہزار آدمی بستے ہیں' یہ میرے کام کا دائرہ ہے۔ ان ۴۰ ہزار آدمیوں تک دعوت کو پہنچانا' ان میں سے جو ساتھ آئیں' ان کو ساتھ لے کر چلنا' جو ساتھ نہ آئیں' ان کو رام کرنا' جو دشمن ہیں ان تک پہنچنا' ان کو سمجھانا' اور اگر رام نہ ہوں تو پھر ان کو دبانے کی ترکیبیں سوچنا' یہ سارا کام ہے جو آپ کے پیش نظر رہنا چاہیے۔ اگر آپ نے اپنے کام کو پانچ چھ کارکنوں تک محدود رکھا تو ہمیشہ وہیں تک رہے گا جیسا کہ اکثر جگہ ہو رہا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کے امرا یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کے شہروں کی آبادی کتنی ہے؟ ان میں سے بعض یہ بھی نہیں جانتے کہ ان میں کتنے مرد عورت بس رہے ہیں' کتنے لوگ ہیں' کتنے طبقات ہیں' ان میں کتنے مزدور ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بنیادی معلومات اور حقائق بھی ان کے پاس نہیں ہوتے۔ ابھی تو آپ تحریک کے ذمہ دار ہیں' کل آپ ممکن ہے پورے شہر کے حکمران بن جائیں تو آپ کو سب سے معاملہ کرنا پڑے گا۔ لہٰذا تحریک کے کام کا انداز یہ ہونا چاہیے' مثلاً آپ کے پاس کالج کی ذمہ داری ہے تو آپ کو یہ معلوم ہو کہ اتنے طلبہ اور اتنی طالبات ہیں' لیکن ہزاروں کی تعداد میں سے ابھی تو ہماری دعوت صرف سو تک ہی پہنچی ہے۔ اب ہماری منصوبہ بندی باقی ہزاروں تک پہنچنے کی ہونی چاہیے کہ اتنی مدت میں ہم ان تک پہنچیں گے' اور یہ طے کر کے ہم کو منصوبہ بنانا ہے کہ ہم کو اتنے کارکن اس میں سے ملنے ہیں۔ اس طریقے سے کلی منظرنامے کو لے کر کام کی ذمہ داری کو سمجھنا اور اُس کو چلانا ضروری ہے۔

اس سارے کام کے اندر' اپنی ذات کی تربیت ہو یا کارکردگی ہو' یا اپنے وقت کا استعمال ہو' نشیب و فراز لازماً آئیں گے' یعنی کبھی کام اچھا ہو گا اور کبھی خراب' کبھی گراف

اوپر جائے گا اور کبھی نیچے' کبھی وقت اچھی طرح صرف ہوگا اور کبھی خراب صرف ہوگا۔ میں بار بار اسی لیے اس ایک بات کو دہرا رہا ہوں کہ آپ کبھی یہ سن کے اور کل سے جا کر مایوس ہونا شروع نہ ہو جائیں۔ یہ تدبیریں ہیں جن کو آپ اختیار کریں گے تو کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ ممکن ہے فوری طور پر نہ بھی ہو' لیکن یہ اگر آپ کے سامنے رہیں' آپ مسلسل کوشش کریں تو فائدے میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ البتہ یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہے کہ اپنی روحانی اور اخلاقی تربیت ہو یا اپنی صلاحیتوں کا ارتقا' پوری جدوجہد ہو یا اپنے کام کی منصوبہ بندی' یا اپنی کارکردگی کو بہتر بنانا ہو' ان میں سے کوئی بھی چیز ہو' اس میں ہمیشہ نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔

دین کا فہم

آخری بات یہ ہے کہ ذمہ دار افراد کو قرآن اور حدیث کے ایسے رسائل اپنے پاس ضرور رکھنے چاہییں جن سے وہ دعوت اور تربیت کا کام کر سکیں۔ ان پر یہ ذمہ داری اپنی بھی ہے' اور دوسروں کی بھی ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ قرآن کو صحیح پڑھنا بھی آتا ہو' اور قرآن کی وہ آیات یاد بھی ہوں جو دعوت اور تربیت کے کام کے لیے مفید ہیں۔ محنت کر کے ایک فہرست بنائی جائے اور اُن آیات کو یاد کر لیا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے نہیں کہ ہم کو صرف اس لیے قرآن کو یاد کرنا ہے کہ اس سے کام نکلے گا۔ اس طرح تو اللہ تعالیٰ برکت نہیں دے گا۔ قرآن کا حفظ ویسے ہی بڑی نعمت ہے کہ آپ کے سینے میں قرآن محفوظ ہو۔ جس دل میں قرآن محفوظ ہوگا وہ ان شاء اللہ آگ میں نہیں جلے گا۔ یہ سمجھ کے آپ یاد کریں۔ البتہ دعوت کے لیے' تربیت کے لیے' ساتھیوں کو ساتھ چلانے کے لیے یہ بڑا ضروری ہے کہ قرآن کی آیات یاد ہوں۔

تحریک کے بہت سارے ذمہ دار افراد ایسے ملیں گے جو ایک آیت بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے' جو نماز میں امامت بھی نہیں کر سکتے' اور جن کے قرآن پڑھنے کے اندر غلطیاں

بھی بہت صاف ہوتی ہیں۔ جب ہمارا عربوں سے واسطہ پڑتا ہے تو ہم کو اپنے اوپر شرم آتی ہے۔ جو لوگ یہاں سے وہاں جاتے ہیں' جب وہ امامت کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور جب انھیں صحیح تجوید اور قرأت سے قرآن پڑھنا نہ آئے تو اور زیادہ شرم آتی ہے۔ عرب جب صاف پڑھتے ہیں تو بہت محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے جو بڑے بڑے لوگ آتے ہیں اُن میں سے بعض قرآن کی آیات پڑھنے میں تجوید کی اور قرأت کی بہت فاش غلطیاں کرتے ہیں۔ لہٰذا حفظ کے ساتھ ساتھ تجوید و قرأت کے ساتھ تلاوت آیات پر بھی خصوصی توجہ دینا چاہیے۔

ابھی سے آپ اس بات کی کوشش کریں کہ قرآن ہی بہرحال مدار ہو۔ کوئی چیز بھی قرآن کے سوا مسلمان کے دل کو متاثر کرنے والی نہیں ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ بڑے بڑے لٹریچر اور بڑی بڑی تقریروں کے مقابلے میں وہ دعوت جو قرآن و سنت اور حدیث پر مبنی ہو' وہ عام آدمی کے دل کے اندر اُتر جاتی ہے۔ اس کا بھی اہتمام کیجیے کہ ہر ایک کے پاس قرآن کا نسخہ ہو۔ اگر آپ موضوعات پر آیات تلاش کرنا چاہیں تو قرآن کا ایک انڈیکس ذمہ دار حضرات کے پاس ضرور ہونا چاہیے۔ ایک کتاب فواد الباقی کی مُعْجَمُ الْمُفَهْرَسْ ہے۔ اگر آپ کو کسی آیت کا ایک لفظ معلوم ہے تو اس کی مدد سے آپ کو اُس کا حوالہ مل جائے گا اور آپ قرآن سے اُس آیت کو تلاش کر سکتے ہیں۔ جہاد' شہادت حق' اقامت دین اور ایسے ہی دوسرے الفاظ سے مکمل آیات معلوم کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اتنی عربی آنا چاہیے کہ آپ اس معجم سے استفادہ کر سکیں۔ اس لیے کہ اس میں الفاظ کے ساتھ لفظ کا مادہ دیا ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک حدیث کی کتاب بھی سب کے پاس اپنی اپنی ہونا چاہیے۔ ان سارے مجموعوں کے مقابلے میں جو تحریک نے چھاپے ہیں میں اب بھی ریاض الصالحین کو ترجیح دیتا ہوں۔ ریاض الصالحین ایک ایسی کتاب ہے جس کی حدیثیں آپ یاد بھی کر سکتے ہیں' عربی نہ بھی یاد ہو' اُردو یاد کر لیں۔ اس میں توبہ پر' جہاد پر' دعوت پر اور مختلف موضوعات پر بہت ساری صحیح احادیث ہیں۔

لہٰذا حدیث کا ایک مجموعہ اور اگر آپ حوالہ تلاش کرنا چاہیں تو قرآن کا ایک انڈیکس ورنہ قرآن تو خود کافی ہے' ہر ایک کے پاس ہونا چاہیے۔ اس میں سے آیات کو حفظ کرنا اور ان کو دعوت کے کام کے لیے استعمال کرنا ضروری ہے۔

کچھ عرصہ قبل جب مجھے امریکہ میں ISNA☆ کی کانفرنس میں شرکت کی دعوت ملی تو مجھ سے انھوں نے کہا کہ ایک تو آپ کو جمعہ کا خطبہ دینا ہے اور نماز پڑھانی ہے' اور دوسرے آپ کو ایک تقریر کرنی ہے کہ "How Islamic Movement Can Succeed"۔ یہ موضوع میرے لیے بڑا مشکل تھا۔ میں اس کے لیے بے شمار کتابیں لایا' بہت کچھ پڑھا اور سوچا۔ میں نے کوئی ۶۰ ' ۷۰ صفحے کا مقالہ اس کے اوپر لکھا۔ جمعہ کے خطبے کے لیے اقامت دین کا موضوع میرے لیے بڑا آسان موضوع تھا۔ اس لیے کہ اس پر تو میں بولتا ہی رہتا تھا۔ پھر میں نے نوٹس بنا لیے' آیات جمع کیں اور میں نے کوئی ۲۰ منٹ کا جمعہ کا خطبہ دیا اور اس کے بعد کوئی ۴۰ منٹ کی تقریر میں نے اجلاس میں کی۔ جمعہ کے خطبے کے بعد ہمارے عرب ساتھی آئے اور بتایا کہ جب ہم سے پاکستانیوں نے یہ کہا کہ ان کے لیے اقامت دین کا موضوع رکھیے تو ہم نے کہا کہ اس پر وہ کیا بولیں گے' اقامت دین پر کیا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن جمعہ کے آج کے خطبے نے ہم سب کو بہت متاثر کیا۔ حالانکہ اس کے لیے میں نے کوئی خاص تیاری نہیں کی تھی' بس قرآن کی آیات اور احادیث سے مدد لی تھی۔ میری جو دوسری تقریر تھی وہ میں نے جدید علوم' قرآن و حدیث' سب سے استفادے کے بعد کی تھی۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ یہ میری اصل محنت تھی' لیکن اُس نے کسی کو متاثر نہیں کیا اور وہ ویسی کی ویسی ہی رہی۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے دلائل کے لحاظ سے وہ بڑی مضبوط چیز تھی۔ اس موقع پر بڑے بڑے پی ایچ ڈی' پڑھے لکھے لوگ موجود تھے لیکن جس چیز نے لوگوں کو متاثر کیا وہ

☆ امریکہ میں عرب طلبہ کی تنظیم (Islamic Society of North America)

قرآن کی سیدھی سادی دعوت تھی۔ یہ آپ ہر جگہ محسوس کریں گے۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ تنقیحات' تفہیمات کا مطالعہ جہاد میں مصروف لوگ کیوں کریں؟ بلاشبہ جہاد میں بالکل ان کی ضرورت نہیں ہے لیکن جہاد دعوت بھی ہے۔ مجاہد داعی بھی ہوتا ہے۔ تنقیحات' تفہیمات ' شہادت حق سے آپ مضامین اخذ کریں اور قرآن کی چھوٹی چھوٹی آیتوں کے گرد ان کو جمع کر دیں۔ اس سے آپ دعوت کا کام کریں گے تو ہر جگہ مسلمان آپ کی بات سنیں گے' آپ کی طرف آئیں گے' اس لیے کہ مسلمان کے دل کے تار اب بھی اُسی صدا پہ ہلتے ہیں اور ان میں اضطراب پیدا ہوتا ہے جو صدا اللہ اور اس کے رسولؐ کی اور قرآن وسنت کی بنیاد ہے۔

آپ تحریک میں کسی مقام پر بھی جائیں' کوئی بھی ذمہ داری سنبھالیں' آپ ذہنی طور پر قرآن اور حدیث سے ان کو کچھ دینے کی پوزیشن میں ہوں' تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ لوگ آپ کو سر آنکھوں پہ بٹھائیں گے اور بہت جلدی آگے بڑھائیں گے جہاں پہنچ کر آپ ان کی خدمت کرسکیں۔

یہ کچھ بنیادی اصول' تدابیر اور تقاضے ہیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں۔ اگر قائدین اور ذمہ داران ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے منصوبہ بندی کریں' اپنی کارکردگی پر نظر رکھیں تو مجھے امید ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو احسن طور پر نبھا سکیں گے' وسائل کو بہتر طور پر استعمال کرسکیں گے اور کارکنوں کی بہتر تربیت کرسکیں گے' نیز ان سے صحیح انداز میں کام لے سکیں گے۔ نتیجتاً مجموعی طور پر بہتر اور موثر قیادت سامنے آسکے گی اور تنظیم کی کارکردگی بھی پہلے سے بہتر اور موثر ہوگی۔

تربیت: اپنی اور دوسروں کی

ہمارے کام کی کامیابی کا انحصار اللہ تعالیٰ کی تائید پر ہے۔ یہ تائید دو صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

ایک' اس کی نصرت جو دلوں کا اطمینان' قدموں کا ثبات اور ملائکہ کی رفاقت اور بہت سی صورتوں میں کام کرنے والوں کی مدد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ دوسرے' مومنین کی ایک ایسی جماعت کی صورت میں جن کے دل آپس میں جڑے ہوں' جو اللہ کی رضا کے طلب گار ہوں اور صرف اس کی رضا تلاش کرتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا: يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا (الفتح ۴۸:۲۹) ''اور اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مشغول پاؤ گے''۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے لیے رحمت کا مجسمہ ہوں گے۔ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح ۴۸:۲۹) ''آپس میں رحیم ہیں''۔ ان کی زندگی' چہروں اور افعال سے اللہ کی بندگی کے آثار ظاہر ہوتے ہوں گے۔ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط (الفتح ۴۸:۲۹) ''سجود کے اثرات ان کے چہروں پر موجود ہیں جن سے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں''۔ ایسی ہی جماعت کامیابی کے حصول کا وسیلہ بنتی ہے جیسا کہ سورۃ الانفال میں فرمایا گیا ہے:

هُوَ الَّذِیْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ o (الانفال ۸:۶۲)

وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعے سے تمھاری تائید کی۔

ایک اسلامی تحریک ان ہی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ لہٰذا جو بھی راہ حق کو اپنائے اس کا جہاں ایک طرف یہ کام ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان خصوصیات کی روشنی میں اس کام کے لیے بہتر سے بہتر بنائے اور اپنے کام کو بہتر سے بہتر طریقے سے کرے' وہاں اس کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ جو لوگ اس کے ساتھ چل رہے ہوں' خواہ وہ ساتھ ہوں' نیچے ہوں یا اوپر' وہ ان کو بھی بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ یہ ذمہ داری ہر فرد پر عائد ہوتی ہے۔ ہر سطح کا فرد' یعنی ایک عام کارکن بھی اس ذمہ داری میں شریک ہے کہ وہ اپنے ساتھ اپنے ساتھیوں کی تربیت کی فکر کرے اور جن تک وہ دعوت پہنچا رہا ہے ان کی تربیت کی بھی فکر کرے' اور جو آدمی سب سے اونچے منصب پر ہو اس کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو ذاتی فریضہ سمجھے کہ لوگ بہتر بن سکیں اور ان کے پاس بہتر بننے کے مواقع ہوں۔

کسی اجتماعی تحریک کا سب سے اہم وسیلہ بلکہ صحیح معنوں میں واحد وسیلہ' سرمایہ اور اثاثہ انسان ہوتے ہوں۔ اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے۔ ویسے بھی تجربات اس بات پر شاہد ہیں کہ مال' جگہ اور مادی وسائل کی کمی کی تلافی ہو سکتی ہے اور ان کے بغیر بھی بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں لیکن اگر انسان کمزور ہوں یا نہ ہوں تو اس کی تلافی مشکل سے ہوتی ہے۔

مشکل یہ ہے کہ انسان بنے بنائے نہیں آتے کہ سب مطلوبہ سائز اور شکل و صورت کے مل جائیں اور نہ کوئی ایسی مشینیں ہی پائی جاتی ہیں کہ جن پر انسانوں کو چڑھا دیا جائے اور سب ایک سانچے اور معیار کے ڈھل کر نکل آئیں' یا جوتے کی فیکٹری کی طرح کہ ایک طرف سے فرد کو مشین میں ڈالا جائے اور دوسری طرف سے جس سائز' جس طرز اور جس نمونے کا فرد چاہیے وہ نکل آئے۔ ہر انسان انفرادیت کا حامل ہوتا ہے۔ شخصیت' ذہن' نفسیات' معاشرت' خاندان اور عادات یہ تو الگ بات ہے' ہر انسان کی انگلی کی لکیریں تک ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ کوئی دو انسان اس لحاظ سے

ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دو مختلف انسانوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش کرنا بھی مناسب نہیں۔ ہر انسان ایک الگ شخصیت کا حامل ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا تنوع ہے۔ کسی مشین سے چیزیں بنانا تخلیق نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے خود ہی اشارہ کیا ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ ہر چیز میں تنوع پایا جاتا ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ (الرعد ۱۳: ۴)

اور دیکھو' زمین میں الگ الگ خطے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے متصل واقع ہیں۔

زمین کے ٹکڑے مختلف ہوتے ہیں' ہر پھل نئی شکل' نئی صورت اور نئے ذائقے کا ہوتا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ یہ خالق کی کائنات ہے نہ کہ کسی مشین کی' جو ایک ہی قسم کی چیزیں بنا بنا کر نکالتی ہے۔

اس لحاظ سے اگر انسان مختلف بھی ہوں اور منفرد بھی' اور بنے بنائے بھی نہیں ملتے ہوں اور ضرورت کے مطابق بنانا بھی ضروری ہو تو پھر یہ ناگزیر ہے کہ ان کو بنانے کے لیے' ان کی نشوونما اور تربیت کے لیے کوئی نظام بنایا جائے' اور کوشش کی جائے کہ جو لوگ بھی ہمارے ساتھ ہیں' ہم تزکیہ و تربیت کے ذریعے ان کو ایسا انسان بنانے کی کوشش کریں--- میں ''بنالیں'' کا لفظ نہیں بلکہ بنانے کی ''کوشش کریں'' کا لفظ استعمال کر رہا ہوں--- جن سے ہمارے مطلوبہ مقاصد پورے ہو سکیں۔

تحریک کو مطلوب انسان

سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسا انسان مطلوب ہے؟ اس بات کو مختصراً دہرانے کی ضرورت ہے تاکہ موضوع کی بنیاد بھی واضح ہو سکے اور بات سمجھنا بھی آسان ہو جائے۔

ہمیں ایسا انسان درکار ہے جو ہمارے مقاصد کے حصول کے لیے مطلوب ہو۔ یہ بات میں ایک بار پھر دہراؤں گا کہ اصل بات تو یہ ہے کہ وہ جنت کا مستحق ٹھہر سکے۔

گویا کہ اس کی نیت اور عمل ایسے سانچے میں ڈھلے کہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہو۔ تزکیے کے حوالے سے یہ پہلی ذمہ داری ہے۔ اگر یہی ذمہ داری پوری نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ وہ تحریک موجود تو ہوگی اور وہ کچھ اجتماعی اور سیاسی مقاصد بھی حاصل کر سکے گی لیکن وہ ایک اسلامی تحریک نہیں ہوگی۔

اس کے بعد پھر ہمارے سامنے کچھ مقاصد طویل نوعیت کے ہوں گے اور اس میں ہمیں حکمت عملی کے مطابق اپنے کارکنان اور انسان تیار کرنا ہوں گے۔ اگر انھیں لڑنا ہے تو انھیں فوجی تربیت دینا ہوگی۔ اگر کچھ اور کام کرنا ہے تو اس کے لحاظ سے انسان بنانا ہوں گے۔ اسی طرح کچھ کثیر المقاصد کام ہوں گے' ان کے پیش نظر حکمت عملی اپنانا ہوگی' مثلاً ہمیں اپنے کاموں کے پیش نظر کچھ مقرر درکار ہوں گے' رسالہ نکالنا ہے تو لکھنے والے چاہیے ہوں گے' یہ ہماری فوری ضروریات ہوں گی۔ ان سب کو سامنے رکھ کر ہمیں انسانوں کی نشوونما' ان کے ارتقا و ترقی اور تربیت و تزکیہ کی فکر کرنا ہوگی۔ گویا کہ جہاد کے لیے جو مطلوبہ روحانی و اخلاقی صفات ہیں وہ بھی اور جہاد کی کامیابی کے لیے جو مطلوبہ دنیاوی صفات و صلاحیتیں ہیں وہ بھی' دونوں ہی ہمارے پیش نظر رہنی چاہییں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی اگر غائب ہوگی تو کسی ایک کا نقصان ہوگا۔ آخرت کا اگر نقصان ہوگا تو اس نقصان کی کوئی تلافی نہیں ہے۔ اس لیے اس کی فکر بڑی اہم اور ضروری ہے۔ اگر دنیا کا نقصان ہوگا تو دنیا کی کامیابی ہاتھ سے جائے گی لیکن بہرحال اس کی تلافی کسی طرح ہوسکتی ہے۔

دو باتیں جو بہت اہم ہیں' ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہییں:

پہلی بات یہ ہے کہ اسلامی تحریک کے ہر کام میں اصل چیز جو پیش نظر رہے گی وہ آخرت ہے۔ اگر علم ہے تو وہ برائے علم نہیں ہے۔ اگر تزکیہ و روحانیت ہے تو برائے روحانیت نہیں ہے۔ اگر ذکر ہے تو برائے ذکر نہیں ہے۔ اگر سیاست ہے تو برائے سیاست نہیں ہے۔ اگر نعرے لگانے والے لوگ چاہییں تو محض نعرے لگانے والے لوگ

درکار نہیں ہیں' بلکہ اس سب کے سب کو اس اصل مقصد کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو ہمارے پیش نظر ہے۔ ان میں سے کوئی کام بھی اپنی جگہ غلط نہیں ہے۔ اگر علم مقصود ہوتا تو ہم مدرسے قائم کرتے' اگر تزکیہ و ذکر مقصود ہوتا تو ہم خانقاہیں قائم کرتے لیکن ہم نے جہاد کے لیے تحریک قائم کی ہے۔

اگر ہمارے تیار کردہ انسان تحریک کے مقاصد ہی پورے نہ کریں بلکہ ہم عالم بنالیں' صوفی بنالیں اور نعرہ باز سیاست دان بنالیں تو اس سے ہمارے مطلوبہ مقاصد پورے نہیں ہوسکیں گے۔ یہ تب پورے ہوں گے جب سب کا سب کام اسی اصل مقصد کے حصول کا ذریعہ بنے' یعنی اللہ کی رضا و خوشنودی اور جنت کو جہاد کے ذریعے حاصل کرنا۔ جنت کے حصول کے اور بھی راستے ہیں اور ممکن ہے کہ ہوں' اور لوگوں کو معلوم بھی ہوں لیکن ہمارا دل جس راستے پر جم گیا ہے' ٹھک گیا ہے' مطمئن ہوگیا ہے' وہ راستہ جہاد کا راستہ ہے' اللہ کی راہ میں کوشش کا راستہ ہے' اس کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کا راستہ ہے۔ اس لیے انسانوں کی ایسی نشوونما' ترقی اور ارتقا مطلوب ہے جو ہمارے ان مقاصد کو پورا کریں۔

تربیت کے بنیادی اصول

اس سوال کے بعد کہ ہمیں کیسا انسان مطلوب ہے' تربیت کے چند بنیادی اصول پیش خدمت ہیں۔

تربیت سے مراد محض اپنی تربیت ہی نہیں ہے بلکہ اجتماعی تربیت ہے جو ہم سب مل کر ایک دوسرے کی کریں یا جو ذمہ دار ہو وہ اپنے ساتھیوں کی کرنے کی کوشش کرے۔

اپنی تربیت آپ

پہلا اصول یہ ہے کہ ہر فرد خود ہی اپنی تربیت کرسکتا ہے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جو فرد اپنی تربیت کی ذمہ داری خود

قبول نہ کرے' کوئی لیڈر' کوئی تنظیم اور کوئی پروگرام اس کی تربیت نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ ارادے اور عمل کی ذمہ داری انسان پر ہے۔ ارادہ اور سعی اصل چیز ہے جس پر اللہ تعالیٰ انسان کو پرکھے گا۔ اس کے بعد پھر اسے اپنے انعام و اجر یا عذاب و سزا کا مستحق ٹھہرائے گا۔ ایک آدمی کی سعی و ارادے کا بوجھ کوئی دوسرا نہیں اٹھا سکتا۔ یہ اسے خود ہی اٹھانا ہے۔ کوئی دوسرا اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔

تنظیم و قیادت کسی انسان کی تربیت میں مدد و معاون تو ہو سکتے ہیں لیکن ان پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی کہ وہ انسان کو لازماً ٹھیک کر دیں گے' یا ان کے پاس کوئی ایسا طریقہ یا نسخہ ہے جس سے انسان لازماً ٹھیک ہو جائیں گے۔

بظاہر یہ بات سارے اجتماعات' تنظیمی پروگراموں اور ان کے فلسفے کے خلاف لگتی ہے' لیکن درحقیقت ایسا نہیں' صرف تھوڑی سی سوچ کی تبدیلی ہے۔ سوچ کی یہ تبدیلی تربیتی کوششوں میں بڑی اہم ہو سکتی ہے' خاص طور پر ان افراد کے لیے جو ہمیشہ یہ شکایت کرتے رہتے ہیں کہ تربیت نہیں ہو رہی' تزکیہ و تربیت کا اہتمام نہیں ہے اور اس ضمن میں کوشش کم ہو رہی ہے' اس لیے میں خراب ہوں--- اس رویے کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ ہمیشہ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ہر شخص اپنی اصلاح' تربیت اور تزکیے کا خود ہی ذمہ دار ہے۔ اجتماعی پروگرام کم ہوں یا زیادہ' یا کوششوں میں کچھ کمی بیشی ہو جائے' اس سے وہ آخرت میں اپنے تزکیہ و تربیت کی ذمہ داری سے بری نہیں ہو سکتا۔

اگر ہم اپنے ساتھ چلنے والے افراد کے ذہن کو اس سانچے میں ڈھالیں کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی تربیت کا خود ذمہ دار ہے اور اس کو ہی اس ذمہ داری کو پورا کرنا ہے' تو اس سے اس کی اپنی صلاحیت اور کوشش پروان چڑھے گی۔ ہمیں اس خیال کی ہمت افزائی کبھی نہیں کرنا چاہیے کہ کوئی تربیت گاہ' اجتماعی پروگرام یا درس قرآن ایسی جادو کی چھڑی ہے کہ ادھر اس کو ہم نے گھمایا ادھر انسان خود بخود ٹھیک ہوتا چلا جائے گا خواہ وہ خود کوشش کرے یا نہ کرے' ارادہ کرے یا نہ کرے' خود سرگرم عمل ہو یا نہ ہو۔

تنظیم و ذمہ داران کا دائرہ کار

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا تربیت کی کوئی ذمہ داری تنظیم' قیادت یا ذمہ دار افراد کے اوپر نہیں ہے؟ ایسی بات نہیں ہے۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ تنظیم اور قیادت کی بھی تربیت کی ایک ذمہ داری ہے اور اس کا ایک مخصوص دائرہ کار ہے' تاہم یہ واضح طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ وہ ذمہ داری اور دائرہ کار کیا ہے؟

فرد کو اپنی ساری خرابیوں' خامیوں اور بھلائیوں کا ذمہ دار قائدین یا تنظیم کو نہیں ٹھہرانا چاہیے بلکہ خود کو ہی ذمہ دار قرار دینا چاہیے۔ خود کو ذمہ دار ٹھہرانے کے بعد ہی ایک شخص اپنی اصلاح و تربیت کر سکے گا اور پروگراموں سے بھی فائدہ اٹھا سکے گا۔ اگر یہ مقصود نہ ہوگا تو لوگ پروگرام میں آئیں گے' بیٹھیں گے اور چلے جائیں گے اور ویسے کے ویسے ہی رہیں گے کہ جیسے آئے تھے۔

یہ ساری خرابیاں اسی لیے پیدا ہوتی ہیں کہ افراد یہ سمجھتے ہیں' اور ذمہ داران بھی اپنی بعض گفتگوؤں سے اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں کہ تربیت کی اصل ذمہ داری اجتماعی پروگراموں' تنظیم اور قائدین کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرد اور تنظیم دونوں کی ذمہ داریوں کا ایک مخصوص دائرہ ہے۔ ذمہ داران کو بھی اپنے اس دائرے کو سمجھنا چاہیے' اس ذمہ داری کو قبول کرنا چاہیے' اور اس کو ادا کرنے کے لیے پوری کوشش کرنا چاہیے۔ وہ دائرہ ان امور پر مشتمل ہے:

جذبات کو انگیز کرنا: سب سے پہلا کام جذبات کو انگیز کرنا اور انسان میں موجود محرکات کو قوی بنانا ہے۔

تربیت کے مواقع و امکانات: قیادت' ذمہ داران اور مجموعی طور پر پوری تنظیم کی ذمہ داری ہے کہ وہ تربیت کے لیے مواقع اور امکانات پیدا کریں۔ تنظیم کا

ماحول ایسا بنائیں کہ جہاں اگر کوئی آدمی اپنی تربیت کرنا چاہے تو اس کو ایسا ماحول ملے جو اس کے لیے مدد و معاون ہو۔ اگر وہ ارادہ کرے کہ مجھے اپنی تربیت کرنا ہے اور میں اپنی اصلاح کی کوشش کروں گا تو ماحول سے اسے وہ ساری غذا' مواد اور امکانات ملیں جن سے وہ اپنا ارادہ پورا کرے اور اپنی اصلاح کر سکے۔ گویا بیج اس کو ڈالنا ہے' اگنا بھی اُسے خود ہے' پودا اور درخت بھی اسے خود ہی بننا ہے' لیکن اگر وہ درخت بننے کا ارادہ کرے تو پھر اسے ہوا' پانی' روشنی اور دیگر مطلوبہ ماحول فراہم کرنا تنظیم کا کام ہے۔ یہ دوسری ذمہ داری ہے۔

صحیح خطوط پر رہنمائی: تیسرا کام یہ ہے کہ اگر اسے تعلیم کی ضرورت ہو' اسے یہ نہ معلوم ہو کہ وہ راہیں کون سی ہیں جن پر اسے چلنا ہے تو اسے یہ تعلیم دینا' راہ بتانا اور یہ رہنمائی دینا کہ وہ اپنی تربیت کس طرح کرے' کیا کرے اور کیا نہ کرے' یہ بھی تنظیم' ذمہ داران اور قیادت کا کام ہے۔

قابل تقلید مثال پیش کرنا: چوتھا کام یہ ہے کہ ایسی مثالیں ان کے سامنے موجود ہوں جو قابل تقلید ہوں۔ یہ خاص طور پر ان کی ذمہ داری ہے جو آگے چل رہے ہوں' قیادت و رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوں کہ وہ اپنے طرزِعمل سے ایسی مثالیں پیش کریں جن کو دیکھ کر دوسروں کی حوصلہ افزائی اور ہمت افزائی ہو' اور وہ ان کی پیروی کی کوشش کریں۔

اصل مثال تو بہرحال اسوہ حسنہؐ کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بار بار سمجھانے کی ضرورت ہے کہ جو بھی انسان ہمارے ساتھ چل رہے ہیں' خواہ وہ امیر جماعت ہو یا ناظم اعلیٰ یا کوئی صدر' یا کوئی عام کارکن' یہ سب ناقص ہیں۔ ان کی کسی خرابی یا کمزوری کا کسی بھی وقت علم میں آنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم تحریک سے فرار اختیار کریں۔ اس لیے کہ ہم تو اسی مفروضے پر آئے ہیں کہ ہم سب انسان ہیں اور ہم سب ناقص ہیں۔ کسی بھی قائد میں کمزوری پائی جا سکتی ہے اور کمزوریاں ہوتی ہیں۔ ان کی کوئی

خرابی یا کمزوری کسی بھی فرد کے گمراہ ہونے کے لیے' اور میدان چھوڑ کر فرار ہونے کے لیے وجہ جواز نہیں بن سکتی۔

اسوہ حسنہؐ تو بس ایک ہی ہے جہاں ہم ہر قول و فعل کا دفاع کر سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ یہ کامل اسوہ ہے۔ وہ اسوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس کے علاوہ کاملیت کا دعویٰ کسی کو نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ لوگ جو آگے چل رہے ہوں' قیادت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہوں' ان کا یہ کام ہے کہ وہ اپنے قول و فعل اور عمل سے ایسی مثالیں پیش کریں جو قابل تقلید ہوں۔ اس لیے کہ انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے کی مثل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جیسے ماڈل یا نمونے اسے چلتے پھرتے نظر آئیں گے' انھی کے رنگ میں وہ ڈھلنا شروع کرتا ہے۔ جن کے ساتھ وہ اٹھتا بیٹھتا اور چلتا پھرتا ہے' انھی سے وہ اثر قبول کرتا ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں تزکیے کی ساری کوششوں میں ''شیخ'' اور ''صحبت'' کی اہمیت ہے اور اس کا مدار اسی اصول کے اوپر ہے کہ انسان ہمیشہ اسی کے پیچھے چلتا ہے جو سامنے چلتا ہے۔ اگر وہ خراب ہوگا تو وہ بھی خراب ہوگا' اگر وہ اچھا ہوگا تو وہ بھی ویسا ہی بننے کی کوشش کرے گا۔ لہٰذا قابل تقلید مثالیں پیش کرنا بھی قیادت اور ذمہ دار حضرات کی ذمہ داری ہے۔

نتائج

ان دونوں اصولوں سے جو اہم نتائج نکلتے ہیں' انھیں ایک بار پھر تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔

۱- ایک بات یہ ہے کہ فرد کو اپنی تربیت کا ذمہ دار خود کو ٹھیرانا چاہیے۔ میں ابتدا ہی سے یہ کہہ رہا ہوں کہ ذمہ داری کا احساس ہی وہ کنجی ہے جس سے تربیت و تزکیہ کے سارے بند دروازے کھلتے ہیں۔

۲- دوسری بات جو ان دونوں اصولوں سے اخذ ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک فرد

کے اندر اجتماعی پروگرام اور قیادت کے اوپر اپنی تربیت کی ذمہ داری ڈالنے کا جو رجحان پیدا ہوتا ہے' اور وہ تربیتی پروگراموں کے ہونے یا نہ ہونے کو اپنی تربیت کی خرابی کا ذمہ دار ٹھہرانے لگتا ہے' اس سوچ کی حوصلہ شکنی ہونی چاہیے' بجائے اس کے کہ ہم اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ اگر کوئی اس بات کی نشان دہی کرے کہ لوگ اس لیے خراب ہو رہے ہیں یا کام نہیں کر رہے ہیں کہ تربیتی پروگرام نہیں ہو رہے تو ہم جھٹ سے دو چار تربیتی کیمپ ترتیب دے دیں' یہ اس کا حل نہیں ہے۔ تربیتی پروگرام ہونے چاہییں اور سوچ سمجھ کر ہونے چاہییں کہ کیا ضرورت ہے' کیا کریں' کس طرح کریں؟ لیکن خرابیوں کی نشان دہی پر فوری طور پر چند تربیتی پروگرام کر کے مطالبہ پورا کرنے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ لوگ آتے ہیں اور ویسے کے ویسے ہی چلے جاتے ہیں' اور وہی مسائل سال بہ سال اسی طرح اُبھرتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے فرد کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا اور اس کو اجتماعی پروگراموں کی بیساکھی کے ساتھ لنگڑا لنگڑا کر چلنے کی تربیت دی ہے اور ہمیشہ مسائل پیش آنے پر وہ وہیں نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہے۔

۳- تیسرا نتیجہ یہ اخذ ہوتا ہے کہ قیادت اور تنظیم کو اپنی ذمہ داریاں قبول کرنی چاہییں۔ انھیں اس کا احساس ہونا چاہیے اور انھیں پورا کرنے کے لیے بھرپور کام کرنا چاہیے' نیز انھیں قابل تقلید مثال پیش کرنا چاہیے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ تربیت کوئی ایسا کام نہیں ہے جو قیادت یا ذمہ داران کسی شعبے کے سپرد کر کے مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں۔ تلاوت آیات' حکمت کی تعلیم اور تزکیہ و تربیت جو رسولؐ اللہ کی بعثت کا مقصد اور اولین فریضہ تھا' ہر قائد کی مجموعی ذمہ داری میں شامل ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قائد' ہر ذمہ دار فرد ہر قسم کی صلاحیت نہ رکھتا ہو' درس قرآن نہ دے سکتا ہو' درس حدیث نہ دے سکتا ہو' اچھی تقریر نہ کر سکتا ہو' تعلیم نہ دے سکتا ہو' علم نہ رکھتا ہو۔ لیکن اگر وہ قائد ہے' قیادت کے منصب پر فائز ہے تو اس کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ

لوگوں کو متحرک کرے' انھیں جذبہ دے' ان کی مدد کرے اور ان کی صلاحیتوں کو تقویت دے کر انھیں آگے بڑھائے۔ یہ ذمہ داری بہرحال اسے ادا کرنا ہوگی۔ اس سے وہ بری الذمہ نہیں ہوسکتا۔ چونکہ یہ ذمہ داری قیادت کے اوپر عائد ہوتی ہے' اس لیے اسے اس ذمہ داری کو قبول کرنا چاہیے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

یہ تین نتائج ان دو اصولوں سے اخذ ہوتے ہیں۔

تربیت: سیکھنے اور عمل کرنے کا نام

تیسرا اصول یہ ہے کہ تربیت سننے کے بجائے عمل کرنے اور سیکھنے سے ہوتی ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تقریر سننے اور نوٹس لینے سے تربیت ہو جاتی ہے۔ ایسے تربیت نہیں ہوتی۔ اس طرح ہم تربیت چاہنے والے کے سامنے صرف دروازے کھولتے ہیں۔ اب اگر وہ دروازے کے اندر قدم رکھے گا تو اس کی تربیت ہوگی' اگر نہیں رکھے گا تو یہ سب کچھ ضائع جائے گا۔ کم سے کم اس شخص کی حد تک تو ضائع جائے گا جس نے سنا۔ اسی لیے سننے یا سنانے سے زیادہ' یا کم سے کم اس کے مساوی' کوشش اس کی ہونا چاہیے کہ جو کچھ ہم سن رہے ہیں اور سنا رہے ہیں اس پر تھوڑا بہت عمل ضرور ہو۔

اس کے پیچھے حضورؐ کا اور صحابہ کرامؓ کا وہ اسوہ ہے کہ لوگ آپؐ سے چند آیتیں سیکھتے تھے' اس کو اپنے عمل کا جز بناتے تھے' اور پھر آکر چند آیتیں مزید سیکھتے تھے۔ بعض صحابہ نے کہا کہ ہم نے سورۃ البقرہ آٹھ سے ۱۰ سال میں حفظ کی۔ حفظ کے معنی محض یاد کرنے کے نہیں بلکہ اس کو اپنی زندگی کے اندر' اپنے عمل سے محفوظ کرنے کے ہیں۔

ہم بہت سی چیزیں بیک وقت بتا دیتے ہیں' لیکن حضورؐ کا طریقہ یہ نہیں تھا۔ آپؐ اپنے رفقا کے ساتھ مستقل رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً رہنمائی فرماتے تھے۔ آپؐ کے خطبات اور تقاریر ہمیشہ مختصر ہوتی تھیں۔ اب چونکہ زندگی بہت زیادہ پھیل گئی ہے' لوگ بہت زیادہ پھیل گئے ہیں' مواقع کم ملتے ہیں' اس لیے ہم کوشش کرتے ہیں کہ بہت ساری

باتیں بیک وقت بتا دیں۔ لیکن اگر اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے لوگوں کا ساتھ ہو تو ہمیشہ اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ بات کم کی جائے۔ ایک وقت میں ایک بات بتائیں اور پھر اس بات کی کوشش اور اہتمام کریں کہ یہ بات عمل کا جز بن جائے۔ جب وہ عمل میں آئے گی تو پھر صحیح معنوں میں تربیت ہوگی ورنہ پھر یہ وہی معاملہ ہوگا کہ ہم ''تعلق باللہ'' کے بارے میں تو سب کچھ جان لیں گے اور سیکھ لیں گے، لیکن شاید تعلق باللہ ہی نہ سیکھ سکیں۔ اس لیے کہ ہم نے اس کو اپنے عمل کا جز نہیں بنایا۔

ہمارا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ ہم چیزوں کو سیکھ لیں بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہمارا کردار، ہمارا عمل، ہماری روش، ہمارے رجحانات اور ہمارے رویے، سب اس سانچے کے اندر ڈھلیں۔ اس کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ عمل کیا جائے۔ جو کچھ بھی سنا جائے اس پر تھوڑا بہت عمل کیا جائے، تب ہی اس سے کچھ حاصل ہوگا۔

قرآن کا پڑھنا لازم ہے اور ہم سب پورا قرآن پڑھتے ہیں۔ لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے اس معاشرے کے بارے میں سوچیں جہاں قرآن نازل ہو رہا تھا، تو کچھ اور ہی منظر نظر آتا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ جو لوگ حضورؐ کے ساتھ تھے ان میں سے اکثریت نے پورا قرآن نہیں پڑھا تھا تو یہ بات غلط نہیں ہوگی۔ اکثریت کے پاس قرآن چھپا ہوا یا لکھا ہوا موجود ہی نہیں تھا۔ لوگ کچھ آیتیں ادھر سے اور کچھ ادھر سے سنتے تھے، یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے قرآن سنتے تھے۔ قرآن کی کیفیت وہی تھی جو آج ہماری تقریروں کی ہے، یعنی جس طرح تقریر سن کر کچھ حصہ یاد رہتا ہے اور کچھ بھول جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ان کے ساتھ تھا۔ چونکہ کلام الٰہی کا معاملہ تھا اس لیے کچھ زیادہ اہتمام کیا جاتا تھا لیکن سب تک پوری بات نہیں پہنچتی تھی۔ بہت کم لوگ تھے جن کے سینوں میں پورا قرآن محفوظ تھا۔ چھپا ہوا تو کہیں بھی نہیں تھا۔ آج ہم جس طرح روز قرآن پڑھتے ہیں اور اس کا مطالعہ کرتے ہیں، اگر غور کیا جائے تو یہ اس زمانے میں ممکن ہی نہیں تھا۔ اسی لیے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں سب سے مختلف ٹکڑے لے کر

قرآن کو جمع کیا گیا تھا۔ البتہ عمل سب کا تھا' یعنی جو کچھ معلوم ہو گیا' اس پر فوراً عمل ہوگیا۔ یہ اسی تھوڑے علم اور کثیر عمل کی برکت تھی جس کی وجہ سے ان کا تزکیہ ہوا اور وہ دنیا کے قائد اور امام بن گئے۔

تربیت کا عمل زندگی کا حصہ

چوتھا اصول' تربیت کے ذرائع کو عام زندگی کے اندر سمونا ہے۔

یہ ذمہ دار حضرات اور قیادت کی ذمہ داری ہے۔ وقتاً فوقتاً محض درس دے دینا' تقریریں کر دینا اور اجتماعی پروگرام کر دینا تربیت نہیں ہے' بلکہ تربیت تو یہ ہے کہ اس بات کی کوشش کی جائے کہ یہ چیزیں ہماری پوری اجتماعی زندگی کا جز بن جائیں' مثلاً ہمارا ہفتہ وار اجتماع تنظیمی زندگی کا ایک جز ہے۔ اسی طرح ذکر الٰہی ہماری زندگی کا جز بن جائے' یعنی زندگی میں سمو دیا جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے کے ذرائع تربیت' نماز' قرآن اور اذکار وغیرہ' ان سب کو زندگی کے اندر اس طرح باقاعدہ سمو دیا تھا کہ اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے انسان ان کو کر سکتا تھا۔ اس کو روزمرہ زندگی سے ہٹ کر کسی گوشے میں بیٹھ کر اپنی تربیت کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔ گو اس کے بھی مواقع آتے تھے۔ لوگ نبی کریمؐ کی صحبت میں بھی آ کر بیٹھتے تھے اور گھنٹوں بیٹھتے تھے اور راتوں کو کھڑے ہو کر قیام اللیل بھی کرتے تھے۔ مگر چلتے پھرتے بھی وہ جو کچھ کرتے تھے اس سے بھی ان کی تربیت ہوتی تھی اور وہ اس سے کچھ نہ کچھ حاصل کر لیتے تھے۔

ہر کام نیت اور اللہ کی یاد سے تربیت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ سیاسی کام زیادہ ہو رہا ہے اور دینی کام کم' یہ تربیت کا صحیح تصور نہ جاننے کی وجہ سے ہے۔ مجھے اس حوالے سے اطمینان ہے۔ مولانا مودودیؒ کے اس جملے نے میرے دل و دماغ پر یہ حقیقت بالکل واضح کر دی ہے کہ بڑے سے بڑا دینی کام ہو اور اللہ کے

ذکر سے خالی ہو تو وہ دنیاوی کام ہے' اور بڑے سے بڑا دنیوی کام ہو اور اللہ کے ذکر سے معمور ہو تو وہ دینی کام ہے۔ نماز اگر اللہ کے ذکر سے خالی ہو' دکھاوے کے لیے ہو' تو یہ دنیاوی کام ہے۔ نعرے لگانا' پوسٹر لگانا اور تلوار اٹھانا اگر اللہ کے ذکر سے معمور ہو' اللہ کی رضا کے لیے ہو' تو یہ ایک خالص دینی کام ہے۔

میں دین اور سیاست کی تفریق کا بالکل قائل نہیں ہوں۔ میرے خیال میں ہر کام تربیت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اگر ہم اپنے دل و دماغ کو یکسو کر کے اپنی نیت کو تازہ کر لیں' اللہ کے لیے کر لیں اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ کا ذکر کرتے جائیں تو نعرے لگانا' پوسٹر چسپاں کرنا اور الیکشن لڑتے ہوئے' اللہ کی تسبیح کرنا' اس کی حمد کرنا اور اس کو یاد کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے' بہت آسان کام ہے۔ اس میں کوئی خاص وقت نہیں لگتا' کہیں الگ سے بیٹھنا نہیں پڑتا' تسبیح ہاتھ میں نہیں لینا پڑتی' بس ہم توجہ کی کمی اور غفلت کی وجہ سے اس بات کو نہیں کر پاتے۔

تربیتی امور اور تنظیمی ماحول میں مطابقت

پانچواں اصول یہ ہے کہ تنظیم کے ماحول اور سمت' اور تربیت کی کوششوں کے درمیان مطابقت کا ہونا تربیت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔

اگر ہم تربیت دے رہے ہوں ایک قسم کی' یعنی درس قرآن اور تربیتی پروگرام وغیرہ کی' جب کہ پوری تنظیم کسی دوسری سمت میں جا رہی ہو' تو ان دونوں کے درمیان تضاد پیدا ہو جائے گا۔

اس تضاد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ آئیں گے' پروگراموں میں شریک ہوں گے' تقاریر سنیں گے لیکن اس سے کوئی فائدہ تنظیم کو نہیں پہنچے گا۔ اس لیے کہ تنظیم اور اس کا پورا ماحول ایک بالکل مختلف سمت پر چل رہا ہوگا۔ اس لیے ماحول یا سمت' اور تربیت کے حوالے سے جو کچھ کیا جا رہا ہو' ان دونوں کے درمیان تطابق بہت ضروری ہے۔ ایسی

صورت حال میں اگر تربیت یافتہ افراد کے مختلف گروپ پے درپے تیار بھی کر دیے جائیں تو وہ تنظیم کی تقویت کا باعث نہیں بن سکیں گے۔ اگر تنظیم صحیح معنوں میں اس سمت اور رخ پر نہ جارہی ہو جس سمت اور رخ کی نشان دہی تربیتی پروگرام کر رہے ہوں' اس کا ماحول اس کی موافقت نہ کر رہا ہو بلکہ مزاحم ہو' وہ سنتے کچھ ہوں اور دیکھتے کچھ ہوں' تو اس سے ایک عدم تطابق پیدا ہوگا۔ لوگ اس کے عادی ہو جائیں گے کہ صحیح بات تو یہ ہے لیکن ہوتا اس طرح ہے۔ بات تو اچھی کہی جارہی ہے لیکن یہاں عمل دوسری چیزوں پر ہوتا ہے' اور اسی طرح کی چیزیں یہاں چلتی ہیں اور وہی چلیں گی۔ جب یہ صورت حال پیدا ہو جائے تو تربیتی پروگرام غیر موثر ہو جاتے ہیں اور وقت کا استعمال تقریباً بے مصرف ہو جاتا ہے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ قیادت' یعنی وہ لوگ جن کا کام تنظیم کو چلانا ہے اس چیز کا جائزہ لیں کہ وہ باتیں جو ہم درس قرآن میں' تقاریر میں اور تربیتی پروگراموں میں کہہ رہے ہیں' تنظیم کا ماحول اور رخ بھی اسی سمت میں ہونا چاہیے۔ جو کچھ کہا جارہا ہو یہ تو ممکن نہیں کہ تنظیم ہو بہو اسی کا نمونہ ہو' اگرچہ ہم آئیڈیل بھی پیش کرتے ہیں لیکن کم سے کم اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ مجموعی طور پر تنظیم کا ماحول اور رخ انھی تعلیمات کی سمت میں ہو جو پیش کی جارہی ہوں نہ کہ ان کے مخالف سمت میں۔

تربیت: ایک طویل اور مسلسل عمل

چھٹا اصول یہ ہے کہ تربیت ایک طویل اور مسلسل عمل ہے۔

ہم اس عمل کو نہ منقطع کر سکتے ہیں اور نہ ستانے کے لیے ہی بیٹھ سکتے ہیں کہ اب یہ عمل پورا ہوگیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ مقصد اور روح بیک وقت حاصل ہو سکتے ہیں۔ ایک لمحے میں آدمی ایمان لاکر کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے لیکن کردار کی تعمیر میں بہرحال وقت لگتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کی پوری زندگی اس بات پر شاہد ہے

کہ ایمان کا سودا تو پلک جھپکتے میں ہوگیا اور انھوں نے ایک ہی لمحے میں دل و جان سپرد کر دی لیکن کردار کی تعمیر اور کمزوریوں اور خامیوں کی اصلاح میں خاصا وقت لگا۔

مدینہ کی زندگی کے ساتویں سال بھی جب قومی عصبیت کا نعرہ اٹھا تو لوگ دوڑ پڑے' انصار بھی اور مہاجرین بھی۔ ثقیفہ بنی ساعدہ کے بعد بھی لوگوں کے اندر اختلافات پیدا ہوئے۔ عمل و کردار کا معاملہ ہی ایسا ہے کہ اس میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ یہ ایک مسلسل عمل ہے جو چلتا رہے گا جس سے کبھی غافل نہیں ہوا جا سکتا۔ البتہ مقاصد و اہداف اور ایمان اور دل و جان کا سودا آدمی ایک لمحے میں کر لیتا ہے اور فیصلہ کر کے اس راہ پر آ جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اگر کوئی آدمی کام میں کمزوری دکھا رہا ہو تو اس کے لازماً یہ معنی نہیں ہیں کہ اس نے مقصد کو ترک کر دیا ہے۔ لہٰذا اس بنیاد پر اس پر یہ فتویٰ صادر کر کے اسے کاٹ دینا صحیح نہیں ہوتا۔

یہ چھ اصول ہیں جو اپنی تربیت اور اپنے ساتھیوں کی تربیت میں بنیادی اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

باہمی تعلقات: تین بنیادی اصول

تربیت کے عمل میں ایک اہم اور بنیادی سوال ان تعلقات کی نوعیت سے متعلق ہے جو ذمہ داران اور ان کے ساتھ چلنے والے ساتھیوں کے درمیان پائے جانے چاہییں۔ باہمی تعلقات کے یہ اصول کوئی ایسے اصول نہیں ہیں کہ جن کا کسی دوسری جگہ انطباق نہ ہو سکتا ہو۔ کارکنوں کا باہمی تعلق بھی اسی سے مرتب ہوگا اور نیچے والے لوگ اوپر والے لوگوں سے جو تعلق رکھیں گے وہ بھی انھی اصولوں سے مرتب ہوگا۔ اگرچہ اس موضوع پر میری کتاب **کارکنان کے باھمی تعلقات** بھی موجود ہے' تاہم میں وہ اصول بیان کرنا چاہوں گا جو میری نظر میں اُن لوگوں کے پیش نظر ضرور رہنے چاہییں اور اُن کے کردار کا جز ہونا چاہییں جو دوسروں کی تربیت کے ذمہ دار ہیں۔

رحمت و شفقت، عفو و درگزر

میں نے قرآن و حدیث اور سیرت کا جتنا بھی مطالعہ کیا ہے اور ان واقعات کا جائزہ لیا ہے جن میں حضورؐ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ معاملہ اور برتاؤ کیا' ان کی خامیوں اور کوتاہیوں پر نگاہ رکھی اور اصلاح کی کوشش کی' اس کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں اور اس پر مطمئن ہوں کہ باہمی تعلقات کا سب سے بڑا اصول رحمت و شفقت' نرمی اور عفوودرگزر ہے۔ یہ پہلی چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبیؐ کی تعریف بھی انھی الفاظ میں کی ہے:

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (التوبہ ۹:۱۲۸)

ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔

رؤف اور رحیم اللہ کی صفات ہیں۔ اللہ تعالیٰ سراسر شفقت اور سراپا رحمت ہیں۔ اللہ نے ان صفات کو اپنے نبیؐ کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس سے ان صفات کی معراج معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح جماعت کے اتحاد' یک جہتی اور قوت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کی نرم دلی کی تعریف کی ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹)

(اے پیغمبرؐ!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔

اگر اللہ کے رسولؐ تند خو اور سنگ دل ہوتے تو قرآن کی دعوت اپنی جگہ پر رہتی' اس کا حسن اور اثر انگیزی اپنی جگہ پر ہوتے لیکن بھیڑ چھٹ جاتی' لوگ جمع نہ ہوتے۔ لوگوں کی بھیڑ جمع کرنے والی اور ان کو چمٹائے رکھنے والی چیز' قرآن کی دعوت سے زیادہ داعی کی رحمت' شفقت اور حسن سلوک تھا۔ اسی نے جماعت کو جمع کیا اور قربانیوں پر آمادہ کیا۔

لوگ آپؐ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر سمندر میں کودنے کے لیے تیار تھے‘ صحراؤں میں لڑنے اور گردنیں کٹوانے کے لیے تیار تھے۔ یہ مجرد علمی و عقلی دعوت نہیں تھی بلکہ یہ دراصل آپؐ کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ رحمت و شفقت کا برتاؤ تھا جس کی وجہ سے یہ جماعت ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح بن گئی اور اس نے اللہ کی راہ میں عظیم الشان کامیابیاں حاصل کیں۔

نبی کریمؐ کی یہ رحمت و شفقت ہر پہلو میں نظر آتی ہے۔ تعلیم و تربیت میں‘ دوسروں کو کام تفویض کرنے میں‘ دوسروں کے ساتھ معاملہ کرنے میں‘ غلطیوں پر گرفت کرنے میں‘ برتاؤ اور روش میں اور احتساب و جائزے میں بھی۔ غرض ہر چیز میں یہ رحمت وشفقت نظر آتی ہے۔

میں اس حوالے سے چند مثالیں رکھوں گا۔ یہ مثالیں مشہور اور معروف ہیں اور جو لوگ سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں‘ وہ ان سے واقف بھی ہوں گے۔ لیکن اپنی بات کو مربوط کرنے کے لیے میں چند چیزوں کی طرف خاص طور پر اشارہ کروں گا۔

○ پہلی بات یہ ہے کہ جب نبی کریمؐ کو لوگوں کی غلطیوں کا علم ہوتا تھا تو آپؐ نام لے کر نشان دہی نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسے کام کرنے لگے ہیں۔ آپؐ نے کبھی نام لے کر یہ نہیں کہا کہ فلاں شخص نے اس قسم کا کام کیوں کیا؟ آپؐ کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی تھی کہ بھری مجلس میں اس طریقے سے لوگوں کو نامزد نہ کریں الا یہ کہ بعض جگہ ایسا کرنا ضروری ہو جائے اور ناگزیر ہو۔

○ بالعموم آپؐ کی پالیسی یہ تھی کہ آپؐ انفرادی غلطیوں کا ذکر بھی اجتماعی غلطیوں کے طور پر کرتے تھے۔ اس لیے کہ ایک فرد کی غلطی سے پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ اصلاح کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ یوں کہا جائے کہ غلطی ایک فرد نے نہیں کی بلکہ ہم سب نے کی ہے۔ اس لیے کہ ہم سب اس فرد کا حصہ ہیں اور وہ ہمارا ایک حصہ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں نے غلطی کی تو اس کے معنی ہیں کہ ہم سب بڑے پاکیزہ ہیں

اور صرف وہی غلط کار اور گناہ گار ہے۔ جب یوں کہا جائے کہ ہم نے یہ غلطی کی ہے یا ہم یہ غلطی کرنے لگے ہیں تو اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ ہم سب ایک فرد کے ساتھ اس غلطی کے اندر شریک ہیں۔ گویا یہ ایک اجتماعی ذمہ داری ہے۔

○ اسی طرح تعلیم و تزکیہ میں بھی آپؐ کا معاملہ بہت شفقت و محبت کا تھا۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بدو مسجد نبویؐ میں آیا اور اس نے کھڑے ہو کر پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ صحابہ کرامؓ اسے مارنے کے لیے دوڑے۔ آپؐ نے فرمایا: رک جاؤ اسے پیشاب تو کر لینے دو۔ جب اس نے پیشاب کر لیا' تو آپؐ نے اس کو اپنے پاس بلایا' اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ یہ پاکیزہ جگہ ہے' یہاں پر ایسے کام نہیں کرتے۔ پھر صحابہ کرامؓ سے کہا کہ پانی لاؤ اور پانی بہا کر اسے صاف کر دو۔ اب بھلا بتایئے کہ ایسا آدمی کیوں نہیں دل و جان سے آپؐ کا گرویدہ ہو جائے گا۔ کیونکر یہ شکایت پیدا ہوگی کہ یہ شخص بعد میں جا کر پھر وہی کام کرتا ہے جو پہلے کر رہا تھا۔ اس لیے کہ اس کو جس انداز میں تعلیم ملی وہ اس کے دل کے اندر نقش ہوگئی کہ کتنا عظیم شخص ہے جو ایسی رحمت و شفقت کا مالک ہے۔ گویا ایک طرف اس کو پیشاب پورا کرنے کا موقع دیا کہ اسے درمیان میں روکنا ٹھیک نہیں اور پھر شفقت و محبت سے اس پر بات بھی واضح کر دی۔

○ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ نماز تیار ہے' آپؐ مصلے پر کھڑے ہیں کہ کسی نے اپنی ضرورت اور حاجت کے لیے پکارا تو آپؐ نماز چھوڑ کر فوراً چلے گئے۔ اگر نماز پڑھا رہے ہیں تو کسی بچے کے رونے کی آواز آنے پر نماز مختصر کر دی۔ اس طرح سے بہت سی مثالیں ملتی ہیں جن میں انسانوں کا لحاظ کرنا' ان سے شفقت و محبت سے پیش آنا اور عفو و درگزر کی روش کو اپنانے کا عمل آپؐ سے ثابت ہے۔ یہی معاملہ غلطیوں پر گرفت کرنے' احتساب کرنے اور جائزہ لینے میں بھی تھا۔

○ آپؐ صرف داعی اور مزکی ہی نہیں تھے بلکہ امیر ریاست بھی تھے۔ آپؐ کے سامنے جب کوئی ایسا معاملہ آتا جس میں پکڑ ضروری تھی اور غلطی پر حد لاگو کرنا ضروری

ہوتا تو آپؐ کو حد نافذ کرنا پڑتی تھی۔ لیکن آپؐ اپنے صحابہ کرامؓ سے برابر یہی کہتے تھے کہ میرے سامنے معاملے نہ لایا کرو۔ بہتر یہی ہے کہ تم خود ہی انھیں چھپا جاؤ' نظرانداز کردو یا پھر انھیں معاف کردو۔

○ ایک دفعہ ایک آدمی آیا' اس پر حد جاری ہوئی تو آپؐ کے چہرے کا رنگ متغیر ہوتا گیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ تم نے کیوں نہیں اسے وہیں معاف کر دیا۔ اسے میرے پاس کیوں لے کر آئے۔ اب' جب کہ ایک فرد میرے پاس لایا جائے جس پر حد لاگو ہونا ہو تو مجھے اس کو یہ سزا دینی پڑے گی۔

○ زنا کے واقعات میں بھی یہ بات موجود ہے کہ آپؐ نے کئی دفعہ ٹالنے کی کوشش کی کہ ایسا ہو جائے کہ اس کے اوپر حد نافذ نہ کرنا پڑے۔ اس میں آپؐ نے اس اس طریقے سے باتیں کی ہیں کہ اگر ہم ان کو سامنے رکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ کس طرح آپؐ نے اپنے ساتھیوں کی تربیت کی۔ گویا خوبیوں پر نگاہ رکھی جائے اور خرابیوں کو نظرانداز کیا جائے۔

○ بخاری میں ایک واقعہ ہے کہ ایک شخص کئی دفعہ شراب پینے کے جرم میں پکڑ کر لایا گیا اور اس کے اوپر حد جاری کی گئی۔ اس پر صحابہؓ نے کہا کہ اللہ اس پر لعنت کرے کہ یہ باز ہی نہیں آتا' بار بار آتا ہے۔ آپؐ نے کہا کہ اس پر لعنت نہ کرو' یہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے۔

آپؐ نے یہ بات جو کہی اس کا مطلب یہ تھا کہ آپؐ کو علم تھا کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر اور نشے کی عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ لیکن اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے وفاداری موجود ہے۔ اسی بنا پر آپؐ نے یہ کہا کہ اس پر لعنت نہ کرو اس لیے کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے۔

اس کے مقابلے میں ہماری روش کیا ہے کہ ہم چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر فتویٰ جاری

کر دیتے ہیں کہ یہ اس وجہ سے تحریک کو چھوڑ کر چلا گیا۔ اگر ہم ذرا سی وسعت نظر سے کام لیں اور ایسے لوگوں کو اپنے بازوؤں کے اندر سمیٹنے کی کوشش کریں تو بہت سے لوگ جو پیچھے رہ جاتے ہیں' سست پڑ جاتے ہیں' یا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں' وہ ہمارے ساتھ چل سکتے ہیں۔

○ آخری مثال حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا واقعہ ہے جس کا اب شاید ہمارے لیے تصور کرنا بھی مشکل ہو۔ یہ وہ صحابی ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے موقع پر حضورؐ کی خفیہ تیاری کی اطلاع ایک خط کے ذریعے اہل مکہ کو کی۔ آپؐ کو اس بات کا علم وحی سے ہوا۔ آپؐ نے انھیں پکڑ کر بلوایا' مجلس بیٹھی اور وجہ پوچھی گئی۔ انھوں نے کہا کہ مکہ میں میرے خاندان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ دوسرے لوگ تو اپنے خاندان والوں کو بچالیں گے' انھیں بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ پھر میرے بتانے سے کیا ہونا تھا۔ آپؐ اللہ کے نبی ہیں۔ وہی ہوگا جو اللہ کو مقصود ہے۔

نبی کریمؐ نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ ان کا کیا جائے۔ صحابہؓ نے کہا یہ غداری کے مرتکب ہوئے ہیں' اس لیے ان کی گردن مارنی چاہیے۔ ظاہر ہے کسی بھی فوج اور قانون کے لحاظ سے یہ ایک ایکٹ آف ہائی ٹریژن تھا' انتہائی غداری کا اقدام تھا۔ آپؐ نے فرمایا: نہیں۔ یہ بدری صحابی ہیں۔ یہ غزوۂ بدر میں شریک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں شریک صحابہؓ کو ایک خاص نگاہ سے دیکھا ہے اس لیے میں ان کو معاف کرتا ہوں۔

میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اجتماعی زندگی میں کسی قسم کا کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ نبی کریمؐ کی زندگی میں وہ واقعات بھی ملتے ہیں جب حضورؐ نے تین افراد پر ۵۰ دن کا سوشل بائیکاٹ نافذ کیا۔ اگر یہ تین آدمی سچ نہ بولتے تو آپؐ ان پر سزا نافذ نہ کرتے۔ چونکہ ان لوگوں نے سچ بولا تھا اس لیے ان پر سزا نافذ کی گئی۔ اس میں بھی آپؐ کی پالیسی یہ تھی کہ اگر کوئی عذر پیش کرتا تھا تو آپؐ اس کا عذر قبول کر لیتے تھے۔ قرآن نے خود اس بات کا ذکر کیا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹)

(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمھارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو' ان کے حق میں دعاے مغفرت کرو' اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو' پھر جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو' اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔

○ یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ ایک صحابیؓ سے غلطی ہوئی اور انھوں نے اپنے آپ کو مسجد نبویؐ میں ایک ستون کے ساتھ باندھ لیا کہ جب تک میری توبہ قبول نہیں ہوگی' میں اپنے آپ کو نہیں کھولوں گا۔ حضورؐ نے کہا کہ اگر یہ میرے پاس آتے تو میں دعا کرتا اور اللہ انھیں معاف کر دیتا۔ اب چونکہ انھوں نے خود اپنے آپ کو باندھ لیا ہے' اس لیے جب تک اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول نہیں کرے گا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ صحابی کچھ دن تک بندھے رہے اور پھر اس کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی اور انھیں کھول دیا گیا۔ اب بھی مسجد نبویؐ میں وہ ستون موجود ہے جہاں انھوں نے اپنے آپ کو باندھا تھا۔ وہ ''ستونِ توبہ'' کہلاتا ہے۔

یہ تمام واقعات رحمت و شفقت اور عفو و درگزر کے بنیادی اصول پر مبنی ہیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا احتساب نہ کیا جائے' گرفتار نہ کیا جائے اور سزا نہ دی جائے؟ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کی بھی ضرورت ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ لیکن میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ سختی کے مقابلے میں نرمی' گرفت کرنے کے مقابلے میں معاف کر

دینا، درشتی کے مقابلے میں مسکراہٹ، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہمیشہ تحریک کو زیادہ مضبوط کریں گی۔ اس سے لوگ زیادہ جڑ کر رہیں گے، زیادہ قریب آئیں گے، زیادہ ساتھ چلیں گے۔ تھوڑی بہت خرابیاں ضرور ہوں گی لیکن وہ لوگ جو بڑے پختہ ہوتے ہیں، جن کی تربیت ہوئی ہوتی ہے، بڑی بڑی خرابیاں تو ان سے بھی سرزد ہوجاتی ہیں۔ اس لحاظ سے برداشت کر لینا تاکہ اس کے نتیجے میں لوگ جڑے رہیں، مل کر قوت بنیں، اور ہم اپنے مقصد تک پہنچیں، یہ زیادہ بہتر اور مفید ہے۔

قدر و قیمت کا احساس

دوسرا اصول یہ ہے کہ لوگوں سے نہ صرف رافت و رحمت اور شفقت اور عفو و درگزر کا برتاؤ ہو بلکہ ان کی قدر و قیمت بھی محسوس کی جائے اور انھیں حقیر نہ جانا جائے۔

دنیا میں جو انسان بھی آیا ہے اس کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی ضرور موجود ہوتی ہے۔ اگر ہم اپنے ہر کارکن کو اس نگاہ سے دیکھیں کہ اس کے اندر کوئی نہ کوئی اچھائی ضرور ہے تو اس سے کام کی بہت سی راہیں کھلتی ہیں۔ میرا اپنا تجربہ بھی یہی ہے کہ معمولی سے معمولی کارکن بھی اپنے اندر کوئی ایک صفت ضرور ایسی رکھتا ہے جس کی تعریف کی جاسکے اور جس سے آدمی متاثر ہو سکے۔ اگر ذمہ دار حضرات اپنے کارکنان کی خوبیوں پر نظر رکھیں تو وہ خود ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

یہ بات اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ دوسروں کو حقیر نہ جاننا دین کا ایک بڑا اہم اصول ہے۔

بحسب امرءٍ من الشَرِّ ان یَحقِرَ اخاہُ (حدیث)

آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے بھائی کو کم تر سمجھے۔

اپنے آپ کو برتر سمجھنا شیطان کا وطیرہ ہے۔ اس نے کہا تھا:

اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ (الاعراف ۷:۱۲)

میں اس سے بہتر ہوں۔

شیطان کی ساری شیطانی اسی میں تھی کہ اس نے کہا کہ میں حضرت آدمؑ سے بہتر ہوں۔ میں کیوں ان کو سجدہ کروں؟ اس لیے نافرمانی کی جڑ اللہ کی نافرمانی نہیں تھی بلکہ اپنی ذات کا کبر تھا۔ ''کبر'' بہت بڑی خرابیوں کو جنم دیتا ہے۔ لہٰذا ذمہ دار حضرات کو چاہیے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو کم تر نہ جانیں بلکہ اپنے سے بہتر ہی سمجھیں۔ یہ سوچیں کہ ہم ان کے خادم بنا دیے گئے ہیں' اب انھیں لے کر چلنا ہماری ذمہ داری ہے۔ ہمارا کوئی ساتھی خواہ کتنا ہی کمزور' ضعیف اور کم تر ہو' لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو' اچھی تقریر نہ کر سکتا ہو لیکن اس کے باوجود اس کے اندر کوئی نہ کوئی ایسی خوبی ضرور ہوتی ہے جس کی ہمیں قدر کرنا چاہیے۔ اس خوبی کو تلاش کرنا چاہیے اور اس کو ساتھ لے کر چلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

صلاحیتوں کو اُجاگر کرنا اور کام لینا

تیسرا اصول یہ ہے کہ ہمیشہ یہ سوچیں کہ ہمارا یہ کارکن کیا کر سکتا ہے' نہ یہ کہ یہ کیا نہیں کر سکتا۔

دوسرا اصول اگر کارکن کی روحانی اور اخلاقی حیثیت کے بارے میں ہے' تو تیسرا اصول اس کی صلاحیتوں کے بارے میں ہے۔ ہر آدمی کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔ کارکن جو کچھ کر سکتا ہو' اگر اس پر نگاہ رہے تو ذمہ دار حضرات جماعت کو مزید مضبوط اور ایک موثر قوت بنا دیں گے۔ اگر کارکنوں' ناظمین اور ذمہ داران کی خامیوں پر ہی نگاہ رہے گی کہ ان میں یہ یہ خامیاں ہیں تو اس سے تنظیم مزید کمزور ہو جائے گی۔ افراد سے جو کچھ کام لیا جا سکتا ہے وہ بھی نہ لیا جا سکے گا۔

احتساب کا عمل

یہاں ایک بار پھر احتساب کرنے کے حوالے سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا

احتساب کیا جانا چاہیے--- ضرور کیا جانا چاہیے۔ میں یہاں مجموعی طور پر تربیت کے بنیادی اصول اور مجموعی رجحانات بیان کر رہا ہوں۔

اگر آپ غور کریں کہ جب ہم اپنی ذات کو سامنے رکھتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کی اچھائیوں برائیوں اور خوبیوں خامیوں کو سامنے رکھتے ہیں تو ہمیشہ ہم اپنی تعریف سے خوش ہوتے ہیں۔ عام طور پر انسانوں میں یہی جذبہ پایا جاتا ہے' الا ماشاء اللہ اگر کوئی بہت پرہیز گار' صوفی اور متقی ہو تو اس کا معاملہ الگ ہے۔ ہر شخص کو اپنی تعریف سے اپنے دل میں خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری نگاہ میں اپنی خوبیاں زیادہ رہتی ہیں اور خامیاں کم۔ تنقید خواہ مبنی بر حقیقت ہو' اس سے ہمیں تکلیف ہوتی ہے۔ گویا ہم چاہتے ہیں کہ ہماری برائی کے اُوپر پردہ پڑا رہے۔ اگر ہم غلطی پر ہوں تو ہم چاہتے ہیں کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو کہا جاتا ہے کہ یہ کوئی بہت بڑی غلطی نہیں ہوئی۔ گویا ہم غلطی ہونے پر پہلے تاویل اور دفاع کرتے ہیں بجائے اس کے کہ اسے تسلیم کریں۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ غلطیوں' کوتاہیوں اور کمزوریوں پر جتنا الاؤنس ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں' اس سے زیادہ الاؤنس ہمیں دوسروں کو اور اپنے ساتھیوں کو دینا چاہیے۔ جتنی سختی سے ہم اپنے آپ کو پکڑتے ہیں' اس سے کہیں کم سختی سے ہمیں دوسروں کو پکڑنا چاہیے۔ عام روش یہ ہے کہ جتنی سختی سے ہم چاہتے ہیں کہ ہم کو پکڑا جائے' اس سے زیادہ سختی سے ہم دوسروں کو پکڑتے ہیں۔ غلطیوں پر جتنا الاؤنس ہم اپنے آپ کو دیتے ہیں' اس سے کم الاؤنس ہم دوسروں کو دیتے ہیں۔ ہم اپنی غلطیوں کے ساتھ تحریک میں رہنا چاہتے ہیں' اگر دوسرے غلطی کریں تو ہم چاہتے ہیں کہ انھیں نکال دیا جائے۔ ان دونوں کے درمیان ایک توازن کی ضرورت ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم ہر فتنے اور ہر گندی مچھلی کو برداشت ہی کرتے چلے جائیں۔ لیکن آخری حد تک یہی

کوشش ہونی چاہیے کہ فرد تحریک کے ساتھ جڑا رہے اور شفقت و محبت اور نرمی سے اس کی ممکنہ حد تک اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔ آخری چارۂ کار کے طور پر ہی حتمی اقدام کرنا چاہیے۔

اگر ذمہ داران حضرات اور قائدین ان تین اصولوں کو پیش نظر رکھیں اور ان کی روشنی میں باہمی تعلقات کو استوار کریں تو یہ تینوں اصول تحریکی کام کو آگے بڑھانے اور موثر انداز میں تربیت کے لیے مفید اور مدد و معاون ثابت ہوں گے۔ یہ تین اصول تمام معاملات میں بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قیادت کے معاملے میں قرآن مجید کی اس ایک آیت کو میں ماڈل سمجھتا ہوں جس میں فرمایا گیا:

> لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التوبہ ۹:۱۲۸)
>
> دیکھو! تم لوگوں کے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم ہی میں سے ہے، تمھارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے، تمھاری فلاح کا وہ حریص ہے، ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔

یعنی مومنین کی جماعت کو اگر کوئی تکلیف پہنچے تو وہ ان کے دل کو چبھتی ہے۔ ان کی ہر بھلائی کے لیے ان کی توجہ اور فکر حرص اور لالچ کی حد تک پہنچی ہوئی ہے اور ان کا سارا برتاؤ رافت و رحمت اور شفقت کا برتاؤ ہے۔ یہ آیت قیادت کے لیے ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ماڈل میں رہ کر ہم سیرت کے پورے واقعات سے نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ میں نے اس حوالے سے کچھ واقعات کو اخذ کر کے اپنی ایک کتاب اسلامی قیادت کی شکل میں مرتب کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس میں آپ ان چیزوں کو تفصیل کے ساتھ پا سکتے ہیں۔

تربیت کی عملی تدابیر

اب' جب کہ قیادت کے بنیادی اصول' باہمی تعلقات کے تین بنیادی اصول اور کام کرنے کا انداز بھی سامنے آ چکے ہیں' میں کچھ ایسی تدابیر اور اصول بیان کروں گا جن سے عملاً کام کرنے کے بارے میں رہنمائی مل سکے گی۔

سوچ سمجھ کر کام کرنا: تربیت کے لیے سب سے اہم چیز یہ ہے کہ کارکنان کے سپرد وہ کام کیے جائیں جو وہ جانتے ہوں کہ یہ کیوں کر رہے ہیں اور ان سے کیا نتائج نکلیں گے؟ اس سے ان میں نشوونما اور ارتقا ہوگا۔ اندھا دھند پیروی کرنے والے لوگ مل سکتے ہیں' کام بھی کریں گے' کارکن بھی بنیں گے لیکن اندھا دھند کام کرنے والے کی نشوونما اور ارتقا نہیں ہوتا۔ نشوونما اور ارتقا ہوتا ہی اس آدمی کا ہے جو یہ جان کر کام کر رہا ہو کہ وہ کیا کام کر رہا ہے' کیوں کر رہا ہے اور اس کے کیا نتائج نکلیں گے اور تحریک کو کیا حاصل ہوگا؟

اندھا دھند اطاعت کے مطالبے کا اگر کسی کو سب سے زیادہ حق حاصل ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس غرض کے لیے صرف اتنی بات ہی کافی ہے کہ یہ حکم اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے جہاں بھی احکامات دیے ہیں وہاں ان کی مصلحت اور افادیت بھی بیان کی ہے' یعنی اس سے تمھیں فلاح حاصل ہوگی' تم کامیاب ہو جاؤ گے وغیرہ وغیرہ۔ محض اتنا نہیں کہا کہ بس ایسا کرو بلکہ ہمیشہ ان کو تفصیل سے بیان کیا ہے' اس کے لیے ترغیب دی ہے' اُبھارا ہے اور انسپائر بھی کیا ہے' یہ بتا کر کہ ایسا کیوں کیا جائے اور اس سے تمھیں کیا فائدہ حاصل ہوگا۔

اسی طریقے سے ہم بھی جو کام کسی کے سپرد کریں خواہ وہ طلب جنت کا کام ہو یا نعرے لگانے' پوسٹر لگانے اور انتخابات میں کنویسنگ کا کام ہو' اگر وہ یہ جان کر کریں کہ ہم یہ کام کیوں کر رہے ہیں' ہم سے کیا مطلوب ہے اور کس لیے مطلوب ہے تو پھر یہ کام ان کے ارتقا و نشوونما کا ذریعہ بنے گا۔

صلاحیتوں کے مطابق کام لینا : مقاصد اور نتائج کے حوالے سے کام کرنے کے لحاظ سے دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر فرد اپنی جگہ ایک الگ شخصیت کا مالک ہے' لہٰذا سب کو ایک ہی قاعدے اور ضابطے کے تحت نہیں چلایا جا سکتا۔ بعض معاملات ضرور ایسے ہیں جو سب پر یکساں لاگو ہوں گے لیکن بعض معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا مطالبہ کرتے ہوئے تنظیم کو اپنے کارکنان کے لحاظ سے فرق کرنا چاہیے۔

اسلامی تحریک کی تنظیم کی حیثیت نبی کریمؐ کی جماعت کی سی نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات درست نہیں ہوگی کہ جو اس جماعت کے اندر ہے وہ مسلمان ہے اور جو جماعت سے باہر ہے وہ مسلمان نہیں ہے۔ یہاں اتنی وسعت نہیں ہوگی جتنی وسعت حضورؐ کی جماعت کے اندر تھی۔ اس لیے کہ آپؐ کے ہاں جماعت سے باہر ہونا کافر ہونا تھا اور جماعت کے اندر ہونا مسلمان ہونا تھا۔ ایک اسلامی تنظیم کی یہ حیثیت نہیں ہے۔ اس لیے وسعت کے لحاظ سے اس کا دائرہ نسبتاً محدود ہوگا۔

حضورؐ کی روش یہ تھی کہ جو مطالبات حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ سے تھے وہ ایک عام بدو سے نہیں تھے۔ ایک بدو نے آ کر پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: پانچ وقت کی نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج۔ اس نے کہا: میں اس میں کمی نہیں کروں گا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ جس نے جنتی کو دیکھنا ہے وہ اس کو دیکھ لے۔

ایک اور آدمی آیا اور اس نے کہا کہ مجھے قرآن پڑھنا سکھایئے۔ آپؐ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ انھیں قرآن پڑھایئے۔ انھوں نے سورۃ الزلزال کی تعلیم دی۔ اس کی آخری آیت ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ط وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ

(الزلزال ۹۹:۷-۸)

پھر جس نے ذرہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

اس نے کہا بس یہ میرے لیے کافی ہے۔ میں اس کے اوپر عمل کروں گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس نے جنتی کو دیکھنا ہے وہ اس کو دیکھ لے۔

یہ معاملات سب سے ایک جیسے نہیں تھے۔ مختلف لوگوں سے مختلف بیعت لی جاتی تھی۔ کچھ لوگوں سے یہ بیعت لی جاتی تھی کہ کسی سے سوال نہیں کریں گے' اور اگر گھوڑے سے ان کا کوڑا بھی گر جاتا تھا تو وہ اتر کر اسے اٹھاتے تھے۔ بعض لوگوں سے اس چیز پر بیعت لی جاتی تھی کہ وہ تلوار بھی اٹھائیں گے' اللہ کی راہ میں جان بھی دیں گے اور سب کچھ لٹا دیں گے' جیسے حضرت عمرؓ نے آدھا مال دیا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پورا مال دے دیا۔ مختلف افراد سے مختلف معاملہ ہوتا تھا۔

تحریک اسلامی میں اتنی وسعت تو نہیں ہے' تاہم یہ جماعت جہاد کے لیے تشکیل دی گئی ہے۔ اسی بیعت پر یہ جماعت قائم ہوئی ہے اور تنظیم بنائی گئی ہے۔ اس کے باوجود افراد کی صلاحیتوں اور استعداد کے پیش نظر کچھ نہ کچھ لچک اور وسعت ہوگی۔

مربوط انداز میں کام: جو بھی کام سامنے ہو اور جس فرد کو جو بھی کام سونپا جائے' اس کو مجموعی کام کے ساتھ مربوط رکھا جائے۔ مجموعی کام کا جائزہ حتمی نتائج کو پیش نظر رکھ کر لیا جائے۔

نتائج اور مقاصد کا معلوم ہونا' ان پر دل کا اطمینان ہونا' ان کا مجموعی کام کے ساتھ مربوط ہونا اور اس میں افراد کی صلاحیتوں کا لحاظ رکھنا' یہ ایک بڑا اہم اصول ہے۔

خود احتسابی: رپورٹ ضروری ہے' بالائی نظم کے سامنے جواب دہی بھی ضروری ہے۔ ہفتہ وار اجتماع کارکنان بھی ضروری ہے لیکن ان سب سے زیادہ چیز ارتقا کے لیے جو بات ضروری ہے وہ خود احتسابی ہے۔ آدمی خود اپنے نتائج کی ذمہ داری قبول کرے۔

اس لیے جہاں اس بات پر زور دینا چاہیے کہ لوگ رپورٹ فارم بھرتے اجتماع

کے اندر پیش کر دیں' وہاں یہ بات بھی جاننا چاہیے کہ رپورٹ کے نظام کی وجہ سے کچھ خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر اجتماعی معاملے میں جہاں کچھ خوبیاں اور بھلائیاں ہوتی ہیں' وہاں خامیاں اور کمزوریاں بھی ہوتی ہیں۔ نماز باجماعت جیسے مقدس فریضے میں بھی کچھ فائدے ہیں اور کچھ لحاظ سے کمی بھی واقع ہوتی ہے۔ نماز باجماعت میں انفرادی نماز کے مقابلے میں خشوع و خضوع میں کچھ کمی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کو لازم کیا گیا ہے' اس لیے کہ نماز باجماعت کے فوائد اس کے نقصانات سے زیادہ ہیں۔

اسی طرح ہم نے رپورٹ لازم کی ہے کیونکہ اس کے فوائد' نقصانات سے زیادہ ہیں لیکن نقصانات کا نگاہ میں رہنا بھی ضروری ہے۔ رپورٹ سسٹم کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی خود احتسابی کے بجائے رپورٹ کے فارم کو بھر کر اور اجتماع میں اسے پیش کرنے کو کافی سمجھنے لگتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جہاں آدمی کا اپنا ارتقا اور نشوونما رکنے لگتا ہے۔ رپورٹ سسٹم کو ختم نہیں کیا جانا چاہیے لیکن افراد اور ذمہ داران کو یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے کہ خود اپنے کام کے نتائج کی ذمہ داری قبول کریں اور اپنا احتساب خود کریں۔

موثر رابطہ: تیسرا اصول واسطہ' رابطہ یا موثر ابلاغ سے متعلق ہے' یعنی افراد سے موثر رابطہ اور تعلق ہو اور ان تک معلومات اور پیغام کا صحیح ابلاغ ہو۔

اس ضمن میں یہ بات معروف ہے کہ ہمارے درمیان اوپر سے' یعنی مرکز سے نیچے تک رابطہ ہونا چاہیے' گویا مرکز اگر ایک سرکلر جاری کرے تو وہ نیچے ہر سطح کے نظم تک اور عام کارکن تک پہنچے۔ اسی طرح ہدایات ایک دفتر سے دوسرے دفتر تک جائیں' ان پر عمل درآمد ہو اور اس طرح موثر رابطہ قائم کیا جائے۔ ایسا ہونا ضروری ہے لیکن اصل میں دوطرفہ رابطہ تحریک کو جان دار اور موثر بنانے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ یہ تربیت اور ارتقا کے لیے بھی ضروری ہے۔ اگر اوپر سے ہدایت آئے اور پھر کام کیا جائے تو لوگ اس بات کے انتظار میں رہتے ہیں' اور اس کے نتیجے میں کام اور تربیت میں کمی اور

رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا ذمہ داران کو یہ کوشش بھی کرنی چاہیے کہ نیچے سے اوپر' یعنی عام کارکن سے لے کر بالائی نظم تک بھی باہمی ربط ہو۔

موثر رابطے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حلقے کی سطح پر ایک عام کارکن کی سوچ بالائی نظم کی سطح تک پہنچے۔ کارکن کی یہ سوچ کہ تنظیم کیسی ہے؟ کیسی چل رہی ہے؟ قائدین کیسے ہیں اور ذمہ داران کیسے ہیں؟ عوام کیا سوچ رہے ہیں؟ یہ بات قائدین تک پہنچے اور اس سے وہ فائدہ اٹھائیں۔ ایک عام کارکن کے چھوٹے چھوٹے فقرے اگر ذمہ دار حضرات دلچسپی سے سنیں' اور ان سے سبق سیکھیں تو انھیں کافی حد تک اندازہ ہوسکتا ہے کہ پوری تنظیم کس نہج پر جارہی ہے۔ اگر وہ اپنے ہی گنبد کے اندر بند رہیں کہ نہیں ہم جو کچھ کر رہے ہیں' ٹھیک کر رہے ہیں' کارکن اِدھر اُدھر جو جملے بولتے پھر رہے ہیں' اس سے تحریک کے کام پر اثر پڑتا ہے۔ یہ مناسب رویہ نہیں۔ کارکن جو کچھ کہنا چاہیں وہ کہہ پائیں اور انھیں سنا جائے تو اس سے کارکردگی میں بہت فرق پڑ سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اگر وہ اپنے کارکنان سے کہیں کہ منصوبہ بندی تو ہوگی' اوپر سے ہدایات بھی آئیں گی لیکن آپ لوگ ہمیں ایک صفحے پر یہ لکھ کر دیں کہ آیندہ چھ ماہ میں آپ تحریک کے لیے کیا کرنا چاہتے ہیں' اور ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اس طرح نچلی سطح تک رابطے کی موثر صورت بن سکے گی' یعنی امیر صوبہ ناظم ڈویژن کو لکھے' وہ اپنے سے نیچے نظم کو لکھے۔ پورے ملک سے ایک وارڈ کی سطح تک کارکن کیا سوچتے ہیں' ان کے خیال میں کیا کیا جانا چاہیے' نظم کیا کرے' ناظمین و ذمہ داران کو کیا کرنا چاہیے' اور اس انداز کی بہت سی مفید باتیں اس طرح سامنے آسکتی ہیں' جس کے نتیجے میں ایک بہتر لائحہ عمل بن سکتا ہے۔ اوپر سے لے کر نیچے کی سطح تک موثر رابطے اور ہم آہنگی کے نتیجے میں لائحہ عمل پر موثر انداز میں عمل درآمد بھی ممکن ہوتا ہے۔ یہ رابطہ چونکہ دوطرفہ ہوگا' اس لیے بھی زیادہ موثر ہوگا۔

رابطے کی ایک صورت باہم ملاقات کرنا بھی ہے۔ ہماری یہ روایت ہونا چاہیے

کہ اگر کسی ساتھی کے بارے میں یہ رائے آئے کہ وہ کام صحیح طرح نہیں کر پا رہا ہے تو اس سے ذاتی ملاقات کی جائے اور اس کا مسئلہ معلوم کیا جائے۔ ملاقات کے اس طریقے کو موثر انداز میں اور بہتر طور پر بڑے پیمانے تک بھی پھیلایا جا سکتا ہے جس کے نتیجے میں کمیونی کیشن گیپ ختم ہو سکے گا' دوطرفہ موثر رابطہ قائم ہو سکے گا' نتیجتاً بہتر طور پر کام ہو سکے گا۔

تعریف اور حوصلہ افزائی : تعریف اور ہمت افزائی میں بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ہر انسان کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ اپنی تعریف سے خوش ہوتا ہے' اس کا حوصلہ بڑھتا ہے اور وہ مزید کام کرتا ہے۔

یہ سوچنا کہ اگر ہم نے زیادہ حوصلہ افزائی کر دی تو کہیں اس کا نفس فتنے میں نہ پڑ جائے' یہ کوئی اچھی روش نہیں ہے۔ اس کے نفس کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود کرے گا۔ اگر آپ محسوس کریں کہ کسی نے کوئی اچھا کام کیا ہے اور اس کے اچھے نتائج نکلے ہیں تو اس کی تعریف میں بخل سے کام نہ لیا جائے۔ نبی کریمؐ خود اپنے ساتھیوں کی دل کھول کر مدح کرتے تھے۔ جہاں کسی نے کوئی اچھا کام کیا' انفاق کیا' پورا مال لا کر دے دیا تو اس کے لیے دعا کی اور اسے اچھے اچھے خطابات سے نوازا۔

قرآن جہاں کمزوریوں پر تنقید کرتا تھا' جائزہ لیتا تھا' احتساب کرتا تھا' وہاں وہ تعریف بھی کرتا تھا۔ ایثار کا واقعہ پیش آیا تو آیات نازل ہوئیں اور قرآن نے خود انکشاف کیا:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ط (الحشر ۹:۵۹)

اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔

حضورؐ نے اس صحابیؓ کو بلا کر کہا کہ تمھاری شان میں یہ آیت اتری ہے۔ اسی طرح بہت سے اصحاب کے اچھے افعال کی شان میں اللہ تعالیٰ نے آسمان سے مدح نازل کی اور تعریف کی۔ وہاں کسی نے یہ نہیں کہا کہ کہیں ان کا نفس فتنے میں نہ پڑ جائے اور یہ کام

چھوڑ کر نہ بیٹھ جائیں۔ اگر صحیح طریقے سے تعریف اور حوصلہ افزائی کی جائے تو کام گھٹتا نہیں بلکہ بڑھتا ہے۔ اس لیے تعریف میں کنجوسی بہت بری کنجوسی ہے۔ جس طرح مال میں کنجوسی کی جاتی ہے اسی طرح تعریف و حوصلہ افزائی میں بھی کنجوسی کی جاتی ہے۔ کنجوسی برتنے کے بجائے محبت و فیاضی سے حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

کوتاھی کو تسلیم کرنا: ساتھیوں سے تعلقات کے دوران اگر کسی روش یا رویے سے کسی کارکن کو تکلیف پہنچ جائے تو اس سے بلاتکلف معافی مانگ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ طریقہ یہ ہونا چاہیے' اگرچہ یہ معلوم بھی ہو کہ میری غلطی نہیں ہے' کسی نے خواہ مخواہ سمجھ لیا ہے' اس کے باوجود پہلا قدم تاویل اور سمجھانے کے بجائے یہ ہو کہ اچھا بھائی! اگر میری کسی بات سے آپ کو تکلیف پہنچی ہے تو اس کا مجھے افسوس ہے' آپ معاف کر دیں۔

یہ کہنا کہ دراصل بات کچھ اس قسم کی تھی' ایسی نہیں تھی' اس کے بجائے یہ کہنا کہ آپ غلط سمجھے' بات یوں نہیں بلکہ یوں تھی' آپ کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچی--- یہ مناسب انداز نہیں۔ بہرحال تکلیف تو اس کو پہنچی۔ آدمی کے لیے حقیقت وہی ہوتی ہے جو وہ دیکھتا ہے۔

حضورؐ کا فرمان ہے کہ جس نے کسی کو خوشی پہنچائی اس نے مجھے خوشی پہنچائی۔ جس نے مجھے خوش کیا اس نے اللہ کو خوش کیا۔ اور جس نے مسلمان کو ایذا پہنچائی اس نے مجھے ایذا پہنچائی اور جس نے مجھے ایذا پہنچائی اس نے اللہ کو ایذا پہنچائی۔ لہٰذا بہتر انداز یہ ہے کہ پہلے قدم کے طور پر دکھ اور تکلیف کا ازالہ کیا جائے خواہ وہ کسی غلط فہمی کا ہی نتیجہ ہو۔ اس کے بعد وضاحت اور تاویل کی جائے جس سے اس کی غلط فہمی دُور ہو تو بہتر ہے۔

اگر اس ترتیب کو اُلٹ دیا جائے تو پوری کیفیت بدل جاتی ہے۔ اگر پہلا قدم وضاحت اور تاویل کا ہو کہ آپ کا یہ کام صحیح نہیں ہے' اور بعد میں کہا جائے کہ اچھا' اگر تکلیف پہنچ گئی ہو تو معاف کر دینا' تو اس ترتیب سے معاملے کا تاثر دوسرا ہو جاتا ہے۔

باتیں تو دونوں ہی کہنی ہیں' یعنی سمجھانا بھی ہے اور دکھ کا ازالہ بھی کرنا ہے۔ لیکن اگر دکھ کا ازالہ پہلے ہوگا تو دل نرم پڑ جائے گا' زخم مندمل ہو جائے گا' اس کے بعد جو وضاحت کی جائے گی وہ قابل قبول ہوگی اور دل بھی جڑا رہے گا بلکہ محبت پہلے سے زیادہ ہو جائے گی۔ اگر پہلا قدم تاویل اور وضاحت کا ہوگا' چونکہ دل پر چوٹ لگی ہوگی اس لیے وہ اُس تاویل کو بھی قبول نہ کرے گا جو کہ صحیح ہوگی۔ اس کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوتا ہے جو کسی نہ کسی ذمہ داری یا قیادت کے منصب پر رہا ہو۔

دعوت اور اخوت: آخری بات جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کا تذکرہ ضروری ہے' اور وہ ہے دعوت اور اخوت۔ ان دونوں کو آپ جتنا مضبوط کریں گے' اتنا ہی آپ کے سارے پروگراموں' تربیتی کیمپ' درس قرآن اور تقاریر کے مقابلے میں تربیت زیادہ ہوگی۔ اخوت اور باہمی تعلقات جتنے کمزور ہوں گے' اتنی ہی دعوت کمزور ہوگی اور اتنا ہی آپ کے تربیتی پروگرام' تربیت گاہیں خواہ سہ روزہ ہوں یا ۱۵ روزہ' وہ اثرات مرتب نہیں کر سکیں گے کہ جو کرنا چاہییں۔ اس لیے کہ دعوت و اخوت ہی وہ دو ستون ہیں جن کے اوپر تربیت و تزکیہ کا پورا نظام قائم ہے۔

یہاں جو اصول بیان کیے گئے ہیں وہ قرآن و حدیث سے اخذ کردہ ہیں اور میرے ذاتی تجربات کا نچوڑ بھی ہیں۔ یہ وہ اہم باتیں ہیں' اگرچہ سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں' جو اپنی اور دوسروں کی تربیت کرنے میں موثر ثابت ہو سکتی ہیں۔

تزکیہ نفس : بنیادیں

تذکیر یعنی یاد دلانا' تربیت وتزکیہ کے اہم اصولوں میں سے ہے۔ قرآن مجید نے تو اپنے آپ کو کہا ہی ذکر ہے۔ ذکر کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔

اگر آپ کی نیت صرف اللہ کی رضا کے حصول کے لیے خالص ہو' تو الفاظ کے جو دھارے آپ کے ذہن یا دل سے ٹکرائیں' محو ہو جائیں' نکل جائیں یا ٹھہر جائیں یا محفوظ ہو جائیں' کچھ بھی ہو' لیکن آپ کا اجر ضائع نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے ساری برکت حسن نیت میں رکھی ہے۔ اسے اس امر سے کوئی غرض نہیں ہے کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ اسے اصل دلچسپی نیت اور ارادے سے ہے۔ اس لیے اپنی نیت کو دل میں اور شعوری طور پر خالص کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اللہ کو خوش کرنے میں ناکام رہے' تو یہ خسارے کا سودا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کتاب اللہ پڑھنا کوئی مقصد نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہی اصل مقصد ہے۔

خلوص نیت سے کام کیا جائے تو چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی بڑی برکت ہوتی ہے' جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو آدمی اخلاص اختیار کرے اس کے لیے تھوڑا عمل بھی کافی ہوتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی خانہ کعبہ کی تعمیر ہے۔ دو آدمی تھے' چند پتھر تھے اور ایک بے آب و گیاہ وادی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اسے یہ قبولیت اور مرکزیت حاصل ہوگی کہ ۴ ہزار سال سے وہ ساری دنیا

کے لیے اللہ کی طرف رجوع کرنے اور اس کی بندگی کرنے کا مرکز بنا ہوا ہے۔ بیج بظاہر بہت چھوٹا سا ہو' مگر اس کے اندر اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے خالص جذبہ اور نیت کارفرما ہو تو اس کے اندر ایک تناور درخت پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہ بہت اہم بات ہے اور اس کی نصیحت' وصیت اور تذکیر بار بار کرنے کی ضرورت ہے۔

تزکیہ و تربیت کی ساری باتیں بے کار ہیں' اگر اس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ یہ بات اتنی معروف ہے کہ کہنے کی ضرورت نہیں' لیکن کہنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ہم ''تعلق باللہ'' کے بارے میں تو سب کچھ سیکھ لیں' لیکن ''تعلق باللہ'' ہی نہ سیکھ سکیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہمیں سمع و طاعت کے سارے اصول معلوم ہوں اور ان پر ہم فصیح و بلیغ تقریر بھی کرسکیں' لیکن سمع و طاعت کرنا ہی ہمیں نہ آئے۔ یہ عام مسائل ہیں جو جماعتی زندگی کے اندر پیش آتے ہیں۔ آپ کے سامنے ۱۰ باتیں آئیں' اور ان میں سے صرف ایک بات کے بارے میں آپ یہ عزم کرلیں کہ اسے اپنے عمل کا جزو بنائیں گے اور اس کو مستقل پابندی کے ساتھ کرنے لگیں تو اس کے اثرات عملاً آپ کی زندگی کے اوپر پڑنا شروع ہو جائیں گے۔ یہی اصل کامیابی ہے۔

تزکیہ نفس کے حوالے سے جو باتیں یہاں بیان کی جائیں گی' شاید سب پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔ کچھ باتیں علم میں اضافے کا سبب بنیں گی' کچھ سے جذبات متحرک ہوں گے' کچھ سے عزائم میں بلندی اور ولولہ پیدا ہوگا' لیکن کچھ چیزیں ایسی ضرور ہونی چاہییں جو آپ کے عمل کا جز بن سکیں۔

تزکیہ و دعوت کی بنیادیں

تزکیے کا عمل بڑا ہمہ گیر اور مسلسل عمل ہے۔ اس کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں' بالخصوص جب افراد مختلف ہوں' حالات مختلف ہوں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ہر فرد اپنی جگہ پر ایک مختلف جہان ہے۔ ایسے میں تزکیہ نفس کی تفصیلات اور جزئیات کو یاد رکھنا اور پھر ان

پر عمل کی کوشش کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اگر بنیادی رہنما اصولوں کے طور پر چند بنیادیں ہمارے سامنے رہیں تو یہ مشکل آسان ہوسکتی ہے۔ انسان کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ بہت سی فصیح و بلیغ باتوں میں سے کچھ کا اسے خلاصہ مل جائے تو وہ انھیں پکڑ لے۔ ایک شخص نبی کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: سارے دین کے مطالبات تو بہت لمبے چوڑے ہیں۔ آپؐ مجھے کوئی ایک چھوٹی سی بات بتایئے جو میں پکڑ لوں۔ آپؐ نے فرمایا: قل آمنت باللّٰہ فاستقم' کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا اور اس پر جم جاؤ۔

اگر بنیادیں اور سرچشمے معلوم ہوں تو اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے ڈوری کا سرا ہاتھ میں آجائے۔ ڈوری کا سرا ہاتھ میں نہ ہو تو گرہ پہ گرہ پڑتی چلی جاتی ہے' اور ڈوری سلجھنے میں نہیں آتی۔ اگر سرا ہاتھ میں ہو تو جہاں گرہ پڑے وہیں سرے سے شروع کر دیا جائے تو گرہ کھل جاتی ہے۔ اسی طرح اگر بنیاد معلوم ہو تو کوششوں کا رخ صحیح سمت میں رہتا ہے اور کام بھی صحیح ہوتا ہے۔ اگر یہ بنیادیں ہمیشہ نظروں میں رہیں تو کوششیں بھی بارآور ہوتی ہیں۔

یہ سوال شاید ذہن میں پیدا ہو کہ میں نے تزکیہ اور دعوت' دونوں کو یک جا کیوں کر دیا ہے؟ یہ میں نے اس لیے کیا ہے کہ ان دونوں کی تفریق ہمارے ذہنوں میں راسخ ہو چکی ہے' جب کہ میرے خیال میں یہ دونوں دراصل ایک ہی عمل کے دو پہلو ہیں۔ دعوت میں بھی ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان دعوت کو قبول کرے اور بہتر انسان بنے اور کارِ دعوت میں شریک ہو۔ یہ تزکیے کا عمل ہے اور تزکیے کے عمل میں بھی یہ بات شامل ہے کہ دوسروں کو دعوت دی جائے' لیکن عمل تو تب ہی ہوگا جب کوئی عمل کرنا چاہے گا۔ اگر کوئی عمل نہ کرنا چاہے' تو کوئی دوسرا اس کی جگہ عمل نہیں کرسکتا۔ لہٰذا برائی یا بھلائی' سب کا منبع دعوت ہے۔ شیطان کا بھی انسان پر یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ زبردستی اس سے کوئی برا کام کروا سکے۔ اس کا اختیار دعوت اور ترغیب تک محدود ہے۔

قیامت کے روز شیطان یہ کہے گا:

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ (ابراھیم ۱۴ : ۲۲)

میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں' میں نے اس کے سوا کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تم کو دعوت دی اور تم نے میری دعوت پر لبیک کہا' اب مجھے ملامت نہ کرو' اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔

یعنی میں نے تم کو دعوت دی' تم نے میری دعوت قبول کر لی۔ اس لیے دونوں ایک ہی عمل کے دو پہلو ہیں۔ تزکیے کا کام دراصل دعوت کا کام ہے' اور دعوت کا ماحاصل یہ ہے کہ جو لوگ ہماری بات سنیں' ان کا تزکیہ ہو۔ اسی لیے انبیاے کرام کے فرائض کو جب بیان کیا گیا تو اسی طرح کیا گیا کہ وہ آیات کی تلاوت کرتے ہیں' کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور لوگوں کے نفوس کا تزکیہ کرتے ہیں۔

۱- تزکیہ کا مرکز : قلب

تزکیہ و دعوت کی بنیادوں میں سے سب سے پہلی بنیاد یہ ہے کہ اس سارے عمل کا سرچشمہ' محل اور مرکز انسان کا قلب اور دل ہے۔ اس کے اچھے یا برے ہونے کا انحصار اس بات پر نہیں ہے کہ بظاہر وہ کیا سنتا ہے؟ اور کیا کرتا ہے؟ بلکہ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کے دل کی کیفیت اور حالت کیا ہے۔ یہ وہ بات ہے جو نبی کریمؐ نے اپنے ایک ارشاد میں بہت واضح طور پر بیان کی ہے:

اَلَا اِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلَحَتْ' صَلَحَتِ الْجَسَدَ كُلُّهٗ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَتِ الْجَسَدَ كُلُّهٗ ' اَلَا وَهِيَ الْقَلْب (بخاری)

اچھی طرح سن لو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے' اگر یہ سدھر جائے تو سارے کا سارا انسان سدھر جاتا ہے اور اگر یہ بگڑ جائے تو سارے کا سارا انسان بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ لوتھڑا یہ دل ہے (اور آپ نے

سینے کی طرف اشارہ کیا)۔

ظاہر ہے کہ اس سے مراد وہ لوتھڑا نہیں ہے جو جسم کے اندر خون کو پمپ کرتا ہے اور اسے جسم کے گوشے گوشے تک پہنچاتا ہے' بلکہ یہاں قلب کے معنی شخصیت کے اس مرکز کے ہیں جہاں انسان کی خواہشات' اس کی تمنائیں' اس کے ارادے' اس کے عزائم' پسند و ناپسند' تحرکات و محرکات' یہ سب نکلتے اور اُمنڈتے ہیں اور اپنا مسکن بناتے ہیں۔ اس مرکز و منبع کا نام ہے: قلب۔ ان معنوں میں دراصل یہی انسان کی پوری شخصیت ہے' ظاہری جسم نہیں بلکہ اندرونی شخصیت۔ انگریزی میں اس کے لیے inner person کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ ایک outer person ہے جو انسان کا ظاہری جسم ہے' جو دکھائی دیتا ہے اور خاک میں ملنے والا ہے۔ inner person اندر سے حکومت کرتا ہے' جس کے کہنے پر زندگی کا رخ متعین ہوتا ہے اور معاملات آگے بڑھتے ہیں۔ دراصل ''قلب'' کی اصطلاح قرآن کی اصطلاح ہے۔ قرآن نے اس کو بڑی کثرت کے ساتھ استعمال کیا ہے اور اس بات کو واضح کیا ہے کہ پوری شخصیت کے لیے قلب کیوں اہمیت رکھتا ہے۔ دراصل اس کی حیثیت بنیاد کی ہے۔

قلب کی اہمیت

آخرت میں اللہ تعالیٰ نے جس چیز پر کامیابی اور نجات کا وعدہ فرمایا ہے' وہ اعمال سے پہلے ''قلب'' ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

وَلَا تُخْزِنِیْ یَوْمَ یُبْعَثُوْنَ o یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ o اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ o (الشعرا ۲۶:۸۷-۸۹)

اور مجھے اس دن رسوا نہ کر' جب کہ سب لوگ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے' جب کہ نہ مال کوئی فائدہ دے گا نہ اولاد' بجز اس کے کہ کوئی شخص قلب سلیم لیے ہوئے اللہ کے حضور حاضر ہو۔

''سلیم'' کے معنی ہیں' ایسا قلب جو سالم اور صحت مند ہو' یک جان ہو' جس کے اندر کوئی شگاف نہ ہو۔ جو ایسا قلب لے کر آئے گا وہ اللہ کے عذاب سے نجات پائے گا۔ اسی طرح جہاں جنت کا وعدہ فرمایا گیا وہاں بھی یہ فرمایا گیا:

هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ ○ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ○ (ق ۵۰: ۳۲-۳۳)

ارشاد ہوگا: یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا' ہر اس شخص کے لیے جو بہت رجوع کرنے والا اور بڑی نگہداشت کرنے والا تھا' جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا' اور جو دلِ گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے۔

ان ساری صفات میں کہیں بھی ظاہری صفات کی علامات نہیں ملتی ہیں بلکہ یہ سب کام' خواہ حفاظت کرنا ہو یا بار بار لوٹنا ہو' خشیت ہو یا انابت' سب قلب کے کام ہیں اور اسی پر نجات کا انحصار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جگہ جگہ اسی بات پر مواخذہ کیا گیا ہے اور اسی پر اجر کا وعدہ بھی کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک جگہ فرمایا گیا کہ جو لوگ لغو قسمیں کھاتے ہیں' اللہ تعالیٰ انھیں ان قسموں پر نہیں پکڑتا بلکہ سچے دل سے کھائی جانے والی قسم پر گرفت ہے:

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ط (البقرہ ۲: ۲۲۵)

مگر جو قسمیں تم سچے دل سے کھاتے ہو' ان پر باز پرس وہ ضرور کرے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان و تقویٰ کے لیے بھی اصل مسکن دل کو قرار دیا ہے' ظاہری اعمال کو نہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ دراصل وہی ایمان و تقویٰ قابل اعتبار ہے جو' دل میں' جگہ بنالے' زندگی میں اس کے جتنے بھی مظاہر نظر آئیں وہ قابل اعتبار نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ مت کہو کہ تم ایمان لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم نے اطاعت قبول کرلی' اعمال اختیار کرلیے۔

قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْآ اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ

قُلُوْبِكُمْ ؕ (الحجرات ۴۹: ۱۴)

ان سے کہو' تم ایمان نہیں لائے' بلکہ یوں کہو کہ ''ہم مطیع ہو گئے''۔ ایمان ابھی تمھارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔

دراصل ایمان تو وہ ہے جسے ہم تمھارے لیے محبوب بنا دیں اور جس کو ہم تمھارے دلوں کے اندر مزین کر دیں۔ تقویٰ کے لیے بھی یہ فرمایا ہے:

اِنَّ الَّـذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰی ؕ (الحجرات ۴۹: ۳)

جو لوگ رسولؐ خدا کے حضور بات کرتے ہوئے اپنی آواز پست رکھتے ہیں وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس میں آپؐ نے اپنے دل کی طرف تین دفعہ اشارہ کیا اور فرمایا: التقوی ھٰھنا ' التقوی ھٰھنا ' التقویٰ ھٰھنا ' یعنی تقویٰ یہاں ہے۔ یہی دراصل ایمان و تقویٰ کا معاملہ ہے۔

دل ہی سارے امراض کی جڑ ہے۔ ہم ظاہری اعمال دیکھ کر گھبراتے بھی ہیں' پریشان بھی ہوتے ہیں اور ان سے نفرت بھی کرتے ہیں اور اصلاح کی کوششیں بھی کرتے ہیں لیکن ان ساری گرہوں کا سرا دل کے اندر ہے۔ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ (البقرہ ۲: ۱۰) ''ان کے دلوں میں مرض ہے''۔ جتنے بھی نفاق کے امراض ہیں' ان کی جڑ دل کے اندر ہوتی ہے۔ اگر آدمی سوچنے سمجھنے سے انکار کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ دماغ سے عاری ہوتا ہے' یا اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں' یا اس کے کان سننے سے انکار کرتے ہیں' بلکہ سینوں کے اندر جو دل ہیں وہ اندھے ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے سب سے بڑھ کر اس بات کی دعا کی گئی ہے کہ اللہ دلوں کو کجی سے' ٹیڑھ سے اور خراب ہونے سے بچائے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا (اٰل عمرٰن ۳: ۸) ''پروردگار' جب تو ہمیں سیدھے رستہ پر لگا چکا ہے' تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا

نہ کر دیجیو''۔ اس کے بعد کہ وہ ہدایت کی نعمت سے سرفراز ہو چکے ہوں۔

دو اہم سوال

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: ایک یہ کہ کیا اعمال بے حقیقت اور بے معنی ہیں؟ جیسا کہ بہت سے صوفیا کرام کا یہ کہنا تھا کہ نماز یا زکوۃ سے کیا ہوتا ہے' اصل چیز تو دل ہے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ہم صرف فرد کی اصلاح کریں اور نظام کی اصلاح چھوڑ دیں؟ یہ دونوں سوالات اسلام میں بھی اور دنیا کی دیگر اجتماعیتوں اور تحریکوں میں بھی بہت بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ عمل اور دل ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ عمل کا اثر دل کے اوپر پڑتا ہے جس کے نتیجے میں دل کے اندر پائے جانے والے بیج کے اثرات برگ و بار کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں اول اور بعد' اہم اور غیر اہم کی بحث اسلام کی نظر میں بالکل فضول اور بے کار بحث ہے۔ اس تفریق کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے کہ یہ زیادہ اہم چیز ہے اور دوسری کم اہم۔

اس کی مثالیں ہمیں ان احادیث میں ملتی ہیں جن میں ان دونوں کے تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جب انسان گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے۔ گویا اعمال کا اثر اس کی زندگی کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ اگر وہ استغفار کرتا ہے تو داغ دھل جاتا ہے اور اگر نہیں کرتا تو داغ جمع ہوتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ پورا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (المطففین ۸۳:۱۴) ''ہرگز نہیں' بلکہ دراصل ان لوگوں کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے''۔ (مسند احمد' ترمذی)

اسی طرح ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مومن اگر گناہ کرتا ہے' مثلاً چوری کرتا ہے' جھوٹ بولتا ہے یا زنا کرتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس کے دل سے

نکل کر باہر معلق ہو جاتا ہے اور جب وہ توبہ کرتا ہے تو پھر ایمان دوبارہ واپس آ جاتا ہے۔ اس طرح سے بہت سی احادیث ہیں جن کی تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں ہے جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعمال اور قلب کا آپس میں گہرا تعلق ہے' جن کو الگ کر کے آدمی یہ نہیں سوچ سکتا کہ عمل کی کوئی حیثیت نہیں' اور اصل چیز دل ہے۔

جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ دل کی فکر کیے بغیر صرف عمل کی فکر کبھی بارآور نہیں ہوتی۔ اگر ہم تمام کوششوں میں اس کو مرکزی حیثیت نہیں دیں گے' مسلسل نگاہ نہیں رکھیں گے اور آغاز اس بات سے نہیں کریں گے' تو ہم اپنی اور اپنے ساتھیوں کی اصلاح کی جو بھی کوششیں کریں گے وہ بہت زیادہ بارآور نہیں ہوں گی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ فرد اور نظام کی اصلاح میں کیا تعلق ہے؟ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم افراد کے قلوب کا تزکیہ کرتے ہیں' جیسا کہ بہت سارے لوگ کرتے ہیں' تو کیا نظام لازماً بدل جائے گا؟

اگر آپ قرآن مجید کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ دلوں کی سختی کا سب سے بڑا سبب نقض میثاق (اللہ کے عہد کی نافرمانی) ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ (المائدہ ۵:۱۳)

یہ ان کا اپنے عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دُور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیے۔

نظام بدلنے کا کام اللہ سے عہد کی تکمیل ہے۔ اُمت کا اسی بات پر اللہ سے میثاق (پختہ عہد) ہے۔ یہی اس امت کا مشن ہے۔ اگر وہ یہ سمجھے کہ اس سے لاپروائی برت کے صرف افراد کے تزکیے سے ان کے دل نرم پڑ جائیں گے اور نظام بدل جائے گا' تو یہ سراسر غلط فہمی ہے۔

یہاں وہ بات یاد رکھنے کی ہے جو سید احمد شہیدؒ کے ساتھ پیش آئی تھی۔ انھوں نے ایک عرصے تک اپنے ساتھیوں کی ذکر' اذکار' تہجد اور نوافل کے ذریعے تربیت کی۔

اس کے بعد جب انھوں نے جہاد کا فیصلہ کیا تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اب تم گھوڑوں کی مالش کرو' تلوار چلانا سیکھو اور ورزش کرو۔ اس پر لوگوں نے کہا: حضرت' وہ نور جو ہم پہلے محسوس کرتے تھے' وہ اب نہیں پایا جاتا۔ انھوں نے کہا: یہ سب کچھ تو اسی لیے تھا کہ جہاد کیا جائے۔ اس لیے قلوب کا تزکیہ اور نظام کی تبدیلی دونوں باہم مربوط ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی واضح کیا ہے کہ صبر اور آزمایش کی جو بھٹی سلگائی جاتی ہے اس کا مقصد بھی اندر کے آدمی کی آزمایش ہے' یعنی اس کے دل کی آزمایش و صفائی' پاکیزگی اور تعمیر۔

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۴)

یہ تو اس لیے تھا کہ جو کچھ تمھارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمالے اور جو کھوٹ تمھارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے۔

زندہ دل' زندگی کی علامت ہے اور مردہ دل' موت کی علامت ہے' خواہ انسان کا جسم کسی حیثیت میں اور کسی کیفیت کے اندر ہو۔ اسی لیے یہ بات بھی ضروری ہے کہ کوششوں کے اندر فروعیات اور جزئیات سے زیادہ زور اس بات پر ہو کہ وہ اصولی چیزیں جن سے دل کو زندگی ملتی ہے' دل کے اندر حرارت پیدا ہوتی ہے اور دل کی قوت و صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی استعداد بڑھتی ہے' اس کی فکر ہم پہلے کریں۔ جب یہ ہو جائے گا تو باقی چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔

تحریکوں اور جماعتوں کے اندر عام طور پر یہ خرابی پیدا ہوتی ہے کہ جب وہ اپنا کام شروع کرتی ہیں تو ان کا زور بنیادی چیزوں پر ہوتا ہے۔ جب آہستہ آہستہ وقت گزرتا چلا جاتا ہے تو بنیادی چیزیں زبان پر تو رہ جاتی ہیں لیکن فروعیات اور جزئیات کا اہتمام بڑھتا جاتا ہے۔ فروعیات اور جزئیات ضروری ہیں لیکن اصل توجہ' کوشش اور سعی ہمیشہ اس چیز پر مرکوز ہونی چاہیے جو انسان کی پوری شخصیت کا مرکز ہے' یعنی دل۔ اس کی زندگی' صحت' تندرستی اور قوت و استعداد میں اضافے کا بندوبست کیا جائے اور اسی کے

لیے زیادہ کوششیں صرف ہوں۔

۲- ارادہ و عزم

دوسری بنیاد یہ ہے کہ جب تک انسان کا ارادہ اور عزم نہ ہو' اس وقت تک وہ تربیت و تزکیے کا یا دعوت کا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ ارادے کی تعریف کیا ہے اور یہ لفظ میں نے کہاں سے لیا ہے؟ ارادے کی تعریف دراصل یہ ہے کہ کسی چیز کو اپنا مطلوب و مقصود بنانے کا فیصلہ کرنا اور اس کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنے کا بھی فیصلہ کرنا' اور اس پر دل کا جم جانا۔ یہ ارادہ ہے۔ جب یہ ارادہ پختہ ہو جائے تو یہ عزم ہے۔

انسان کی ساری خرابیوں کی جڑ دو چیزیں ہیں۔ ایک' اس کا بھولنا اور غفلت اور دوسرے' اس کے ارادے کی کمزوری۔ یہ دونوں باتیں اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدمؑ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے انسان پر واضح کر دیں۔ فرمایا کہ ہم نے آدمؑ کو ایک عہد اور ذمہ داری سپرد کی۔ مگر آدمؑ بھول گئے اور ہم نے ان کے اندر ارادے کی پختگی نہیں پائی۔

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝ (طٰہٰ ۲۰:۱۱۵)

ہم نے اس سے پہلے آدمؑ کو حکم دیا تھا' مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔

اگر آپ اپنا اور اپنے ساتھیوں کا جائزہ لے کر دیکھیں تو یہی وہ دو چیزیں یا روگ یا بیماریاں ہیں جو ہمارے ساتھ لگی رہتی ہیں۔ ہمیں سب کچھ معلوم ہے مگر جب وقت آتا ہے' تو ہم کو یاد نہیں رہتا۔ دل کے اندر سب خواہشات موجود ہیں لیکن خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جس عزم کی ضرورت ہے' وہ عزم مفقود ہے۔ جب تک ارادے اور عزم کی مضبوطی کی فکر نہ کی جائے اس وقت تک تقریریں اور گفتگوئیں فائدہ نہیں دے سکتیں۔

قرآن مجید میں بھی عزم و ارادے کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے:

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷:۱۹)

اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے' اور ہو وہ مومن' تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔

یعنی جس نے آخرت کا ارادہ کیا' آخرت کو اپنی منزل مقصود ٹھہرایا اور اس کے لیے کوشش کا فیصلہ کر لیا اور پھر اس کے لیے کوشش بھی کی' تو اس کی کوشش کی قدر کی جائے گی۔ وہ اس کا پھل پا کر رہے گا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے آخرت کو منزل بنانے کے لیے ارادے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ارادے سے مراد وہ پختہ فیصلہ ہے جسے ہم ''عزم'' کہتے ہیں۔

اگر یہ ارادہ و عزم نہ ہو تو تزکیہ' دعوت اور تحریک کی راہ میں جو موانعات' مشکلات اور رکاوٹیں ہیں' نہ ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس راہ میں مسلسل عمل اور کوشش ہی کی جا سکتی ہے۔

ارادے اور خواهش میں فرق: ایک اہم بات یہ ہے کہ ارادے اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ ہم عام طور پر خواہش کو ارادے کا درجہ دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ صرف خواہش کرنا ہی کافی ہے۔ لوگ یہ بات کرتے ہیں کہ ''میری بڑی خواہش تھی''، ''میں تو بہت چاہتا تھا کہ یہ ہو جائے''، ''میں نے بہت ارادہ کیا لیکن نہ ہو سکا'' اور اسی قسم کی دوسری باتیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ واقعی ارادہ ہو اور نہ ہو سکے لیکن بالعموم یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دل میں پیدا ہونے والے ایک خیال اور خواہش کو ارادہ سمجھنے لگتا ہے' حالانکہ ارادے کا لفظ اس سے کہیں زیادہ مضبوط اور وسیع لفظ ہے۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ کسی چیز کو حاصل کرنے کا شعوری فیصلہ' ارادے اور عزم میں شامل ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ صبر' تقویٰ اور عفو جیسی اہم صفات کے لیے عزم کا لفظ استعمال کیا ہے جن کے لیے بڑی ہمت اور ضبط نفس' استعداد اور پختگی کی ضرورت ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ صوفیا کرام جنھوں نے تزکیے کو ہی اپنا موضوع بنایا ہے' انھوں نے بھی اپنی اصطلاحات میں ارادے کے لفظ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''مرید'' کا لفظ اپنایا ہے۔ ''مرید'' کے معنی محض پیرو کے نہیں ہے بلکہ اس شخص کے ہیں جو کسی راستے پر چلنے کے لیے مصمم ارادہ اور عزم کرے اور پیر کے پیچھے چلے۔ لہٰذا ارادے کا لفظ قرآن مجید سے ہی ماخوذ ہے جس کے معنی عزم مصمم کے ہیں۔ انگریزی میں اسے will power اور determination کہتے ہیں۔

ارادے کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جب آدمی کوئی ارادہ کرے تو یہ بھی طے کرے کہ یہ ارادہ عملی جامہ کس طرح پہنے گا۔ اگر آدمی ارادہ کرتا ہے اور یہ طے نہیں کرتا کہ وہ اس کو عملی جامہ کس طرح پہنائے گا' تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ پھر اس ارادے کی حیثیت صرف ایک خواہش کی ہو کر رہ جائے گی۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے' اس لیے کہ انسان کے ارادے کمزور ہوتے ہیں اور وہ ٹوٹ سکتے ہیں' لیکن اگر آدمی اس بات پر غور ہی نہ کرے' سوچے ہی نہ کہ یہ ارادہ عملی جامہ کیسے پہنے گا' تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سنجیدہ (serious) نہیں ہے بلکہ اس نے صرف ایک خواہش کو ارادے کا درجہ دے دیا ہے۔

اسی طرح اجتماعی فیصلے خواہ وہ شوریٰ کے ہوں یا کسی بھی سطح کے' جو صرف فیصلے ہوتے ہیں لیکن یہ نہیں سوچا جاتا کہ ان پر عمل درآمد کیسے ہوگا' ان کی حیثیت بھی خواہشات سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی۔ بالآخر یہ تمام فیصلے فائلوں کی زینت بنے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح انسانوں کی خواہشات بھی ان کے دل کی دنیا کی زینت بنی رہ جاتی ہیں۔ وہ عمل کی دنیا میں ظہور پذیر نہیں ہوتیں۔

اگر ارادہ اور عزم ہو تو پھر اس کے ساتھ انتظار کی کیفیت کا مسئلہ بھی ہوتا ہے' یعنی یہ کہنا کہ ''آج نہیں' کل کریں گے''۔ اسے قرآن نے ''تربص'' کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح نتائج کا انتظار کرنا کہ دیکھتے ہیں کیا نتیجہ سامنے آتا ہے؟ اچھا ہوگا تو

ساتھ دیں گے' برا ہوگا تو ساتھ نہیں دیں گے' ''ریب'' یعنی شک و شبہ میں پڑنا کہ آیا یہ ہوگا یا نہیں ہوگا--- یہ تمام کمزوریاں اور بیماریاں نفاق کی علامت ہیں جو ارادے اور عزم کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔ ارادے میں' اپنی منزل (goal) اور مقصد کا شعور' اس کے حصول کے لیے فیصلہ اور اس پر دل کا جم جانا' یہ سب چیزیں شامل ہیں۔

۳- نتیجہ نہیں کوشش

تزکیہ و دعوت کی تیسری بنیاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو مطلوب' عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ نتیجے کے حصول کے لیے کوشش ہے جسے قرآن نے ''سعی'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ ''سعی'' کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کا ارادہ کیا گیا ہو' اس کے حصول کے لیے کوشش شروع کر دی جائے۔ درحقیقت یہ کوشش ہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب و مقصود ہے۔

کوشش یا ''سعی'' میں دو باتیں شامل ہیں' اور دونوں باتیں اگرچہ بہ ظاہر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہیں لیکن دونوں مل کر ہی کوشش کے عمل کو صحیح معیار پر لے کر جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ جس چیز کا آدمی نے ارادہ کیا ہے' اس کے مطابق کوشش کرنے کا جو حق ہے' وہ اس کی کوشش کرے۔ اگر اللہ کی راہ میں جہاد کا ارادہ کیا گیا ہے تو فرمایا گیا ہے: وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ (الحج ۲۲: ۷۸) ''اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے''، یعنی جہاد کرنے کے جو تقاضے ہیں' ان کے لیے جو کوشش درکار ہے' اس حد تک کوشش کی جائے۔ اگر آخرت کا ارادہ کیا ہے تو فرمایا:

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۹)

جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے' اور ہو وہ مومن' تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔

یعنی اس کی کوشش مقبول ہوگی--- یہ نہیں کہا کہ اس کوشش میں وہ کتنا کامیاب ہوا۔ اللہ

کے ہاں کامیابی یا ناکامی کا انحصار نتیجے پر نہیں ہے بلکہ اس بات پر ہے کہ آیا کوشش جیسی کہ کی جانی چاہیے تھی' کی گئی یا نہیں!

لہٰذا مطلوب کے لحاظ سے کوشش کو ڈھالنا یا کوشش کرنا' کوشش کو بلندی کی طرف لے کر جانا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے--- تاکہ آدمی مایوسی سے بچے--- کہ وہ اتنی ہی کوشش کر سکتا ہے جتنی اللہ تعالیٰ نے اس کو استطاعت دی ہے۔

اگر ایک طرف یہ فرمایا گیا ہے: اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۲) ''اللہ سے تقویٰ کرو جیسا کہ تقویٰ کرنے کا حق ہے'' تو دوسری طرف یہ بھی فرمایا گیا ہے: فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن ۶۴:۱۶) ''جہاں تک تمھارے بس میں ہو اللہ سے تقویٰ اختیار کرو' یعنی جتنی تمھاری استطاعت ہو' یا یہ فرمایا: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط (البقرہ ۲:۲۸۶) ''اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہیں ڈالتا''۔

کوشش کا معیار: یہ بات اچھی طرح سے سمجھنے کی ہے--- اور اس کے نتیجے میں آپ اپنے بارے میں اور اپنے ساتھیوں کے حوالے سے بھی صحیح نقطۂ نظر اختیار کر سکیں گے--- کہ سعی کے اندر یہ بات شامل نہیں ہے کہ نتیجہ لازماً حاصل ہو' آپ یقیناً معیار مطلوب تک پہنچیں اور آپ کا عمل لازماً پایۂ تکمیل تک پہنچے۔ سعی کے معنی یہ ہیں کہ ارادہ مضبوط ہو' عمل کا اہتمام ہو اور بھرپور کوشش ہو۔ اس کے بعد ایک فرد کا کام' کم سے کم آخرت کے نقطۂ نظر سے' ختم ہو گیا۔ اس میں اس بات کا کوئی دخل نہیں ہے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں؟ بلکہ بعض دفعہ کوشش کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آدمی سب سے آگے بڑھ کر کام سنبھالے اور اپنے آپ کو اس کام میں لگا دے۔

ایک سبق جو مجھے بہت شروع میں ملا اور جس کو میں نے ہمیشہ یاد رکھا' آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ جب میں بہت چھوٹا تھا تو اپنی اردو کی کتاب میں ایک نظم پڑھی: ''بارش

کا پہلا قطرہ''۔ اس میں شاعر نے بہت تفصیل سے نقشہ کھینچا تھا کہ دھرتی پیاسی ہے' جانور پیاسے ہیں' مہینوں سے بارش نہیں ہوئی ہے' نہریں اور کنویں خشک ہو چکے ہیں' آسمان پر گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے اور کروڑوں ٹن پانی فضا میں تیر رہا ہے لیکن بارش نہیں ہو رہی۔ پانی کا ہر قطرہ یہ سوچتا ہے کہ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں' اتنے سارے جانور' انسان' زمین اور کھیتیاں پیاسے ہیں' مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں ہے کہ میں ان سب کو سیراب کر سکوں۔ چنانچہ بارش نہیں ہوتی۔ پھر اچانک ایک قطرہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ جتنی میری استطاعت ہے' میں اس حد تک اپنا فرض ادا کر دوں۔ چنانچہ وہ کود پڑتا ہے۔ اس کے پیچھے دوسرے قطرے کود پڑتے ہیں اور اس طرح سے قطروں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ یوں ساری زمین سیراب ہوگئی۔

پس سعی یا کوشش کے ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے آگے بڑھ جانا' بس یہی کوشش کا معیار ہے۔ اس کے بعد نتیجہ اور تکمیل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کوشش کرتے ہوئے مشکلات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس بات کی وضاحت ایک حکایت سے بخوبی ہوتی ہے۔

کسی شخص سے خواب میں کہا گیا کہ صبح جب تم گھر سے نکلنا تو جو سب سے پہلی چیز تمھیں نظر آئے اسے تم اٹھا کر کھا لینا۔ چنانچہ وہ گھر سے نکلا اور نکلتے ہی جس چیز پر سب سے پہلے اس کی نظر پڑی' تو وہ ایک پہاڑی تھی۔ اس نے سوچا کہ میں یہ پہاڑی اپنے منہ میں کیسے رکھ سکتا ہوں؟ کسی نے کہا کہ تم کوشش شروع کرو اور آگے بڑھتے جاؤ۔ چنانچہ وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا چلا گیا' پہاڑی چھوٹی ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ جب وہ پہاڑی تک پہنچا تو وہ پہاڑی گڑ کی ایک چھوٹی سی ڈلی بن گئی جسے اٹھا کر اس نے منہ میں رکھ لیا۔

پس کوشش میں یہ بات بھی شامل ہے کہ بہ ظاہر جو کام مشکل اور ہمت شکن نظر

آتے ہیں' اگر آدمی ان کا آغاز کر دے تو بالآخر وہ آسان ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کے لیے یہ بات کافی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا:

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○ (بنی اسرائیل ۱۷: ۱۹)

اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے' اور ہو وہ مومن' تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔

دراصل ہمارا اختیار اسی حد تک محدود ہے۔ اس سے آگے انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

۴- وقت' ایک اہم بنیاد

جو بھی وسائل اور ذرائع ہمیں حاصل ہیں' ان میں سے ایک چیز ایسی ہے جو ہمارے اختیار میں ہے۔ یہ وقت ہے۔ یہ سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ درحقیقت ہمیں اپنی اور اپنے ساتھیوں کے تربیت' تزکیے اور پوری تنظیم کے موثر کام کے لیے سب سے بڑھ کر جس چیز کی فکر کرنی چاہیے' وہ وقت ہے۔ آخرت میں بھی سب سے پہلا سوال وقت کے بارے میں ہی ہوگا۔ اس بات کی طرف اس معروف حدیث میں اشارہ کیا گیا ہے جس کے مطابق آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے سے اس وقت تک قدم نہیں ہٹا سکے گا' جب تک کہ پانچ باتوں کے بارے میں اس سے پوچھ نہیں لیا جائے گا۔ ان میں پہلی بات اس کی عمر کے بارے میں ہوگی کہ کس چیز میں اس نے عمر گزاری' یعنی وقت کہاں صرف کیا؟

وقت کی قدر و قیمت اور ایک ایک لمحہ گزرنے کا احساس تربیت کے لیے بڑا ضروری ہے۔ جو کچھ بھی حاصل ہوتا ہے' خواہ وہ دعوت کا کام ہو یا تربیت کا' غلبہ دین کا کام ہو یا جہاد کا' اپنی تکمیل کے لیے وقت کا محتاج ہے۔ وقت کے بغیر کوئی کام ہو نہیں سکتا۔ بہت سی چیزوں کے بغیر' مثلاً پیسے' مال اور جسمانی صلاحیتوں کے بغیر کام ہو سکتا

ہے۔ بہت سے اندھے' بہرے' لولے اور معذور لوگ بڑے بڑے کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ البتہ کوئی بھی کام وقت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی کے پاس وقت نہیں ہے تو وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اسی لیے کسی بھی فرد کی سب سے قیمتی اور بیش قیمت دولت وقت ہے۔ انسانی زندگی کے امتحان کا دارومدار بھی وقت پر ہی ہے۔

ۨالَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ط (الملك ٦٧:٢)

جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔

گویا اس نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس عرصۂ مدت میں اس بات کو آزمائے کہ تم میں سے کون اس کو اچھے عمل کے لیے استعمال کرتا ہے۔

ہمیں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے ذہن میں وقت کے حوالے سے یہ بات بار بار تازہ کرنی چاہیے کہ وقت کا ہر لمحہ لازوال نفع کا باعث بھی بن سکتا ہے اور حسرت و ندامت کا باعث بھی۔ وقت ایک ایسی دولت ہے جسے کسی بنک میں رکھ کر محفوظ نہیں کیا جاسکتا۔ پیسہ آپ آج نہیں خرچ کریں گے' کل خرچ کرلیں گے۔ جسم کی قوتیں آپ آج نہیں استعمال کریں گے' کل کرلیں گے۔ اللہ کی راہ میں خون کا قطرہ اگر آپ آج نہیں بہائیں گے' شاید کل بہالیں۔ لیکن جو کام آپ نے آج کے اس ایک لمحے میں نہ کیا' وہ لمحہ کام کرنے کے لیے دوبارہ کبھی نہیں ملے گا۔ یہ ایک ایسا اثاثہ اور سرمایہ ہے جو مستقل ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ چنانچہ تزکیہ وتربیت اور دعوت کی تمام کوششوں میں یہ مرکزی نکتہ ہونا چاہیے کہ وقت کیسے استعمال ہو رہا ہے؟ آیا صحیح استعمال ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس بات کا جائزہ لینے' احتساب کرنے' اصلاح کرنے اور صحیح رخ متعین کرنے کے لیے کوششیں بھی ضروری ہیں۔ اسی لیے جن احادیث میں احتساب کی تاکید کی گئی ہے' ان میں عمل کے ساتھ ساتھ وقت کے احتساب کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ بہت سی ایسی

دعاؤں کی تعلیم دی گئی ہے کہ بندہ ہر آنے والی صبح اور آنے والی شام کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لیے تیار ہو۔

گویا کوئی آنے والا لمحہ اس احساس اور شعور کے بغیر نہ آئے کہ یہ ایک نعمت اور امانت ہے' اور کوئی جانے والا لمحہ اس احساس اور شعور کے بغیر نہ جائے کہ یہ نعمت چھن گئی' ہم نے اس سے کیا حاصل کیا؟

۵- ''احسان'' کی کیفیت

انسان کے تزکیہ و تربیت کے لیے تمام صلاحیتوں سے بڑھ کر ضروری اور اہم صفت احسان کی صفت ہے۔ احسان کے لفظ سے ذہن میں وہ حدیث تازہ ہو جاتی ہے جس میں حضورؐ نے احسان کا مطلب حضرت جبریلؑ کو یہ بتایا تھا کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو' اور اگر یہ کیفیت نہیں ہوتی' تو کم سے کم یہ کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ عام طور پر اس کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ آدمی نماز پڑھے یا کوئی اور بندگی کا کام انجام دے تو اس طرح کرے کہ وہ اللہ کے سامنے حاضر ہے۔

اس پر غور کیا جائے تو پہلی بات یہ سامنے آتی ہے کہ بندگی کے معنی صرف عبادت تک محدود نہیں ہیں' بلکہ زندگی کا ہر کام بندگی ہے۔ یہ نماز ہو' روزہ ہو' یا ذکر ہو' تقریر ہو یا مضمون' اجتماع ہو یا اس کی صدارت یا انتظام کرنا' یا کسی ساتھی سے ملاقات کرنا' یا بالآخر کسی ریاست کا انتظام چلانا' یہ سارے کے سارے کام بندگی کے کام ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ بات جو کہی گئی ہے کہ تم کام کو یوں سمجھ کر کرو کہ گویا اللہ تعالیٰ تمھیں دیکھ رہا ہے' اس کے پیچھے اس کا ایک حاصل ہے۔ وہ حاصل یہ ہے کہ جب آپ کسی کی عائد کردہ ذمہ داری کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ جس نے ذمہ داری عائد کی ہے' آپ اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں تو پھر آپ کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آپ اسے بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھے انداز میں انجام دیں' یعنی خوب سے خوب تر کی تلاش ہوتی

ہے۔ یہی دراصل اس کا اصل حاصل ہے۔ یہ نہیں کہ ہم صرف یہ سمجھتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے بلکہ ہماری کوشش اس بات پر مرکوز ہو کہ جو کام بھی ہم بندگی کا کر رہے ہیں اور ہر کام بندگی کا کام ہے' وہ کام ہم اس طرح کریں کہ نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ ہم کو دیکھ رہا ہے بلکہ وہ کام اچھے سے اچھے اور بلند سے بلند معیار پر کرنے کی کوشش کریں۔

یہ تربیت و تزکیہ کے لیے بڑی ہی ضروری صفت ہے۔ دنیا میں قناعت بہت اعلیٰ صفت ہے' لیکن دین کے معاملے میں قناعت بہت ہی بری صفت ہے۔ اگر آدمی اس بات پر قانع ہو جائے کہ جو کام' جس معیار کا اور جس طرح سے میں کر رہا ہوں' بس وہی ٹھیک ہے اور اسے مزید بہتر بنانے کی ضرورت نہیں ہے' یا اسے خوب سے خوب تر کی تلاش نہیں ہے' تو ایک آدمی ۱۰۰ تقریریں کرنے کے بعد بھی اسی مقام پر رہے گا جہاں وہ ایک تقریر کر کے تھا' اور ۱۰۰ کام کر کے بھی وہ اسی مقام پر رہے گا جہاں وہ پہلا کام کر کے تھا' یعنی ۱۰۰ تقاریر یا کاموں کے کرنے کے باوجود اس کے تجربے' معیار اور کیفیت میں سے کسی چیز میں کوئی اضافہ یا بہتری نہ ہوگی۔

آپ کو کبھی بھی دوسرے درجے کے معیار کے کام سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے بلکہ سب سے پہلے اپنے آپ سے اور پھر اپنے ساتھیوں سے اول درجے کی کارکردگی (first rate performance) کا مطالبہ کریں' اس کی توقع رکھیں اور اسی کی ترغیب دیں۔ جو کام کیا گیا ہو' اس کو کرنے کے بعد یہ دیکھیں کہ اسے ہم اس سے بہتر کیسے بنا سکتے ہیں۔ خواہ بہت چھوٹے پیمانے پر ذمہ داری ہو' جیسے ایک تقریر کرنا' یا اجتماع کرنا' یا مضمون لکھنا' یا وہ بہت بڑی ذمہ داری ہو' جیسے پورے ملک کی تحریک اسلامی کو لے کر چلنا' یا اس سے بھی بڑی ذمہ داریاں کبھی اللہ تعالیٰ دے' اس میں ہمیشہ یہ احساس اور کیفیت رہنی چاہیے کہ اسے بہتر سے بہتر انداز میں کرنا ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانے پر کرنا ہے' یہ بہت ضروری ہے۔ میں نے پستی کا' یا اہداف کے حصول میں ناکامی کا بنیادی سبب ہمیشہ اس بات کو ہی پایا کہ ہمارے ذمہ داران اور ساتھی بڑی جلدی اس بات پر قانع

ہوجاتے ہیں کہ ہم نے کام کرلیا' خواہ غیر معیاری ہی کیوں نہ ہو۔ اس بات کی کوئی فکر نہیں کرتے کہ اس کا معیار کیا تھا؟ اور اس کو ہم مزید بہتر کیسے بنا سکتے ہیں؟ اس بات کی کوئی تمنا یا آرزو نہیں پائی جاتی کہ یہ کام بہتر سے بہتر اور اچھے سے اچھا ہو۔

۶- احساس ذمہ داری

آخری چیز ذمہ داری کا احساس اور ذمہ دارانہ رویہ اختیار کرنا ہے۔ ان تمام کوششوں میں جو آپ اپنے آپ کو بہتر بنانے کے لیے' اپنی نشوونما کے لیے' اپنے ارتقا کے لیے اور اپنے ساتھیوں کو بہتر بنانے اور ان کے تزکیہ و تربیت کے لیے کریں گے' اس میں اصل چیز یہ ہے کہ جتنا آدمی کے اندر اپنے کام کی ذمہ داری کا احساس ہوگا' اتنا ہی وہ اس کے تقاضے پورے کرے گا اور اتنا ہی وہ اس کے لیے خوب سے خوب تر کے لیے کوشش بھی کرے گا۔ اگر کام کی ذمہ داری کا پورا احساس نہ ہو' تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم کسی مقام پر آجائیں تو اسی مقام پر آج بھی رہتے ہیں اور کل بھی' اور اسی ایک مقام پر پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔ جو ذمہ داریاں ہمارے سپرد کی گئی ہیں' خواہ وہ ذمہ داری چھوٹی ذمہ داری ہو جو کہ تنظیم اور تحریک اور تربیت کے حوالے سے آپ کے ذمے آجائے' یا وہ عظیم الشان ذمہ داری ہو کہ جسے اللہ تعالیٰ نے 'شہادت علی الناس' کے عظیم الشان لفظ سے تعبیر کیا ہے' یعنی سارے انسانوں کے سامنے حق کی گواہی دینا' یہ ذمہ داری کا احساس جتنا زیادہ ذہن اور قلب کے اندر تازہ ہوگا' جتنا اس کا شعور گہرا ہوگا' اتنا ہی آپ کے اندر استعداد اور قوت پیدا ہوگی کہ آپ ان چیزوں پر عمل کریں جن سے آپ بہتر بنیں اور ذمہ داری احسن انداز میں ادا کرسکیں۔ جب ذمہ داری کا احساس کمزور ہو' یا غائب ہو' تو پھر آگے بڑھنے کے دروازے بند ہونا شروع ہو جاتے ہیں' یا پھر راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔

خوب سے خوب تر کی تلاش کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کیا

ذمہ داری ہے جس کے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ وہ ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی ذمہ داری تو ہے ہی' لیکن اس نے ہمیں جس مقام پر کھڑا کیا ہے وہ اتنی عظیم الشان ذمہ داری ہے کہ اس نے اس منصب پر اپنے انبیا اور رسولوں کو فائز کیا تھا۔ جو آدمی ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس کرے کہ اللہ کی راہ میں نکلنا اور تحریک اسلامی کا ساتھ دینا دراصل اس بات کا دعویٰ ہے اور اس ذمہ داری کو اختیار کرنا ہے کہ جو کام اللہ کے رسولوں نے انجام دیا تھا' وہ کام ہمیں انجام دینا ہے--- صرف یہ احساس مٹی کی ڈلی کو سونا بنانے کے لیے کافی ہے۔ اگر ذمہ داری کا یہ احساس قلب کے اندر پیدا ہو جائے' پھر آدمی رک نہیں سکتا' کمر کھول نہیں سکتا' کبھی اس کی ہمت پست نہیں ہوسکتی' کبھی وہ اپنے کام کو چھوڑ کر بیٹھ نہیں سکتا' اور کبھی اس کا کام ختم نہیں ہوسکتا۔ وہ کبھی بھی اپنے کام نہ کرنے کی ذمہ داری اپنے ساتھیوں اور قائدین کے سر ڈال کر الگ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ یہ وہ ذمہ داری ہے جس کے لیے وہ دنیا میں انسانوں کے سامنے' اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اس کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو تربیت' تزکیہ اور دعوت کے عمل کی بنیادیں ہیں۔ جب کسی فرد کو دعوت دینے کے لیے آپ جائیں تو پہلے آپ کو اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ آپ اس کے اندر پہنچنے کی کوشش کریں۔ اس کے اندر عزم و ارادہ کی پختگی پیدا کریں۔ اسے بتائیں کہ اس کا کام کوشش کرنا ہے۔ اسے خوب سے خوب تر کی تلاش کی دعوت دیں۔ اس کے اندر اس ذمہ داری کا احساس پیدا کریں جو اس کے اوپر عائد کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں بگڑے ہوئے مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دی ہے' اس دعوت کا انداز اس سے مختلف ہے جو اس نے کافروں کے ساتھ اختیار کیا ہے۔ اس دعوت میں پہلا قدم ہی انھیں ان کی ذمہ داری کا احساس دلانا ہے:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ

اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (البقرہ ۲ : ۴۰)

اے بنی اسرائیل' ذرا خیال کرو میری اس نعمت کا جو میں نے تم کو عطا کی تھی۔ میرے ساتھ تمھارا جو عہد تھا اسے تم پورا کرو تو میرا جو عہد تمھارے ساتھ تھا اسے میں پورا کروں۔

یعنی بنی اسرائیل کو اپنی نعمت' ہدایت کی نعمت' ساری دنیا کی نعمتیں اور تاریخ کی ساری نعمتیں یاد دلا کر خدا سے کیے ہوئے اپنے عہد کو پورا کرنے کی طرف توجہ دلائی اور ان میں احساس ذمہ داری کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔

ہدایت کی نعمت کا احساس ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے اور اللہ سے عہد اور میثاق کی ذمہ داری کے احساس سے بڑی کوئی ذمہ داری نہیں ہوسکتی۔ یہی دعوت کا بھی نقطۂ آغاز ہے جو قرآن نے اختیار کیا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو آپ کے لیے' آپ کے ساتھیوں کے لیے اور پوری اُمت کے لیے بالآخر شفا اور اصلاح کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھی کی ہمیں فکر کرنی چاہیے۔

تزکیہ نفس: طریقے

تزکیہ و دعوت کا اصل انحصار انسان کے اندر کی شخصیت، یعنی اس کے قلب پر ہے۔ اس قلب کو مسکن ہونا چاہیے اللہ پر ایمان کا، اس سے محبت کا، اس سے خوف اور ڈر کا، اس کی حضوری کے احساس کا، آخرت کے مقصود اور مطلوب ہونے کا، جنت کی طلب اور دوزخ سے بچنے کی بے چینی اور اضطراب کا اور توکل کا--- ان ساری صفات کا مسکن قلب ہے۔ اسی طرح ارادے کا مسکن بھی قلب ہے۔

سوال یہ ہے کہ عملاً وہ کیا طریقے اختیار کیے جائیں کہ جس سے تزکیہ ہو سکے اور قلب میں واقعی مطلوبہ کیفیات اور صفات پیدا ہوں۔

اللہ کا ذکر

اگر ہم سارے طریقوں کو مجموعی طور پر ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو وہ لفظ اللہ کا ذکر ہے۔ ان تمام صفات کو پیدا کرنے کا ذریعہ، طریقہ اور راستہ اللہ کا ذکر اور یاد ہے۔ ذکر کے معنی یاد کرنا بھی ہیں اور یاد رکھنا بھی۔ دل کی ساری زندگی ذکر کے اندر ہی پوشیدہ ہے اور اسی پر منحصر ہے۔

درحقیقت انسان کی پوری شخصیت، اس کے حافظے سے بنتی ہے۔ اگر آج کسی آدمی کا حافظہ چھین لیا جائے تو وہ نہ کپڑے پہن سکتا ہے، نہ کھانا کھا سکتا ہے، نہ بول سکتا

ہے اور نہ کسی کو پہچان سکتا ہے۔ یہ سارے کام جو ہم روز کرتے رہتے ہیں ان سب کی بنیاد ہمارا حافظہ ہے جس نے اس بات کو محفوظ کر لیا ہے کہ کسی کام کو کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ جس آدمی کا حافظہ کسی حادثے میں ختم ہو گیا ہو وہ کوئی بھی کام کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ انسان کے سارے عمل اور اس کی ساری سرگرمیوں کی بنیاد اس کا حافظہ ہے۔ ذکر بھی اسی حافظے کا کام ہے۔ اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص اللہ کو یاد کرتا ہے' اور جو اس کو یاد نہیں کرتا' ان دونوں کی مثال مردہ اور زندہ کی طرح ہے۔ (عن ابوموسیٰ اشعریؓ، بخاری)

اولاً خود اپنے آپ کو ذکر کہہ کر واضح کیا کہ قرآن تو نازل ہی ذکر کے لیے ہوا ہے۔ پھر یہ بھی بتایا کہ جو شخص ذکر سے اعراض اور غفلت برتے وہ اپنے مفادِ نفس اور مصلحت سے بھی غافل ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اپنی بھلائی تک سے غافل ہو جاتا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ o (الحشر ۵۹:۱۹)

ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انھیں خود اپنا نفس بھلا دیا' یہی لوگ فاسق ہیں۔

یہ بڑی معنی خیز آیت ہے کہ اگر تم اللہ کو بھول جاؤ گے تو گویا اپنے آپ کو بھول جاؤ گے۔ پھر تمھیں اپنی زندگی کو کہیں سے بھی سدھارنے کا موقع نہیں ملے گا۔

اسی طرح سورہ الزخرف میں کہا گیا ہے:

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ o وَاِنَّهُمْ لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ o (الزخرف ۴۳: ۳۶-۳۷)

جو شخص رحمٰن کے ذکر سے تغافل برتتا ہے' ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے

ہیں اور وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے۔ یہ شیاطین ایسے لوگوں کو راہ راست پر آنے سے روکتے ہیں' اور وہ اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔

ذکر ہی وہ طریقہ ہے جس سے ہر چیز حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کثرت سے ذکر کرنے کی تاکید کی ہے' اور جو لوگ کثرت سے ذکر کرتے ہیں' ان کی تعریف بھی فرمائی ہے:

وَالذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّالذّٰکِرٰتِ (الاحزاب ۳۳:۳۵)

اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں ہیں۔

عقل مند لوگوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے:

یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ (اٰل عمران ۳: ۱۹۱)

جو اٹھتے' بیٹھتے اور لیٹتے' ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔

ان تمام آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ذکر ہی دراصل وہ طریقہ ہے جس کی پابندی سے' ہمیشہ عمل کرنے سے' مداومت اختیار کرنے سے' مضبوطی کے ساتھ پکڑنے سے' مختلف طریقوں پر چلنے سے' وہ ساری چیزیں جن کا ہم نے ذکر کیا ہے' حاصل ہو سکتی ہیں۔

ذکر کی اہمیت

ذکر کی بے شمار صورتیں ہیں۔ نماز بھی اس کے اندر شامل ہے۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ o (طٰہٰ ۲۰:۱۴)

اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔

شروع میں تربیت کے لیے جو احکام آئے ان سب میں ذکر کی ہدایت تھی۔ اگر مکی سورتوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں جگہ جگہ تسبیح' حمد اور ذکر کی ہدایت کی گئی ہے۔ اگر راتوں کو کھڑا ہو کر نماز پڑھنے کا حکم ہے تو اس میں قرآن کی آیات کی تلاوت کا حکم ہے۔

قرآن کی تلاوت بھی ذکر کی ایک صورت ہے۔

ذکر کے مختلف طریقوں پر اگر غور کیا جائے تو ہر طریقہ کسی نہ کسی طرح اللہ کے ذکر کو زندگی میں جاری و ساری کرنے کا راستہ ہے۔ اس کو چھوڑ کر اور کوئی راستہ یا طریقہ نہیں ہے جس سے یہ مطلوبہ صفات حاصل ہوسکیں اور دل کی زندگی کا سامان ہو سکے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی صحبت اختیار کرنے اور ان سے اخوت و محبت کا تعلق استوار کرنے کا حکم دیا ہے جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (الکهف ۱۸:۲۸)

اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اسے پکارتے ہیں' اور ان سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟

آگے چل کر مزید فرمایا:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ۝ (۱۸:۲۸)

کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو' (پیروی نہ کرو) جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ جو کافر ہے یا مشرک ہے' بلکہ یہ فرمایا کہ جس کا دل ہمارے ذکر سے غافل ہو گیا۔

یہ ساری آیات اس بات کو متحقق کر دیتی ہیں کہ تزکیہ و تربیت کے تمام عمل میں جس چیز کے اہتمام کی ضرورت ہے وہ اللہ کا ذکر اور اس کی یاد ہے۔

اس کی وجوہات کیا ہیں؟ ایک وجہ کا ذکر اس سے قبل بھی کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کے وقت ہی اسے اس کی دو کمزوریوں پر متنبہ کر دیا تھا۔ ایک' اس کی غفلت اور بھول۔ دوسرے' اس کے ارادے اور عزم کی کمزوری۔ فرمایا:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ○ (طٰہٰ ۲۰:۱۱۵)

ہم نے اس سے پہلے آدمؑ کو ایک حکم دیا تھا' مگر وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔

اس کے علاج کے طور پر اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں انسان کو بتائی ہیں۔ ایک تو اس نے یہ کہا کہ ہمیشہ تمھارے پاس میری طرف سے یاد دہانی اور ذکر کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ کہیں اسے ذکر کہا گیا ہے اور کہیں ہدایت۔ سورہ بقرہ میں ایک مقام پر ہدایت کہا گیا ہے' فرمایا:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ (البقرہ ۲:۳۸)

پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے' ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔

دوسرا علاج استغفار ہے' یعنی اگر انسان غلطی کرے' بھول جائے تو اس نے استغفار اور توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے۔ حضرت آدمؑ نے غلطی فرمائی تو اس نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان دو ہتھیاروں سے لیس کر کے ساری مخالفتوں' مزاحمتوں اور مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس دنیا میں چھوڑا ہے۔ انسان اللہ کو یاد کرتا رہے' یعنی ذکر کرتا رہے اور مصمم ارادہ کرے۔ اگر ارادہ کمزور پڑ جائے تو توبہ و استغفار کرے اور اللہ کی طرف لوٹ آئے۔

ذکر کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنی مدد کا بھی وعدہ فرمایا ہے کیونکہ اس کی مدد' تائید' قربت اور اعانت کے بغیر ہم تزکیہ وتربیت اور دعوت کی کوئی بھی منزل طے نہیں کر سکتے۔ اسی لیے اس نے ہر جگہ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اگر تم مجھے یاد رکھو گے تو میں بھی تمھیں یاد رکھوں گا' تمھارے ساتھ بھی رہوں گا' تمھاری تائید بھی کرتا رہوں گا اور میری نصرت بھی تمھارے شامل حال رہے گی۔

فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ (البقرہ ۲: ۱۵۲)

تم مجھے یاد رکھو' میں تمھیں یاد رکھوں گا۔

اس پر کسی نے بڑی خوب صورت بات کہی کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ میرا رب مجھے کب یاد کرتا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ آپ کو کیسے معلوم ہے کہ آپ کا رب آپ کو کب یاد کرتا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ جب میں اسے یاد کرتا ہوں تو وہ مجھے یاد کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے خود قرآن مجید میں اس بات کا ذکر کیا ہے اور وعدہ کیا ہے کہ اگر تم مجھے یاد کرو گے تو میں تمھیں یاد کروں گا۔

احادیث میں اسی بات کی تشریح کی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

انا عبدی اذا فطرن وطهرة بها شفاتا

جب تک وہ مجھے یاد رکھتا ہے اور اس کے ہونٹ ہلتے ہیں' میں اس کے ساتھ رہتا ہوں۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

وانی معه حین اذا ذکرنی (بخاری' مسلم' ترمذی' نسائی)

جب بھی وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔

دین' دعوت اور اطاعت کی راہ پر استقامت کے لیے اس نے نسخہ یہی بتایا ہے کہ آدمی اس بات کو یاد رکھے کہ وہ اللہ کے سامنے ہے:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا (الطور ۵۲: ۴۸)

اے نبیؐ، اپنے رب کا فیصلہ آنے تک صبر کرو، تم ہماری نگاہوں میں ہو۔

آنکھوں کے سامنے ہونا بھی اللہ کو یاد رکھنے کا ایک طریقہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو جب فرعون کے دربار میں بھیجا تو وہاں ان کی جان کو بھی خطرہ تھا اور بہت سے دیگر خطرات بھی تھے۔ اس موقع پر انھیں ان الفاظ میں تسلی دی:

لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی o (طٰهٰ ۲۰: ۴۶)

ڈرو مت، میں تمھارے ساتھ ہوں، سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

گویا دعوت، جہاد اور تزکیے کی راہ میں یہی ایک احساس، کہ اللہ ہے اور اس کا ذکر، وہ طریقہ ہے جس سے وہ تمام صفات حاصل ہوتی ہیں جن کا ہم نے اب تک ذکر کیا ہے۔

ذکر کے معنی

ذکر کے کیا معنی ہیں؟ ذکر کے معنی یاد کرنے کے بھی ہیں اور یاد رکھنے کے بھی ہیں۔ اس کے اندر دل کا دھیان بھی شامل ہے، زبان سے اس کا اظہار بھی ہے اور عمل بھی ہے، جب کہ عمل میں اطاعت بھی شامل ہے اور جہاد و دعوت بھی۔ قرآن مجید نے ذکر کو ان سارے معنوں اور مفاہیم میں مختلف جگہوں پر استعمال کیا ہے۔

منافقین کی نماز کے بارے میں قرآن مجید کہتا ہے کہ وہ لوگوں کو دکھانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، کسمساتے ہوئے، سستی کے ساتھ، اور اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں:

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوةِ قَامُوْا کُسَالٰی لا یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا o (النساء ۴: ۱۴۲)

جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم یاد کرتے ہیں۔

نماز میں، بظاہر زبان حرکت میں رہتی ہے، جسم رکوع و سجود اور قیام کے ذریعے ذکر میں

مشغول رہتا ہے لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ یہ اللہ کو بہت کم یاد کرتے ہیں' یعنی دل غافل ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دل کا یاد کرنا بھی ذکر ہے۔ زبان کے حوالے سے وضاحت کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ انسان زبان ہی سے تسبیح' حمد اور اللہ کی تقدیس بیان کرتا ہے' یہ سب اس میں شامل ہیں۔

عمل کے لحاظ سے ذکر پر غور کیا جائے تو نماز ذکر کا ایک بڑا جامع مجموعہ ہے۔ اس میں دل کا دھیان اور زبان سے تسبیحات اور تکبیر کا اظہار بھی ضروری ہے اور ہاتھ' پاؤں' پیشانی اور پورے جسم سے بھی اللہ کا ذکر اس میں شامل ہے۔ خاص طور پر سورہ جمعہ کے آخری حصے پر غور کیا جائے تو وہاں یہ مفہوم بالکل واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ؕ (الجمعة ۶۲: ۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' جب پکارا جائے نماز کے لیے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔

یہاں نماز جمعہ کے لیے پکارا جا رہا ہے مگر قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو۔ نماز جمعہ میں امام کی تقریر اور خطبہ' مسجد میں جا کر بیٹھنا اور نماز ادا کرنا بھی شامل ہے۔ اس سب کو اللہ نے ذکر اللہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ پھر فرمایا کہ جب نماز ختم ہو جائے تو اللہ کے ذکر کے لیے زمین پر پھیل جاؤ۔ گویا مسجد کے اندر ہی ذکر نہیں تھا بلکہ مسجد کے باہر کی پوری زندگی بھی ذکر ہے۔ یہاں یہ بات بالکل واضح طور پر سامنے آ جاتی ہے کہ ذکر مسجد کے اندر بھی ہے اور باہر بھی' یعنی ہر جگہ اللہ کا ذکر ہے۔

جہاد اور دعوت کے لیے بھی اس نے ذکر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے اگر صرف اسی آیت پر غور کیا جائے تو کافی ہے۔ فرمایا:

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۝ (البقرہ ۲: ۱۵۲)

تم مجھے یاد رکھو' میں تمھیں یاد رکھوں گا' اور میرا شکر ادا کرو' کفرانِ نعمت نہ کرو۔

یہ آیت جس سیاق وسباق میں اُتری ہے وہ شہادت حق کا سیاق وسباق ہے۔ اس آیت سے قبل اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے تمھیں ''اُمت وسط'' بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن کر کھڑے ہو۔ اس کے بعد تحویل قبلہ کا ذکر آیا ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ شہادت حق کا منصب اُمت مسلمہ کے سپرد ہو رہا ہے۔ اس کے بعد اس آیت میں کہا گیا ہے کہ تم مجھے یاد کرو تو میں تمھیں یاد کروں گا' میرا شکر کرو اور ناشکری نہ کرو۔ پھر فوراً ہی صبر وصلوٰۃ سے استعانت کی تلقین کی گئی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝
(البقرہ ۲:۱۵۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' صبر اور نماز سے مدد لو۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں کہ انھیں مردہ نہ کہو۔ گویا دعوت کے کام میں جان دے دینے کا مرحلہ بھی آنے والا ہے۔ پھر مختلف قسم کی آزمایشوں کا ذکر کیا گیا ہے کہ ہم ضرور تمھیں خوف وخطر' فاقہ کشی' جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمھاری آزمایش کریں گے۔ اس تمام پس منظر میں اس آیت کا بیان کیا جانا' اور ''فاذکرونی'' کا لفظ استعمال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شہادت حق کا فریضہ انجام دینے کے لیے' اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے' اللہ کا ذکر کرنے اور اس کو یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی یہاں تاکید کی گئی ہے۔

جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ فرعون کے دربار میں گئے تو انھوں نے بھی اپنے مشن کے لیے یہی لفظ استعمال کیے تھے کہ ہم کثرت سے آپ کی تسبیح کریں اور کثرت سے آپ کو یاد رکھیں:

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ (طٰہٰ ۲۰: ۳۳-۳۴)

تا کہ ہم خوب تیری پاکی بیان کریں اور خوب تیرا چرچا کریں۔
سورہ مزمل میں اللہ تعالیٰ نے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ قیام کرو، راتوں کو کھڑے رہو، آدھی رات یا آدھی رات سے کم یا اس سے زیادہ، وہاں بھی یہ فرمایا کہ دن میں تمھارے لیے تسبیح کا طویل شغل ہے۔

اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبْحًا طَوِیْلاً ○ (المزمل ۷۳: ۷)

دن کے اوقات میں تو تمھارے لیے بہت مصروفیات ہیں۔
نبی کریمؐ کا دن میں اس کے سوا اور کیا شغل تھا کہ آپؐ دعوت الی اللہ کا کام کرتے تھے۔ اس کو بھی قرآن نے تسبیح کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

اس لحاظ سے جو شخص بھی غور کرے گا وہ اس بات کو پالے گا کہ ذکر میں دل کا دھیان، زبان سے تسبیح کرنا، اور عمل سے اس کے احکام کی اطاعت شامل ہے۔ اس اطاعت میں شہادت حق کے فریضے کی ادائیگی، جہاد اور دعوت الی اللہ کا کام بھی شامل ہے۔

اجتماعی ذکر

ذکر کے سلسلے میں انفرادی ذکر کی بھی ہدایت ہے اور اجتماعی ذکر کی بھی۔ ذکر کے حلقوں کے بارے میں لوگ مختلف رائے رکھتے ہیں۔ لیکن غور کیجیے، نماز باجماعت اجتماعی ذکر کی ایک صورت نہیں تو اور کیا ہے۔ نماز باجماعت، اجتماعی ذکر کا ایک حلقہ ہے جہاں جہری ذکر ہوتا ہے۔ تلاوت قرآن اور تکبیریں بلند آواز سے کہی جاتی ہیں، تمام لوگ صف باندھ کر باجماعت کھڑے ہوتے ہیں، امام سب سے آگے ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ہم نماز کو ذکر کہیں تو نماز باجماعت، اجتماعی ذکر کا ایک حلقہ کہلائے گا۔

ذکر کے حلقے جس طرح بعد میں بنا لیے گئے، وہ ایک الگ بات ہے۔ البتہ احادیث میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ صحابہ کرامؓ بھی جمع ہو کر ذکر کیا کرتے تھے۔ وہ کس

طرح ذکر کرتے تھے' اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ بہت سی ایسی احادیث ہیں جن میں صحابہؓ کے جمع ہونے اور اللہ کا ذکر کرنے کا اشارہ ملتا ہے۔ دو احادیث تو بہت واضح ہیں جن میں اجتماعی ذکر کا حال بیان کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں' بیٹھتے ہیں' اور اللہ کو یاد کرتے ہیں ان پر فرشتے اترتے ہیں' سایہ فگن ہو جاتے ہیں اور ان پر اللہ کی سکینت اور رحمت اترتی ہے۔ اسی طرح دیگر احادیث ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ فرشتے راستے میں ایسے لوگوں کو تلاش کرتے پھرتے ہیں جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ کہیں جمع ہیں اور اللہ کا ذکر کر رہے ہیں تو پھر وہ پکارتے ہیں:

هلمُّو اِلی حَاجَتِکُمْ

آؤ یہی تو ہم تلاش کر رہے تھے۔

جب وہ اللہ کے پاس واپس جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتا ہے کہ تم نے ان کو کیا کرتے دیکھا؟ وھو اعلم (اگرچہ وہ جانتا ہے)۔ فرشتے جواب دیتے ہیں کہ وہ آپ کی تسبیح کر رہے ہیں' حمد کر رہے ہیں' تکبیر کر رہے ہیں' تمجید کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: کیا انھوں نے مجھے دیکھا ہے؟ فرشتے کہتے ہیں: نہیں' انھوں نے آپ کو نہیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: اگر وہ مجھے دیکھتے تو پھر کیا ہوتا؟ فرشتے کہتے ہیں: پھر وہ آپ کو اور زیادہ شدت کے ساتھ یاد کرتے' تسبیح و تقدیس کرتے۔ پھر اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ وہ کیا مانگ رہے ہیں؟ فرشتے کہتے ہیں: وہ جنت مانگ رہے ہیں اور آگ سے بچنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: کیا انھوں نے جنت کو دیکھا ہے؟ اور دوزخ کو دیکھا ہے؟ فرشتے جواب دیتے ہیں: نہیں' انھوں نے ان میں سے کسی چیز کو نہیں دیکھا۔ پھر اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے: اگر وہ انھیں دیکھ لیتے تو کیا ہوتا؟ فرشتے کہتے ہیں کہ پھر وہ زیادہ شدت اور کثرت سے جنت کو طلب کرتے اور دوزخ سے بچنے کی تڑپ رکھتے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جاؤ میں نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔

یہ دونوں احادیث بالکل صحیح احادیث ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جمع ہو کر' مل کر قرآن پڑھنا' تلاوت کرنا' ذکر کرنا' دعوت کا کام کرنا' اللہ کا کلمہ بلند کرنا اور دین کا علم حاصل کرنا' یہ ساری چیزیں ذکر کے حلقوں کی تعریف میں آتی ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں ذکر کے حلقوں سے صوفیوں کی طرح سے جمع ہو کر ذکر کرنا مراد نہیں ہے۔

ذکر کے طریقے

ذکر کی بے شمار صورتیں ہیں۔ مگر میں نے پانچ چیزوں کا انتخاب کیا ہے جو ان تمام امور کا احاطہ کر لیتی ہیں جن کی تعلیم قرآن و حدیث میں دی گئی ہے۔

کلماتِ ذکر کا اہتمام

پہلی بات یہ ہے کہ ذکر کے کلمات کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ یہ وہ کلمات ہیں جن کی تعلیم قرآن مجید میں دی گئی ہے' اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے ساتھیوں کو دی ہے' اور اپنی زندگی میں ان کو جاری و ساری کرنے کا پورا اہتمام بھی فرمایا ہے۔ اس طریقے سے کہ یہ کلمات بغیر کسی وقت اور خاص موقع کے بھی ادا ہوں' اور اس طرح بھی کہ ان کا ایک نصاب بنا کر اسے مختلف اوقات سے وابستہ کر دیا جائے جس کا خاص طور پر اہتمام ہو' نمازوں کے بعد' یا صبح و شام' یا رات کو سوتے وقت۔ اس طرح سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے' لیٹتے یا چلتے پھرتے' ہر وقت کے لیے ذکر کی تعلیم دی گئی ہے۔

اگر اذکار سے متعلق تمام احادیث کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر سات کلمات کی تعلیم دی گئی ہے۔ ان میں سے ہر کلمہ اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات کو ہمارے سامنے واضح کرتا ہے۔ وہ کلمات درج ذیل ہیں:

۱- سبحان اللہ' ۲- الحمد للہ' ۳- لا الٰہ الا اللہ' ۴- اللہ اکبر' ۵- لاحول ولا قوۃ الا باللہ' ۶- استغفار (اس کے الفاظ مختلف ہو سکتے ہیں لیکن اس کی تاکید مختلف انداز میں کی گئی ہے)' ۷- دعا۔

دعا کے بھی الفاظ مختلف ہو سکتے ہیں لیکن مجرد مانگنا' اس کی تاکید ہے اور اس کے لیے مختلف دعاؤں کی تعلیم دی گئی ہے' اور اسے زندگی کے اندر سمویا گیا ہے۔ ان ہی دعاؤں میں ایک دعا وہ ہے جو ہم حضورؐ کے لیے کرتے ہیں جو سب سے پہلے لازم ہے۔ اسے میں نے الگ سے شمار نہیں کیا۔ وہ دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنا صلوٰۃ وسلام بھیجے۔

اگر ان کلمات پر آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ سارے کے سارے کلمات ان ہی بنیادی کلمات کے گرد گھومتے ہیں۔ احادیث میں ان کی مختلف انداز میں تاکید بھی کی گئی ہے' جیسا کہ فرمایا گیا کہ سب سے بہتر ذکر' لا الٰہ الا اللہ ہے اور سب سے بہتر دعا' الحمدللہ ہے۔ اسی طرح بہت سی احادیث ہیں جن میں ان کلمات کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہاں سب کا احاطہ ممکن نہیں۔ البتہ یہ بات واضح ہے کہ نبی کریمؐ نے اپنے ساتھیوں کو بالعموم وقتاً فوقتاً اٹھتے بیٹھتے بھی ان کلمات کو پڑھنے کا حکم دیا اور ایک نصاب کی صورت میں اہتمام کی تلقین بھی فرمائی' مثلاً نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ' ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر' ایک نصاب بنا کر پڑھنے کی تلقین فرمائی۔ اس تسبیح کو مختلف طریقوں سے' یعنی ۱۰ مرتبہ' سات مرتبہ یا تین مرتبہ پڑھنے کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔

نماز

دوسری چیز نماز ہے۔ نماز کی اہمیت بالکل بنیادی ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ ایمان کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ نماز درحقیقت تربیت و تزکیہ کا ہمہ وقتی پروگرام ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم نماز کو کیسے بہتر بنائیں؟ مختلف احادیث میں اس کے لیے مختلف تدابیر بیان کی گئی ہیں۔ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ان کا اہتمام کیا جائے تو اس سے نماز کو بہتر بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔

اول: حدیث میں کہا گیا ہے کہ جب آدمی نماز پڑھتا ہے تو وہ دراصل اللہ تعالیٰ

سے بات چیت کرتا ہے۔

ان المصلی یُناجی ربه عزوجل فلینظر احدکم بما یناجی ربه ولا یجهر بعضکم علی بعضٍ فی القرأة (مسند احمد)

بے شک نمازی اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے اور تم میں سے ہر ایک کو دیکھنا چاہیے کہ وہ اپنے رب سے کس طرح سرگوشی کرتا ہے۔ تم میں سے کوئی دوسرے پر قرأت اُونچی آواز سے نہ پڑھے۔

نجویٰ کا لفظ کان میں بات کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے' یعنی بہت قریب ہو کر بات کرنا۔ ایک نمازی کو چاہیے کہ وہ برابر اس بات پر نظر رکھے کہ وہ کس طرح اللہ سے بات کر رہا ہے۔ زبان سے الفاظ ادا ہو رہے ہوں' مفہوم کا پتا نہ ہو' اور دل غیر حاضر ہو' تو یہ کیسی بات چیت ہے!

مختلف احادیث میں نماز میں بات چیت کے حوالے سے اشارے دیے گئے ہیں' مثلاً آدمی جب کہتا ہے:

لا اله الا اللّٰه' اللہ کے سوا کوئی معبُود نہیں

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

انا اللّٰه ' لا اله الا انا' میں اللہ ہوں' میرے سوا کوئی ''الٰہ'' نہیں ہے۔

وہ حدیث خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ سورۃ الفاتحہ میرے اور بندے کے درمیان تقسیم کر دی گئی ہے۔ جب بندہ اَلْحَمْدُلِلّٰہِ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب وہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہتا ہے تو اللہ کہتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا کی۔ جب وہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہتا ہے تو اللہ کہتا ہے کہ بندے نے میری شان بیان کی۔ جب وہ کہتا ہے اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تو اللہ کہتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان معاہدہ ہو گیا۔ اب یہ جو کچھ مانگے گا وہ اسے ملے گا۔ پھر جب وہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ کہتا ہے تو ہدایت کا

راستہ پاتا ہے۔ گویا ہر نماز میں' ہر رکعت میں بندے کا روزانہ یہ مکالمہ ہوتا ہے۔ اگر نماز میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ نمازی اللہ سے بات چیت اور مکالمہ کر رہا ہے تو یہ چیز لازماً نماز میں توجہ کو برقرار رکھنے میں مدد دے گی۔

دوم: آدمی جب بھی نماز پڑھے تو اسے آخری نماز سمجھ کر پڑھے۔ حدیث میں آتا ہے:

اذا قُمْتَ فِي صَلٰوتِكَ فَصَلِّ صَلٰوةَ مُوَدِّعٍ (مشکوٰۃ)

جب تو نماز میں کھڑا ہو تو الوداع کہنے والے کی طرح الوداعی نماز پڑھ۔

وداعی نماز سے مراد یہ ہے کہ شاید یہ زندگی کی آخری نماز ہو۔ ہم سب اس بات کو جانتے ہیں کہ زندگی کی کوئی بھی نماز آخری نماز ہو سکتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ شاید یہی نماز آخری نماز ہو' اور آخری موقع مل رہا ہو کہ ہم اللہ کے حضور حاضر ہوں اور اس سے کچھ عرض معروض کریں۔ جب موت آئے گی تو ہم مہلت مانگیں لیکن مہلت نہیں ملے گی۔ یہ نماز اس وقت مہلت کے طور پر ملی ہوئی ہے۔ اس لیے اگر آدمی ہر نماز اسی طرح پڑھے کہ یہ آخری نماز ہے تو اس سے بھی توجہ قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے۔

سوم: ہم سب کو اس سے سابقہ پڑتا ہے کہ کبھی نماز میں دل لگتا ہی نہیں' ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے بات چیت کر رہے ہیں' یہ احساس بھی نہیں رہتا کہ اس کے سامنے کھڑے ہیں' اور یہ بھی ذہن میں نہیں رہتا کہ آخری نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم نماز کے دوران کم از کم الفاظ کے معنی پر ضرور غور کریں۔ جو کچھ زبان سے ادا کریں' اسے دل میں بھی دہراتے جائیں کہ ہم کیا پڑھ رہے ہیں۔ خدا کا خوف اور خشیت اگرچہ پیدا نہ ہو' مگر کم سے کم اس بات کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے۔

اس طرح سے نماز ذکر کی وہ صورت بن سکتی ہے جس سے کسی نہ کسی طرح زندگی میں ذکر کو سمویا جا سکتا ہے۔

سجدہ بھی نماز کا ایک حصہ ہے۔ حدیث میں کثرت سجود کی بھی تاکید کی گئی ہے۔

نماز میں ہر رکعت میں کم از کم دو دفعہ سجدہ ہوتا ہے اور دن میں کم سے کم ۳۴ مرتبہ سجدہ ہوتا ہے۔ اگر نماز کے علاوہ بھی آدمی کو موقع ملے اور وہ تنہائی میں ہو تو اسے چاہیے کہ دل کی نرمی کے لیے اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو جائے اور اپنی پیشانی اس کے آگے ٹیک دے۔ اس سے کچھ بات کر لے' چاہے ایک مرتبہ ہی ''سبحان اللہ'' کہے۔ میرے ذاتی تجربے میں یہ بات ہے کہ کچھ رفقا کو میں نے اس کا مشورہ دیا' انھوں نے اس پر عمل کیا اور اس کا انھیں بہت فائدہ ہوا۔

قیام لیل کرنا اور آٹھ رکعت تہجد پڑھنے کا اہتمام کرنا ہر ایک کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ روزمرہ زندگی میں ہر ایک کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اہتمام سے ذکراذکار کے لیے وقت نکال سکے۔ اگر کر سکے تو بہت اچھا ہے' لیکن اگر کچھ بھی نہ کر سکتا ہو تو آدمی سونے سے قبل صرف دو منٹ کے لیے اپنی پیشانی اللہ کے حضور ٹیک دے اور کوئی دعا مانگ لے۔ اسی طرح فجر کی نماز سے قبل دو منٹ کے لیے سجدہ ریز ہو جائے' کوئی دعا مانگ لے یا کوئی آیت پڑھ لے۔ یہ کم سے کم ہے جو ہر آدمی کہیں بھی' کسی بھی وقت' تھوڑی سی توجہ سے کر سکتا ہے۔ قرآن مجید نے خود اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تم سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ ۝ (العلق ۹۶: ۱۹)

اور سجدہ کرو اور (اپنے رب کا) قرب حاصل کرو۔

سجدہ' اللہ کے قریب ہونے کا اور اس کو یاد رکھنے کا بہترین طریقہ ہے۔

موت کو یاد رکھنا

تیسری اور چوتھی چیز بہت اہم ہیں۔ ایک' موت کو یاد رکھنا۔ دوسرے' قرآن مجید کی تلاوت کرنا۔

حضورؐ نے فرمایا ہے کہ میں تمھارے درمیان دو مرشد چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ ان میں

ایک مرشد ساکت، ''خاموش مرشد'' ہے اور دوسرا مرشد ناطق، ''بولنے والا مرشد'' ہے:

المرشد الساکت فھو الموت ' المرشد الناطق فھو القرآن

خاموش مرشد موت ہے' اور بولنے والا مرشد قرآن ہے۔

گویا جس نے ان دو مرشدوں' پیروں کا دامن پکڑ لیا' وہ اپنی زندگی میں بالکل صحیح راستے پر چلے گا۔ جس نے موت کا دامن پکڑ لیا' یعنی موت کو یاد رکھا اور قرآن کی تلاوت کی' اسے سمجھا' اور اس کی پابندی کی تو یہ دونوں پیرومرشد ایسے ہیں جو آدمی کو انگلی پکڑ کر صحیح راستے پر چلاتے ہیں۔

آپ بھی تجربہ کر کے دیکھیے' آپ کو محسوس ہوگا کہ جب تک آدمی موت کو یاد رکھے' قرآن پڑھتا رہے تو وہ سیدھے راستے پر رہتا ہے۔ گناہ اور غلطیوں سے کسی آدمی کو مفر نہیں۔ لیکن قرآن پڑھنے والا اور موت کو یاد رکھنے والا ہو تو جنت اور دوزخ کا ذکر پڑھنے پر نادم ہو کر لوٹ کر آئے گا اور اپنی غلطی پر معافی مانگے۔ الا یہ کہ اس نے تلاوت قرآن کو محض ایک رسم بنا لیا ہو۔

جہاں تک موت کو یاد رکھنے کا تعلق ہے تو اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔ البتہ تلاوت قرآن کے بارے میں کچھ تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

تلاوتِ قرآن

قرآن کی تلاوت کے بغیر کسی انسان کا دل مطمئن نہیں ہوتا' خاص طور پر ان کا جو قرآن کو قائم کرنے کے لیے کھڑے ہوئے ہوں' اور سب کو پکار رہے ہوں کہ قرآن کی طرف آؤ۔ وہ لوگ جن کا مشن دعوت الی القرآن ہے' جن کی زندگی کا نصب العین قیام قرآن ہے' اگر ان کے دن' ہفتے اور مہینے اس طرح گزر جائیں کہ قرآن سے ان کا کوئی ربط ہی نہ ہو' تو یہ کسی المیے سے کم نہیں!

قرآن سے انسان کا تعلق مضبوط ہونا چاہیے۔ ممکن ہو تو روزانہ کچھ نہ کچھ وقت قرآن کے لیے مخصوص کرنا چاہیے۔ تلاوت قرآن کے حوالے سے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر یہ صحیح شرائط کے ساتھ ہو تو فائدہ دیتی ہے ورنہ نقصان دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود دونوں باتیں بیان کی ہیں۔ ایک' یہ کہ اس قرآن سے انسان کی زندگی میں اور قوموں کی زندگی میں انقلاب آتا ہے۔ قرآن کے سوا آخر وہ کیا معجزہ تھا جس نے عرب کے چرواہوں اور تاجروں کو ساری دنیا کا لیڈر اور امام بنا دیا۔ وہ لوگ نہ فلسفہ جانتے تھے' نہ ان کے پاس تفسیر اور احادیث کی کتب تھیں' نہ وہ دیگر علوم و مباحث سے آگاہ تھے۔ ان کے پاس تو صرف قرآن اور رسولؐ اللہ کی اطاعت کا جذبہ تھا۔ انھوں نے صدق دل کے ساتھ اپنے آپ کو ان دونوں چیزوں کے سپرد کر دیا تو وہ دنیا کے امام اور قائد بن گئے۔

قرآن نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جو فی الواقع قرآن پڑھتے ہیں ان پر اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔ ان اثرات کے جائزے سے انسان خود اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ قرآن سے اس کا کیسا تعلق ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے:

اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (الانفال ۸ : ۲)

اہل ایمان تو وہ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ (المائدہ ۵ : ۸۳)

تم دیکھتے ہو کہ حق شناسی کے اثر سے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو جاتی ہیں۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۩ (مریم ۱۹ : ۵۸)

ان کا حال یہ تھا کہ جب رحمٰن کی آیات ان کو سنائی جاتیں تو روتے ہوئے

سجدے میں گر جاتے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحۡسَنَ الۡحَدِيۡثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِىَ ۖ تَقۡشَعِرُّ مِنۡهُ جُلُوۡدُ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ ۚ ثُمَّ تَلِيۡنُ جُلُوۡدُهُمۡ وَقُلُوۡبُهُمۡ اِلٰى ذِكۡرِ اللّٰهِ ؕ (الزمر ۳۹:۲۳)

اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے' ایک ایسی کتاب جس کے تمام اجزا ہم رنگ ہیں اور جس میں بار بار مضامین دہرائے گئے ہیں۔ اسے سن کر ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے رب سے ڈرنے والے ہیں' اور پھر ان کے جسم اور ان کے دل نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

اس طرح سے قرآن نے خود ان اثرات کا ذکر کیا ہے جو پڑھنے والوں کے دلوں پر اور جسم پر پڑنا چاہییں۔ اس لیے کہ یہ وہ کلام ہے کہ اگر کسی پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو اللہ کی خشیت سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔

لَوۡ اَنۡزَلۡنَا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيۡتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ ؕ (الحشر ۵۹:۲۱)

اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔

یہ صرف انسان ہی کا دل ہے کہ جو اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ اللہ کا کلام پڑھے اور اس کے اثرات سے بے نیاز رہے۔

قرآن تمام اذکار کا مجموعہ ہے۔ اس میں اللہ کی ساری صفات کا ذکر ہے' جنت اور دوزخ کا ذکر ہے' اللہ کی تسبیح و تہلیل بھی ہے' تمجید و تقدیس بھی ہے۔ اسی لیے قرآن کی تلاوت نماز کے اندر لازم کی گئی ہے۔ نماز کے علاوہ بھی انسان جتنا بھی آسانی کے ساتھ قرآن پڑھ سکے اسے پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے۔

فَاقۡرَءُوۡا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الۡقُرۡاٰنِ ؕ (المزمل ۷۳: ۲۰)

جتنا قرآن آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لیا کرو۔
یعنی انسان کی جتنی بھی مصروفیات اور مشاغل ہوں' ان میں سے جتنا بھی وقت نکال سکے' ضرور نکالے اور اسے قرآن کی تلاوت میں لگائے۔

قرآن کی تلاوت کی شرائط' آداب اور طریقے تفصیل طلب ہیں جن کا احاطہ کرنا یہاں ممکن نہیں' تاہم دل کا حاضر ہونا' جسم کا حاضر ہونا' آنکھوں کا نم ناک ہونا' یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کے حضور میں ہیں' اس کی آیات کا جواب دینا' یعنی جہاں جنت کا ذکر ہوا سے طلب کرنا' جہاں دوزخ کا ذکر ہو اس سے پناہ مانگنا' اللہ کا ذکر ہو تو سُبْحَانَ اللّٰہِ یا اَلْحَمْدُلِلّٰہِ کہنا' یہ سب وہ باتیں ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں۔ انھیں کتابوں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے کرنا چاہیے۔

اس طرح سے انسان کے دو مرشد ہوئے: ایک موت' دوسرا قرآن۔ جس نے ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو پھر وہ چیزیں جن پر میں نے ابتدا میں زور دیا ہے' یعنی ارادہ' دل کی کیفیت' شکر اور استغفار' یہ سب صفات آدمی کو حاصل ہو سکتی ہیں۔

اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا

اس کے بعد پانچویں چیز وہ ہے جسے جان کر شاید آپ کو تعجب بھی ہو' وہ ہے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا۔ اس کے لیے ہم انفاق فی سبیل اللہ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بھی ذکر کا لفظ استعمال کیا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ ج وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ لا فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ (المنٰفقون ۶۳: ۹-۱۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' تمھارے مال اور تمھاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد

سے غافل نہ کر دیں۔ جو لوگ ایسا کریں وہی خسارے میں رہنے والے ہیں۔
جو رزق ہم نے تمھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے
کسی کی موت کا وقت آجائے اور اس وقت وہ کہے کہ "اے میرے رب'
کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح
لوگوں میں شامل ہو جاتا۔

یہاں انفاق کی تعلیم ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ذکر کے حوالے سے اسے بیان کیا ہے۔ اسی آیت سے استنباط کر کے میں نے یہ لفظ ذکر کے لیے استعمال کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مال کی محبت سب سے زیادہ غفلت اور نسیان کا سبب بنتی ہے۔ وہ اللہ کی یاد اور اس کے احکام کی تعمیل سے روکتی ہے۔ پھر' جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ آدمی کا دل ہمیشہ وہیں رہتا ہے جہاں اس کا مال ہوتا ہے۔ اگر مال گھر میں رکھا ہو' یا بنک میں ہو' تو وہاں دل اٹکا رہے گا۔ پہلے زمانے میں لوگ ہانڈیوں اور زمین میں دبا کر مال چھپا کر رکھتے تھے تو وہاں ان کا دل اٹکا رہتا تھا۔ اگر آدمی اپنا مال اللہ کے پاس رکھ دے گا تو دل بھی وہیں اٹکا رہے گا۔ اس لیے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا بھی ذکر کا ایک طریقہ ہے۔

مال خرچ کرنے کے حوالے سے یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ محض ایک لگی بندھی رقم دے دینا مراد نہیں ہے۔ یہ بھی کرنا چاہیے' لیکن دراصل اللہ کی راہ میں مال دینا یہ ہے کہ آدمی مال خرچ کرے تو اسے تھوڑی سی تکلیف یا دل میں کچھ چبھن ہو کہ میں نے کچھ خرچ کیا ہے۔

درحقیقت اللہ کے ہاں مقدار سے زیادہ یہ بات اہمیت رکھتی ہے کہ آدمی اس کے لیے کتنی قربانی دے رہا ہے۔ غزوۂ احد کے موقع پر صحابہؓ کرام رات بھر مزدوری کرتے تھے اور اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے تھے۔ اگرچہ وہ چند درہم ہوتے تھے مگر ان کی بڑی قدر و قیمت تھی۔ اللہ نے ان کا بڑا اعتراف فرمایا تھا۔ بہت سے لوگوں نے بڑی

بڑی رقمیں بھی دیں' ان میں بہت سے منافق سردار بھی تھے' مگر ان کی اتنی تعریف نہیں کی گئی۔ گویا محض چندہ دے دینا' بیت المال کی رسید کٹوا لینا' محض یہی انفاق نہیں ہے' اگرچہ یہ بھی ضروری ہے' لیکن اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے مال کا ایک حصہ اس طرح سے اللہ کی راہ میں برابر دے کہ اس کی چبھن دل میں محسوس ہو۔

تزکیہ نفس کے طریقے' ایک وسیع موضوع ہے۔ میں نے مختصراً اس بحث کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔

تزکیہ نفس دراصل اللہ کا ذکر ہے۔ ذکر کا مفہوم بہت وسیع ہے' اسے بہت پھیلایا جا سکتا ہے۔ مختصراً یہ ہے کہ اپنی سہولت کے لیے ہم ان پانچ طریقوں سے ذکر کا مفہوم متعین کر سکتے ہیں۔

اول: ذکر کے کلمات جن کا ہم اہتمام کریں۔

دوم: نماز' جو ہم پانچ وقت پڑھتے ہیں' وقت بھی دیتے ہیں' وضو بھی کرتے ہیں' اہتمام بھی کرتے ہیں' اللہ کے گھر میں حاضر بھی ہوتے ہیں لیکن جیسے ہم نماز کے اندر داخل ہوتے ہیں ویسے ہی نکل کر' یعنی نماز ختم کر کے باہر چلے جاتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی بدنصیبی ہے کہ وقت بھی لگا' محنت بھی ہوئی' اٹھک بیٹھک بھی ہوئی' یہ سب کچھ ہوا' لیکن اس سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اللہ سے ہم کلامی' سرگوشی' آخری نماز کی سی کیفیت' ترجمے پر غور اور ذکر' سجدے میں قرب کی کیفیت اور تہجد کے اہتمام سے نماز کو حقیقی نماز میں بدلا جا سکتا ہے۔

سوم: موت' جسے انسان جتنی کثرت سے یاد رکھے' صبح و شام' یا دن بھر' اتنا ہی اچھا ہے۔

چہارم: قرآن کی آیات کی تلاوت' اس طرح کہ دل حاضر ہو اور دل کا آیات قرآنی کے ساتھ ربط قائم ہو۔

پنجم: انفاق' یعنی انسان اپنے مال کا کچھ نہ کچھ حصہ اللہ کی راہ میں قربان کرتا

رہے' اور اس انفاق سے اسے کچھ تکلیف بھی اٹھانا پڑے۔

یہ پانچ طریقے ہیں جو قرآن وحدیث کے مطالعے سے معلوم ہوتے ہیں۔ ان پر عمل کرنے سے پھر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ دل زندہ رہتا ہے اور انسان پر وہ تمام اثرات مرتب ہوتے ہیں جن کا ہم نے اس سے قبل ذکر کیا ہے۔

تعلق باللہ

اللہ کی بندگی اور اس کی غلامی، زندگی اور ساری تگ و دو کا مقصود ہے۔ تزکیہ و تربیت ہو یا دعوت، سب کوششوں کا مرکز اللہ کی ذات اور اس کی رضا ہے۔ حکومت الٰہیہ کے بھی معنی یہی ہیں کہ اللہ کی حکومت جہاں قانون کے دائرے میں ہو وہاں اخلاق پر بھی ہو، اور اخلاق کے ساتھ دل پر بھی وہی حکومت کرے۔ ان میں سے اگر کوئی ایک پہلو بھی غائب ہو تو اس کی حکومت مکمل نہیں ہوگی۔ سارے انبیا کی دعوت اور قرآن کی پکار بھی یہی رہی ہے۔

عبادت کی دعوت سے تو ہم واقف ہیں لیکن جنھوں نے قرآن کو پڑھا ہے وہ قرآن کی اس دل نواز پکار سے بھی آشنا ہیں: فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ط (الذّٰریٰت ۵۱:۵۰) ''پس دوڑو اللہ کی طرف''، یعنی اللہ کی طرف بھاگو اور اسی کو اپنا مرکز اور رخ بنا کر تیزی کے ساتھ اس کی طرف جاؤ۔ تزکیہ کے بارے میں بھی ساری باتوں کا خلاصہ قرآن نے یوں بیان کیا ہے:

وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۰۱)

جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پا لے گا۔

یعنی جس نے اللہ کو پکڑ لیا، اس کو سیدھی راہ کی طرف ہدایت دے دی گئی۔

دراصل اللہ پر ایمان ہی اللہ سے تعلق کا نام ہے۔ ہم ''تعلق باللہ'' کی اصطلاح

استعمال کر رہے ہیں لیکن یہ "ایمان باللہ" سے کوئی مختلف چیز نہیں ہے۔ وہ ایمان' جسے قرآن اور نبی کریمؐ نے معتبر ایمان ٹھہرایا ہے' وہ ایمان جو گھٹتا اور بڑھتا ہے' یہ نہیں کہ زبان سے اقرار کر لیا اور پھر ہمیشہ کے لیے ایک حالت پر قائم ہو گئے۔ ایمان کے بارے میں کہا گیا ہے: وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (انفال ۸:۲) "اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے"۔ اس کا مسکن دل ہے: وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (الحجرات ۴۹:۷) "اور اس کو تمھارے لیے دل پسند بنا دیا"۔ دراصل یہ دل سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ بڑی عجیب بات ہوگی کہ ہم دنیا بھر کو اللہ کی طرف بلائیں' اور خود اس بات کی فکر نہ کریں کہ ہمارے دل کا تعلق خود اس کے ساتھ کیا ہے؟ ہم کہیں کہ ہم حکومت الٰہیہ قائم کرنا چاہتے ہیں' حالانکہ خود ہمارے نفس اور ہمارے اندر کی دنیا پر اس کی حکومت قائم نہ ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب تک ہمارے نفس پر حکومت الٰہیہ قائم نہ ہو اس وقت تک ہم لوگوں کو اللہ کی طرف نہ بلائیں۔ لیکن جتنی فکر اس بات کی ہو کہ حکومت الٰہیہ قائم ہو' اللہ کا قانون نافذ ہو' اتنی ہی فکر اس بات کی بھی ہو کہ اس کی حکومت ہمارے اوپر بھی قائم ہو' اور وہی ہمارے اندر کی دنیا پر حکمرانی کرے۔

رب کی معرفت

غلامی اور بندگی اختیار کرنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہمارا آقا کون ہے؟ کیسا ہے؟ اسی بات کو بہت سے لوگ "معرفت الٰہی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ معرفت الٰہی کی سب سے جامع تعریف یہ ہے کہ اللہ کی صفات بھی معلوم ہوں' اس کی مرضی اور نامرضی کا بھی علم ہو' اور یہ بھی معلوم ہو کہ اس کی مرضی پوری کرنے کی صورت میں وہ ہم سے کیا معاملہ کرے گا' اور اس کی مرضی کے خلاف چلنے پر وہ کیا معاملہ کرے گا۔ اس تعریف کو اگر سامنے رکھا جائے تو پورا قرآن دراصل معرفت الٰہی کی ہی تعلیم دیتا

ہے۔ معرفت کے معنی صرف معلوم ہونے کے نہیں ہیں' بلکہ اس طرح پہچاننے کے ہیں جس طرح کوئی شخص اپنے بیٹے یا باپ کو پہچانتا ہے۔ جب پہچانتا ہے تو اس سے محبت بھی کرتا ہے اور تعلق بھی رکھتا ہے' اطاعت بھی کرتا ہے اور شکرگزار بھی ہوتا ہے۔ اگر ہم اچھی طرح پہچان لیں کہ ہمارا رب' مالک اور آقا کون ہے تو اسی آقا کو ہمارے دل پر بھی حکومت کرنی چاہیے' اور ہمارے معاشرے پر بھی۔

اللہ کی صفات' اللہ کی معرفت و پہچان کا ذریعہ ہیں۔ اللہ کی بے شمار صفات کا قرآن مجید میں ذکر ہے اور ان کو اس نے اسماء الحسنٰی کہا ہے۔ یہ نام محض نام نہیں ہیں بلکہ ہر نام ہمیں اپنے رب کی صفات کے کسی ایک پہلو سے متعارف کرواتا ہے۔ ان سب کا احاطہ تو ہم نہیں کر سکتے' لیکن ان میں چار صفات ایسی ہیں جو مختلف پہلوؤں سے بار بار آتی ہیں اور جن کا شعور' احساس' معرفت' ذائقہ اور لذت ہمارے دل کے اندر ہونی چاہیے۔

ایک' اس کی رحمت اور ربوبیت ہے۔

دوسرے' اس کی قدرت ہے۔

تیسرے' اس کا علم اور ہمارے ساتھ قربت ہے۔

اور چوتھے' اس کی کبریائی ہے۔

اکثر اذکار ہم کو انھی چار صفات کی طرف لے کر جاتے ہیں۔

حمد' اس کی تسبیح' اس کی الوہیت کا اقرار' اور اس کی تکبیر' یہ سب کے سب اس کی رحمت اور قدرت' اس کے علم اور اس کی کبریائی کو بار بار ہمارے ذہن میں تازہ کرتے ہیں' اور دل و دماغ کے اندر راسخ کرتے ہیں۔

آیئے دیکھیں کہ رحمت اور ربوبیت کیا چیز ہے؟

رحمت اور ربوبیت

رحمت اور ربوبیت میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ اصل چیز رحمت ہے' اور ربوبیت اور پرورش اس رحمت کا مظہر ہیں۔ اسی کے ذریعے ہم اس کی رحمت کو پہچانتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ کس کس طرح پرورش اور داد و دہش کا معاملہ کر رہا ہے۔ ربوبیت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ ہمارا آقا و مالک ہے' اس لیے کہ سب کچھ وہی دے رہا ہے۔ فی الواقع ربوبیت بھی اس کی رحمت کا ایک پہلو ہے اور وہی اس کی سب سے زیادہ نمایاں صفت ہے۔ یہ حقیقت ہماری اپنی زندگی میں اور کائنات کے گوشے گوشے میں ظاہر ہے۔ اگر آدمی آنکھیں کھول کر دیکھے تو یہ ممکن نہیں کہ اس کا دل اس کی اس رحمت کو محسوس کیے بغیر اور اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ''اللہ'' کے بعد جس نام کو اپنے لیے سب سے زیادہ پسند کیا ہے وہ ''رحمٰن'' کا لفظ ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ اس نے ''رحمٰن'' کو تقریباً اسم ذات کے طور پر استعمال کیا ہے۔

''اللہ'' کا لفظ کہاں سے نکلا ہے؟ اس کے بارے میں ہمارے علما کی رائے مختلف ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل ''ولہ'' سے نکلا ہے۔ اس کے معنی محبت کے ہیں۔ ہم اپنی زبان میں بھی والہانہ کا لفظ بولتے ہیں' یہ لفظ بھی اسی سے نکلا ہے۔ دراصل اللہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ جو بہت پیار کرتا ہو' محبت کرتا ہو اور رحمت کرتا ہو۔ خود لفظ اللہ میں بھی یہ مفہوم شامل ہے۔ لیکن رحمٰن کا لفظ بھی قرآن کے ہر صفحے پر اور ہر جگہ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ تم اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر پکارو' ایک ہی بات ہے' اس لیے کہ اللہ کی سب سے نمایاں صفت رحمٰن ہی ہے۔

اسی طرح اللہ کے دوسرے بے شمار صفاتی نام ہیں جو اس کی رحمت کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ''رحمٰن'' کے معنی ہیں جس کی رحمت اپنی انتہا پر ہو۔ اسی کے ساتھ ہم ''رحیم'' کا لفظ بولتے ہیں۔ زندگی کا ہر کام ہم ان ہی دو ناموں کو لے کر شروع

کرتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ جو کام ان دونوں ناموں کو لے کر نہ شروع کیا جائے' حضورؐ کے بقول' وہ بے اصل اور بے نتیجہ ہوتا ہے۔ ''رحیم'' کے معنی ہیں کہ جو نہ صرف اپنی ذات میں بے انتہا رحمت رکھتا ہو' بلکہ مسلسل رحمت کا عمل کر رہا ہو' رحمت بانٹ رہا ہو' یہاں بھی اور آخرت میں بھی۔

اللہ کا ایک صفاتی نام ''ودود'' ہے جس کے معنی پیارے اور محبوب کے ہیں۔ اس کا ایک نام ''رؤف'' ہے۔ رؤف کا لفظ عربی زبان میں ان جذبات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ایک باپ کے اپنے بیٹے کے لیے ہوتے ہیں۔ قرآن نے دوسرے مذاہب کی طرح باپ اور بیٹے کا لفظ براہ راست استعمال نہیں کیا' اس لیے کہ ان سے شرک پیدا ہونے کا خدشہ ہے لیکن ہم اپنی زندگی میں چیزوں کو انھی چیزوں اور تجربات سے پہچانتے ہیں جو ہم جانتے اور کرتے ہیں۔ ہماری زندگی میں محبت اور رحمت کے جو تجربات ہیں ان میں بیٹے کے لیے باپ کی محبت وشفقت معروف ہے۔ ایک مذہب نے تو خدا کو اسی بنا پر باپ قرار دے دیا کہ اس کی یہ صفت باپ کی محبت اور رحمت کی ہے۔ ''رؤف'' کا لفظ اسی پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح ''حنان'' کا لفظ عربی زبان میں ان جذبات کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ایک ماں اپنے بچے کے لیے رکھتی ہے۔ اس طرح سے اللہ کے بہت سے صفاتی نام ہیں' مثلاً' سلام: سلامتی دینے والا' مومن: امن دینے والا' مہیمن: حفاظت کرنے والا' حافظ: حفاظت کرنے والا۔ ان میں سے ہر نام رحمت کے کسی نہ کسی پہلو کی نشان دہی کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق کو' یعنی ہماری پیدایش کو' اور ہمیں قرآن سے ہدایت دینے کے عمل کو بھی اپنی ''رحمٰن'' کی صفت سے نسبت دی ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ o عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ o عَلَّمَهُ الْبَیَانَ o (الرحمٰن ۵۵: ۱-۴)

نہایت مہربان (خدا) نے اس قرآن کی تعلیم دی ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا

کیا اور اسے بولنا سکھایا۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اس کی رحمت ویسے تو سارے انسانوں کے لیے عام ہے لیکن اس رحمت کا ایک حصہ ان کے لیے خاص ہے جو اس پر ایمان لائے۔

وہ رحمت کا معاملہ خاص طور پر مومنین کے ساتھ کرتا ہے۔

كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ (الانعام ۶ : ۵۴)

تمھارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی حاجت نہیں تھی اور ہمارا اس کے اوپر کوئی ایسا حق نہیں تھا کہ وہ ہمارے ساتھ رحمت کا برتاؤ کرے۔ لیکن اس نے اپنے اوپر رحمت کو لازم کرلیا۔

حضورؐ نے اس بات کو بڑی ہی دلدوز مثالوں کے ساتھ واضح کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ماں اپنے بچے کو آگ میں ڈال دے گی؟ لوگوں نے کہا: نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تم لوگوں سے تمھاری ماں سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اب تم لوگ خود ہی سوچو کہ تم لوگ کتنی بڑی نافرمانی کرو گے جس کی سزا کے طور پر بالآخر تمھیں آگ میں ڈالا جائے گا۔

گناہوں کے مقابلے میں یہی رحمت بندے کا سہارا ہے۔ ایک طرف تو یہ بات صحیح ہے کہ آخرت میں جو کچھ بھی پیش آئے گا وہ اعمال کا نتیجہ ہوگا: هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ (النمل ۲۷: ۹۰) "کیا تم لوگ اس کے سوا کوئی اور جزا پا سکتے ہو کہ جیسا کرو ویسا بھرو"؟ یعنی جو تم کرو گے اسی کا بدلہ تم کو دیا جائے گا۔ لیکن اگر اعمال کے ساتھ رحمت، عفو اور مغفرت نہ ہوتی تو ہم میں سے کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی بندگی کا حق ادا کر دیا ہے! اس کی رحمت، عفو اور مغفرت کا ہی سہارا ہے جس کے تحت یہ منزل طے ہوسکتی ہے۔ اس لیے اپنے تمام معاملات میں، اللہ تعالیٰ سے تعلق میں، اس کی رحمت کو سب سے زیادہ غالب رکھنا چاہیے۔ اس سے ایمان میں حوصلہ، امید، شگفتگی، تازگی اور شادابی پیدا ہوتی ہے۔

اسی رحمت کا ایک تقاضا خوف بھی ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔ خوف اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ بڑی پکڑ کرنے والا' سزا دینے والا اور منتقم ہے بلکہ اس لیے کہ جو اتنی رحمت کرنے والا ہے' اگر اس سے بھی ہمارے حصے میں سزا آئے اور رحمت چھن جائے' تو ہمارا کیا ٹھکانا ہوگا۔ اس بات کا ڈر آدمی پر طاری ہونا چاہیے۔ اسی لیے قرآن کریم نے خشیت کے مقابلے میں اپنی نسبت ہمیشہ رحمٰن کے ساتھ کی ہے۔ مَنْ خَشِیَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَیْبِ ٥ (ق ۵۰:۳۳) ''جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا''۔ یہ ایک عجیب سا جوڑ ہے کہ آدمی انتہائی رحمت کرنے والے سے ڈرتا ہے۔ اسی لیے خشیت کی نسبت جبار اور منتقم کے ساتھ نہیں' بلکہ رحمٰن کے ساتھ ہے۔ قیامت کا ذکر کرتے ہوئے بھی رحمٰن کی صفت کا ذکر فرمایا گیا: وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا (طٰہٰ ۲۰:۱۰۸) ''اور آوازیں رحمٰن کے آگے دب جائیں گی' ایک سرسراہٹ کے سوا تم کچھ نہ سنو گے''۔

ہر جگہ اس کی رحمت جلوہ افروز ہے' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ ہر جگہ وہ اسی رحمت کا برتاؤ انسانوں کے ساتھ کر رہا ہے۔ اس لیے ہمیں کام کرتے ہوئے' اس کی راہ میں چلتے ہوئے' اس کی اطاعت کرتے ہوئے' سب سے پہلے جس چیز کا خیال رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم بڑے ہی رحمٰن اور رحیم آقا کا کام کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہمارا معاملہ اور ربط ہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ اس سے بڑے ہی اچھے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بڑا مضبوط تعلق تعمیر ہوتا ہے۔

قدرت

اللہ تعالیٰ کی دوسری نمایاں صفت اس کی قدرت ہے۔

اِنَّهٗ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (حم السجدہ ۴۱: ۳۹)

یقیناً وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہ بات بھی قرآن مجید میں آئی ہے کہ کوشش ہو یا قوت' اس کا سرچشمہ صرف خدا کی

ذات ہے۔ ہم **لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ** بار بار کہتے ہیں۔ یہ محض شیطان کو بھگانے کا نسخہ نہیں ہے' بلکہ دراصل اس بات کا اعتراف ہے کہ جو وہ چاہتا ہے' بس وہی ہو گا۔ ہماری قوت اور کوشش یا کسی دوسرے انسان کی قوت یا کوشش میں کوئی اثر نہیں ہے' جب تک کہ اس کی طرف سے تائید یا منظوری حاصل نہ ہو۔ اس کے لیے کوئی چیز بعید نہیں ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے۔ ہر ایک اس کا محتاج ہے۔ وہ سب سے بے نیاز ہے۔ وہ صمد ہے۔ یہ بات مختلف انداز میں مختلف مواقع پر کہی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ نفع ونقصان صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ اگر وہ نفع پہنچانا چاہے تو کوئی اس کو نقصان میں نہیں بدل سکتا۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۭ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (الانعام ۶:۱۷)

اگر اللہ تمھیں کسی قسم کا نقصان پہنچائے تو اس کے سوا کوئی نہیں جو تمھیں اس نقصان سے بچا سکے' اور اگر وہ تمھیں کسی بھلائی سے بہرہ مند کرے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اسی لیے اللہ کے نبیؐ نے ہر نماز کے بعد اس دعا کی تعلیم دی ہے:

اللّٰهُمَّ لا مانِعَ لِمَا اَعطيتَ ولا مُعطِيَ لِمَا مَنَعْتَ ولا يَنْفَعُ ذا الْجَدِّ مِنْكَ الْجِدّ –

جو تو دے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ اگر تو روک لے تو کوئی دے نہیں سکتا۔ اور کوئی طاقت اور مرتبے والا کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا سوائے تیرے..........

چنانچہ خوف ہو یا امید' اس کی نسبت صرف اسی کے ساتھ ہی ہو سکتی ہے' کسی بندے کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ جب ایمان دل میں داخل ہو تو مخلوق کا خوف دل سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ مخلوق اور خالق دونوں کا خوف بہ یک وقت دل کے اندر نہیں سما سکتا۔ قرآن نے خود کہا ہے: **فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ** ۗ (البقرہ ۲:۱۵۰) ''ان سے تم نہ ڈرو' بلکہ مجھ سے ڈرو''۔

یہ کیفیت ایمان کے ساتھ ہی آ جاتی ہے' خواہ عمل میں کتنا ہی وقت لگے۔ اس کی بہترین مثال فرعون اور جادوگروں کے قصے میں ہے۔ درباری قسم کے لوگ' دو ٹکے کے لوگ' جادو کے ذریعے کمانے والے لوگ' دربار میں آئے تو کہنے لگے کہ حضور' اگر ہم کامیاب ہو گئے تو کیا انعام ملے گا؟ فرعون نے کہا کہ ہاں' مزدوری ملے گی۔ تم میرے مقرب، مصاحبوں میں سے ہو جاؤ گے۔ مگر جیسے ہی ان پر انکشاف حق ہوا تو انھوں نے کہا:

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o رَبِّ مُوْسٰی وَھٰرُوْنَ o (الاعراف ۷: ۱۲۰-۱۲۱)

کہنے لگے "ہم نے مان لیا رب العالمین کو' اس رب کو جسے موسیٰ اور ہارون علیہم السلام مانتے ہیں"۔

فرعون نے کہا: اچھا! تم نے میرے خلاف سازش کر رکھی تھی۔ میں تمھارے ہاتھ کاٹوں گا' تمھارے پاؤں کاٹوں گا اور تمھیں سولی پر چڑھا دوں گا۔ انھوں نے کہا:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالَّذِیْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ط اِنَّمَا تَقْضِیْ ھٰذِہِ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا o (طٰہٰ ۲۰: ۷۲)

قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے' یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم روشن نشانیاں سامنے آ جانے کے بعد بھی (صداقت پر) تجھے ترجیح دیں۔ تو جو کچھ کرنا چاہے کر لے۔ تو زیادہ سے زیادہ بس اسی دنیا کی زندگی کا فیصلہ کر سکتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ دل میں ایمان کے آتے ہی دل سے مخلوق کے خوف کی ساری کیفیت دور ہو گئی۔

اس بات سے اپنے اوپر ناز' بڑائی اور فخر کی جڑ بھی کٹ جاتی ہے۔ پھر یہ کیفیت آتی ہے کہ آدمی یہ کہتا ہے کہ ہم نے کیا کیا ہے' یہ سب تو اسی (اللہ) نے کیا ہے۔ غزوۂ

بدر کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا:

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
رَمٰی ۚ (الانفال ۸:۱۷)

پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے
نبیؐ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔

یہاں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اپنے اوپر ناز' اپنی کوشش پر فخر یا کسی قسم کا بھی کبر نہیں ہونا چاہیے۔ کسی بھی قسم کا فخر یا کبر' اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تصور کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا۔

حاضر و ناظر

تیسری صفت جس کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ (الحدید ۵۷:۴)

وہ تمھارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔

اس وقت بھی وہ ہمارے ساتھ ہے۔ اگر ہم اپنے کمرے میں اکیلے ہوں گے تو بھی وہ ہمارے ساتھ ہے۔ تین ہوں' تو چوتھا وہ ہے۔ چار ہوں' تو پانچواں وہ ہے۔ خود قرآن نے انھی الفاظ میں اس کی قربت اور ساتھ ہونے کو اسی تشبیہ سے واضح کیا ہے کہ یہ مت سمجھو کہ تم اکیلے ہو' تم دو ہو یا تین یا زیادہ' ہمیشہ ایک سے زائد وہ موجود ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝ (ق ۵۰: ۱۶)

ہم شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

گویا ہم تو تمھارے خون سے بھی زیادہ تم سے قریب ہیں جو شہ رگ میں گردش کرتا ہے۔ ہم ان خیالات سے بھی واقف ہیں جو دل میں اٹھتے ہیں اور ان میں سے کوئی بھی چیز ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ (آل عمرٰن ۳: ۱۵۴)

اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

یہ علم صرف علم نہیں ہے بلکہ اس کی قربت‘یعنی اس کا ہمارے ساتھ ہونا ہے۔ یہ تیسری چیز ہے جو معرفت میں شامل ہے۔

اللہ کی کبریائی

چوتھی صفت یہ ہے کہ کوئی اس سے بڑا نہیں ہے۔ اس کی کبریائی‘ ہر کبریائی پر غالب ہے۔ دراصل حکومت الٰہیہ کے معنی ہی یہ ہیں کہ اس کی کبریائی قائم ہو۔ اللہ نے اپنے نبیؐ کو سب سے پہلے جب یہ فریضہ سپرد کیا تھا تو انھی الفاظ میں کیا تھا:

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْo (المدثر ۷۴:۳)

اور اپنے رب کی کبریائی بیان کرو۔

یعنی اس کی دعوت دو‘ اس کی طرف بلاؤ اور اس کی کبریائی کو قائم کرو۔ اس لیے کہ اس سے بڑا کوئی نہیں ہے۔ وہی سب کو تھامے ہوئے ہے۔ ہر چیز اسی پر منحصر ہے۔ کوئی چیز اپنی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

میں نے ان چار صفات کا انتخاب اس لیے کیا کہ ان کا قرآن میں بار بار تذکرہ آتا ہے۔ اللہ کی دیگر صفات بھی ہیں جن کا قرآن میں اور احادیث میں ذکر آتا ہے۔ مگر ہم یہاں ان کا احاطہ نہیں کر رہے ہیں۔ یہ چار صفات ایسی ہیں جن کو اگر ہم بار بار اپنے سامنے رکھیں‘ اور اختیار کریں تو اس سے ہمارا علم‘ ہمارا عمل‘ ہمارا ایمان‘ دل کی کیفیت‘ سب کچھ بہتر ہوگا اور اس کے نتیجے میں ہماری کوششوں کے اندر جان پڑ سکتی ہے اور ہم بہت سے فتنوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ قدرت صرف اسی کے پاس ہے‘ نفع ونقصان صرف اسی کے ہاتھ میں ہے‘ کسی مخلوق کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے‘ اگر صرف لاحول ولا قوۃ الا باللّٰہ ہی پر آدمی کا صحیح معنوں میں ایمان ہو جائے تو نہ معلوم کتنے ہی فتنے‘ جو دل میں اٹھتے ہیں‘ ان کی جڑ کٹ سکتی ہے۔

یہ چار صفات نہایت اہم ہیں۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ اللہ کی ہر صفت اہم ہے۔ میں اس گستاخی کا مرتکب نہیں ہو رہا کہ اللہ کی کوئی صفت اہم ہے اور کوئی کم اہم ہے۔ ان چار صفات کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان کا' یعنی اپنی رحمت' اپنی قدرت اور ہر چیز پر اپنے غالب ہونے کا' بار بار اور کثرت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ میں نے کبریائی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ قرآن مجید میں اس کی بہت ساری تعبیریں ہیں اور مختلف الفاظ میں ان کو بیان کیا گیا ہے۔ میں نے اس کا انتخاب اس لیے کیا ہے کہ اذکار میں ''اللہ اکبر'' کے ذریعے ہی ہمارے دلوں اور ذہنوں میں اس کو راسخ کیا گیا ہے۔

تعلق باللہ کی نوعیت

یہ ان صفات کا ایک پہلو ہے کہ ہم نے یہ پہچانا کہ ہمارا رب کیسا ہے اور کون ہے؟ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہمارے تعلق کی کیا نوعیت ہونی چاہیے۔

شکر

، اللہ کے ساتھ سب سے پہلا تعلق' شکر کا ہے۔

غور کیجیے کہ قرآن مجید کا آغاز ہی لفظ ''الحمد'' کے ساتھ ہے۔ بندہ اپنے رب کو جب پہچانتا ہے تو اس کی نعمتوں کے ذریعے پہچانتا ہے۔ اس کا پہلا اظہار جو زبان سے ہوتا ہے' یا پہلا احساس جو دل کے اوپر غالب آتا ہے اور جس کے نتائج عمل پر منتج ہوتے ہیں' وہ شکر کا اور اس کی تعریف کا احساس ہے۔ گویا معرفت الٰہی' قرب الٰہی اور اللہ سے تعلق اور ایمان کا پہلا قدم' پہلی بنیاد اور پہلا درس' شکر ہے۔ اگر قرآن کی دعوت پر غور کیا جائے تو اس نے سب سے پہلے شکر کی دعوت دی ہے اور شکر کو بندگی کی بنیاد بنایا ہے۔ اللہ کی بندگی کرو تا کہ تم شکر ادا کر سکو۔ رزق اس سے ملتا ہے' اسی کی بندگی کرو تا کہ تم اس کے رزق کا شکر ادا کر سکو۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥ (الانفال ۸:۲۶)۔

یہ بات ایک جگہ نہیں کہی گئی بلکہ کئی جگہ اسے دہرایا گیا ہے' یعنی بندگی اور عبادت ہی کے ذریعے اس کا شکر ادا ہو سکتا ہے۔

شکر کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی بندگی کرے۔ بندگی تو پوری زندگی ہے' ایک طرزِ عمل ہے لیکن شکر دراصل اس کا جواز اور بنیاد ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اکثر کفر اور شکر کو ایک دوسرے کے مقابلے میں بیان کیا ہے' یعنی آدمی شکر کا راستہ اختیار کرے یا کفر کا:

اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا ○ (الدھر ۷۶:۳)

خواہ شکر کرنے والا بنے یا کفر کرنے والا بنے۔

اللہ تعالیٰ نے شکر کے مقابلے میں محض ناشکری یا غفلت کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ کفر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ کفر کے معنی ناشکری کے بھی ہوتے ہیں اور انکار کے بھی۔ قرآن مجید میں کفر کے بہت سے معنی ہیں۔ شکر کے مقابلے میں بالکل انکار کے معنوں میں بھی کفر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سارے تعلق کی بنیاد شکر ہے' نہ کہ خوف اور دہشت۔ محبت کے ساتھ شکر کرنے سے اللہ سے تعلق پروان چڑھتا ہے۔ یہ جڑ ہے۔ اس جڑ سے بہت سے پھل پھوٹتے ہیں جن میں خشیت' توکل' صبر اور دیگر بہت سے پہلو ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حمد اور شکر میں کیا فرق ہے؟ حمد کے اندر تعریف بھی شامل ہے' اور شکر کے اندر صرف ممنونیت کا احساس اور اظہار شامل ہے۔ حمد' شکر سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ شکر کے اندر ذاتی تعلق نمایاں ہے۔ اس کا تعلق اللہ کے ساتھ ہے جو اللہ کی نعمتوں پر اظہارِ تشکر کا باعث بنتا ہے' جب کہ حمد' یعنی تعریف کسی خوبی پر ہی ہوتی ہے جو خود اس کے وجود میں پائی جاتی ہو۔ اس لیے یہ لفظ شکر سے زیادہ وسیع ہے۔ اسی لیے حمد کا ترجمہ کرتے ہوئے ''ساری تعریفیں'' بھی ترجمہ ہوتا ہے اور ''سارا شکر'' بھی ترجمہ کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید نے کہا ہے کہ آدمی کو جو کچھ بھی مل جائے' خواہ وہ ایمان ہو' ہدایت ہو یا راہ حق میں کام کرنے کی توفیق ہو' جتنا کچھ اور جو کچھ بھی مل جائے' اس پر شکر لازم اور واجب ہے۔ جو اللہ کی ناشکری کرے گا' اس کو مزید نہیں ملے گا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب ہم احتساب کرتے ہیں تو ہم اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی توفیق ہم کو دی ہے--- فرد کے طور پر' یا اجتماعیت کے طور پر--- ہم اس کو بھی نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اپنے کسی ساتھی کی گرفت کرتے ہوئے یا کسی مسئلے پر رہنمائی دیتے ہوئے ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا اگر آج کوئی مقام ہے تو اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے کہ خود کو کچھ سمجھا جائے اور دوسرے کو حقیر جانا جائے۔ یہ تو سراسر اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں راہ ہدایت دکھا دی۔ مجرد یہ کہ حق کو ہمارے لیے کھول دیا' اس راہ پر لا کر کھڑا کر دیا' صرف اس بات پر ہم جتنا بھی شکر ادا کریں' وہ کم ہے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰنَا لِهٰذَا ۗ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ ۚ (الاعراف ۷: ۴۳)

اور وہ کہیں گے کہ ''تعریف خدا ہی کے لیے ہے جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا' ہم خود راہ نہ پا سکتے تھے' اگر خدا ہماری رہنمائی نہ کرتا''۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ○ (ابراھیم ۱۴ : ۷)

اگر شکر گزار بنو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اور کفران نعمت کرو گے تو میری سزا بڑی سخت ہے۔

یعنی اگر تم نے شکر اختیار کیا تو میں تم کو مزید دوں گا۔ اگر تم نے ناشکری کی تو جو کچھ ملا ہے وہ بھی چھن سکتا ہے۔

اس لحاظ سے یہ بڑے خطرے کا مقام ہے' جس پر ہمیں بڑی احتیاط کے ساتھ

چلنا چاہیے۔ جو کچھ بھی مل گیا‘ نصیب ہو گیا‘ اس پر ہم جتنا بھی شکر ادا کریں‘ وہ کم ہے۔ اس لیے کہ ہم کسی بات کے مستحق نہیں تھے۔ اس پہلو سے سوچنا چاہیے۔ جب ہم ہر نعمت پر شکر ادا کریں گے تو اس کی قدر و قیمت کا احساس پیدا ہو گا‘ اس کے نتیجے میں ہم خود ہی آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے۔ لَاَ زِیۡدَنَّکُمۡ میں یہ بات شامل ہے کہ اللہ مزید دے گا۔ جب ہمیں تھوڑے کی قدر ہو گی‘ تو مزید کی ہم خود بھی کوشش کریں گے اور مزید امانت کے ہم مستحق بھی ٹھہریں گے۔ اس کے مقابلے میں جس آدمی کو جو کچھ ملا ہو وہ اسی کی ناقدری کرے تو اسے مزید کیوں دیا جائے گا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ شکر کے کیا معنی ہیں؟ شکر کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے نعمت ہونے کا شعور ہو۔ اگر یہاں ایک ہیرا پڑا ہو اور آپ اسے ایک پتھر ہی سمجھیں‘ تو یہ آپ کے لیے کوئی نعمت نہیں ہے۔ جو آدمی روزانہ نوالہ توڑے اور روز رات کو میٹھی نیند سوئے اور ٹھنڈے پانی کا گھونٹ پیے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کتنی بڑی نعمت ہے‘ تو وہ اس کے لیے نعمت نہیں ہے۔ جب نعمت نہیں ہے تو شکر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے سب سے پہلے نعمت کا احساس ہونا‘ اور یہ احساس ہونا کہ یہ قیمتی چیز ہے‘ اس کا شعور ضروری ہے۔ قدر و قیمت کا احساس ہی دراصل نعمت کا احساس پیدا کرتا ہے۔ جس چیز کی کوئی قیمت یا قدر ہمارے نزدیک نہ ہو‘ اسے ہم نعمت کیوں شمار کریں گے۔ اس لیے شکر بھی نہیں کریں گے۔ لہٰذا شکر کے لیے کسی چیز کے قیمتی ہونے‘ مفید ہونے اور نافع ہونے کا احساس ناگزیر ہے۔ اس احساس کے بعد پھر انسان میں ممنونیت کی کیفیت پیدا ہو گی‘ جو الفاظ سے بھی ظاہر ہو گی اور عمل سے بھی۔

شکر صرف الفاظ سے ادائیگی کا نام نہیں ہے۔ قرآن نے خود کہا ہے:

اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُکۡرًا ؕ (سبا ۳۴: ۱۳)

اے آلِ داوٗدؑ عمل کرو شکر کے طریقے پر۔

اس لیے محض زبان سے الحمدللہ کہہ دینا اور دل میں اس کا احساس ہو جانا کافی نہیں ہے

بلکہ شکر ایک عمل بھی ہے اور ایک روش بھی۔

اگر آپ نعمت الٰہی کے حوالے سے غور کریں' تو پیدائش سے آخرت تک' ہر مرحلے اور ہر جگہ اس کی نعمتیں ہمارے ساتھ ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ایک قول میں اس پوری بات کو ایک بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے:

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ o وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ o وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ o وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ o وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ p (الشعراء ۲۶: ۷۸-۸۲)

جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا اور پھر دوبارہ زندگی بخشے گا۔ اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روز جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دے گا۔

گویا شروع سے لے کر آخر تک اللہ کی نعمتیں انسان پر حاوی ہیں۔ اگر ہر شخص اپنی زندگی پر خود غور کرے تو بخوبی محسوس کر سکتا ہے کہ کس طرح اللہ کی رحمت قدم قدم پر اس کی دستگیری کرتی ہے' اور کس طرح وہ قدم قدم پر ان نعمتوں کو ہمارے حوالے کرتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زمین سے لے کر آسمان تک ہر چیز خدا کی حمد کرتی ہے' اگرچہ ہم ان کی زبان نہیں جان سکتے۔ اگر غور کیا جائے اور کائنات کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ زمین و آسمان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی حمد نہ کرتی ہو۔ ہر چیز کا وجود اپنے خالق اور بنانے والے کی حمد اور تعریف کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ گویا دنیا میں بھی اس کی حمد ہے اور آخرت میں بھی اسی کی حمد ہے۔ اول بھی اس کی حمد ہے اور آخر بھی اسی کی حمد ہے۔ یہاں تک کہ جب قیامت میں تمام فیصلے ہو جائیں گے' جنتی اپنے اپنے مقام پر پہنچ جائیں گے' تو ان کا آخری کلام بھی یہی ہوگا:

وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o (یونس ۱۰:۱۰)

ساری تعریف اللہ رب العالمین ہی کے لیے ہے۔

یعنی وہ پھر بھی اللہ ہی کا شکر ادا کریں گے اور شکر ہی کی روش اختیار کریں گے۔ اسی لیے فرمایا گیا کہ صبح سے شام تک تمھیں جو بھی نعمت ملتی ہے' وہ اسی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ تم ان کا شمار کرنا چاہو تو شمار نہیں کر سکتے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ (ابراھیم ۱۴ : ۳۴)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔

جب کوئی چیز بہت عام ہو جائے' مسلسل ملتی رہے تو پھر اس کے نعمت ہونے کا احساس ماند پڑ جاتا ہے۔ اگر وہ چیز ہم سے چھن جائے تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ کتنی بڑی نعمت ہم سے چھن گئی۔ پیاس کی حالت میں جان پر بن رہی ہو اور ایک گھونٹ پانی نہ مل رہا ہو' ایسی حالت میں پینے کو پانی میسر آجائے تو ہر گھونٹ جو حلق سے نیچے اترتا ہے' یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی عظیم الشان نعمت ہمیں مل گئی ہو۔

خلیفہ ہارون الرشید کی موجودگی میں کسی بزرگ کے سامنے پانی کا ایک گلاس لایا گیا۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ اگر آپ پیاس سے مرنے لگیں اور پانی آپ کو نہ ملے تو آپ اس کی کیا قیمت دیں گے؟ اس نے کہا کہ میں اپنی آدھی سلطنت دے کر بھی پانی کا گلاس حاصل کرلوں گا۔

سچ تو یہ ہے کہ کتنی بڑی بڑی نعمتیں ہیں جو ہمیں فراوانی سے ملتی ہیں' مستقل ملتی ہیں' اور عام ہیں' لیکن ہم ان کا نعمت ہونا محسوس نہیں کرتے۔ اسی طرح جو مصیبتیں ہم تک نہیں پہنچتیں' اور ٹل جاتی ہیں' ان کا کوئی حساب اور شمار نہیں ہے۔ ان کا ٹلنا بھی نعمت ہے۔

اگر ہم شعور اور عقل کو تھوڑی سی بھی زحمت دیں تو یہ احساس ہوگا کہ زندگی کا کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے جو نعمت سے خالی ہو۔ اسی لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ: جو نعمت بھی میر ے

اوپر ہے یا کسی پر بھی ہے وہ تیری طرف سے ہے۔ یہ ساری حمد اور سارا شکر صرف تیرے لیے ہے۔

''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ'' کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جو آدمی کو بآسانی یاد رہ سکتا ہے اور جب چاہے وہ اس کو کہہ سکتا ہے' اور اسی لیے ہر دعا کے اندر اس کو شامل کیا گیا ہے۔ اگر ہم دل میں اور زبان سے اسے کہنے میں کنجوسی کریں تو یہ مناسب نہیں۔ آج دنیا کی ایک عام روش یہ ہے کہ اللہ کا ذکر بہ آواز بلند کرنے سے آدمی شرماتا ہے کہ کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ کوئی صوفی آدمی ہے یا کوئی ایسا بندہ ہے جو تارک دنیا ہے' جب کہ اللہ کا ذکر بلند آواز سے کرنے کی بڑی ہدایت اور تاکید ہے۔

اس لیے ''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ'' دل میں بھی کہنا چاہیے اور زور سے بھی کہنا چاہیے تاکہ خود بھی یاد آئے اور دوسروں کو بھی یاد آئے۔ جو کوئی اس عمل میں کنجوسی کرے وہ کیسے یہ توقع کر سکتا ہے کہ آخرت میں اس مقام پر پہنچ جائے گا جہاں اسے حمد کرنے کی توفیق ملے گی۔ آخرت میں آدمی کا اعلیٰ مقام یہ ہے کہ وہ اللہ کی حمد اور تعریف بیان کرے۔ آخرت میں یہ مقام اسی کو ملے گا جو دنیا میں اس کام میں مصروف رہا ہو۔

عملی نتائج

عملی روش میں شکر کے بہت سے تقاضے ہیں۔ اس مختصر گفتگو میں ہم چند تقاضوں کو سمجھنے اور سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔

جس بات کی طرف بار بار توجہ دینے کی ضرورت ہے' اور جو انسان کا سب سے بڑا روگ اور بیماری ہے' وہ مایوسی اور ناامیدی کی بیماری ہے۔

اکثر لوگ یہ نہیں جانتے کہ ''ابلیس'' کے معنی 'انتہائی مایوس' کے ہیں۔ ابلیس' اللہ کی رحمت سے مایوس ہو گیا' جب کہ حضرت آدمؑ مایوس نہ ہوئے بلکہ اللہ کی رحمت کی طرف لوٹے۔ چنانچہ دونوں کے درمیان یہی فرق ہو گیا۔ جو شخص مسلسل نعمت کا احساس

کر رہا ہو' مسلسل شکر ادا کر رہا ہو' اس کے ساتھ مایوسی کیسے جمع ہو سکتی ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ:

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ (الزمر ۳۹: ۵۳)

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ۔

اس سے اپنے اوپر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ خود اعتمادی بڑی ضروری صفت ہے لیکن مادی دنیا میں خود اعتمادی کی جڑ یہ ہے کہ میں بہت کچھ کر سکتا ہوں' میری قسمت میرے ہاتھ میں ہے۔ انسان خود اپنی قسمت کا معمار ہے۔ مغرب نے خود اعتمادی کی پوری بنیاد اس پر رکھی ہے' کہ انسان کیا نہیں کر سکتا' وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ لیکن ہماری خود اعتمادی کی بنیاد یہ ہے کہ ہمارا اس رب سے واسطہ ہے جس نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا اور جس چیز کا ہم سے مطالبہ کیا گیا ہے' اس کے لیے وہ سب کچھ فراہم کیا ہے جس سے ہم اپنے امتحان میں پورے اتر سکیں۔ چنانچہ مایوسی' شکر کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح حالات سے بھی مایوسی نہیں ہو سکتی بلکہ حوصلہ ملتا ہے اور ہمت پیدا ہوتی ہے کہ آدمی ناگوار اور تلخ حالات سے عہدہ برآ ہو۔ اس لیے کہ اللہ کا ارشاد ہے:

بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ (آل عمران ۳:۲۶)

اور تیرے ہاتھ میں ساری بھلائی اور خیر ہے

لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۫ (التغابن ۶۴ : ۱)

اسی کے لیے حکمرانی ہے اور اسی کے لیے شکر ہے۔

اس احساس کے نتیجے میں انسان اس کائنات میں شادمانی' خوشی اور کامیابی کے ساتھ کام کرتا ہے۔ جو آخرت پر یقین رکھتا ہے وہ جانتا ہے کہ بالآخر نتیجہ اچھا ہی ہونا ہے۔ خاص طور پر صاحب ایمان کبھی مایوس ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اہل ایمان کو اللہ نے بالخصوص بشارت دی ہے:

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ (التوبہ ۹ : ۱۲۸)

ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔

یعنی مومنین کے ساتھ تو وہ خاص طور پر شفقت اور رحمت کا سلوک کرتا ہے۔

شکر کا ایک پہلو یہ ہے کہ آدمی ہدایت' قرآن' ایمان' اسلام اور اپنے رفقا پر بھی اللہ کا شکر ادا کرے۔ جو لوگ تحریک میں آپ کے ساتھ چل رہے ہیں وہ کیسے ہی کمزور ہوں' اخلاقی طور پر کیسے ہی معیار پر ہوں' وہ آپ کے ساتھی ہیں' ان کی قدر کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی معیت آپ کو بخشی ہے۔ تنظیم کے اندر کچھ بھی خرابیاں ہوں' ان کی اصلاح بھی ضروری ہے اور جائزہ بھی' لیکن اس سے پہلے شکر کرنا ضروری ہے کہ اس نے بری بھلی اجتماعی جدوجہد کی ہمیں توفیق بخشی۔

اسی طریقے سے ہر چیز پر شکر ضروری ہے۔ حسن بصریؒ کی شکر کی ایک بہت طویل دعا ہے۔ اس میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ربنا لك الحمد علٰی ما ھدیتنا ولك الحمد بالاسلام' ولك الحمد بالایمان ' ولك الحمد بالقرآن

اے ہمارے رب ہم تیرا شکر ادا کرتے ہیں جو تو نے ہم کو ہدایت دی' اسلام پر تیرا شکر ادا کرتے ہیں' ایمان پر تیرا شکر ادا کرتے ہیں اور قرآن پر تیرا شکر ادا کرتے ہیں۔

جب شکر کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو جذبات اور ایمان میں نشاط' بہار اور کیف کی مسلسل کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

میں نے اللہ کی ایک صفت یہ بھی بیان کی تھی کہ وہ ہر وقت ہمارے ساتھ ہے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ہم مجرد آنکھیں بند کر کے سوچیں کہ وہ ہر وقت ہمارے ساتھ ہے' اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ اس طرح ساتھ ہو کہ ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ اگرچہ ہم اسے تو نہیں دیکھ سکتے لیکن اس کی نعمت کے عمل کو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ نوالہ منہ میں جا رہا ہے' تو وہ ڈال رہا ہے۔ اس لیے کہ اس نے کہا ہے کہ: **یطعمنی**' وہ مجھے کھلاتا

ہے۔ پانی منہ میں جا رہا ہے تو وہ ڈال رہا ہے۔ اس لیے کہ اس نے کہا ہے کہ: ویسقین: وہ مجھے پلاتا ہے۔ اس طرح آدمی اس کی معیت اور قرب کے احساس کا عملی زندگی میں مشاہدہ کرتا ہے۔

اس طرح یہ احساس کہ آدمی اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ اپنے ساتھ محسوس کرے محض ایک فلسفہ نہیں رہ جاتا۔ اس کے ساتھ ہی اللہ سے محبت' اس کا خوف' اس کے ساتھ حسنِ ظن' تقویٰ اور تمام چیزیں جذبہ شکر سے پیدا ہوتی ہیں۔

استغفار

شکر سے آدمی کے اندر ایک قسم کا احساسِ ناز پیدا ہوسکتا ہے کہ ہر چیز تو مل رہی ہے' اب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک قسم کا تساہل اور بےفکری (complacency) کی کیفیت پیدا ہوسکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان بےفکر ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ کے ساتھ تعلق میں جہاں شکر ایک بازو ہے' وہاں اس کا دوسرا بازو استغفار اور توبہ ہے۔ یہ دونوں مل کر ہی دراصل تعلق باللہ کے ایک پہلو کو مکمل کرتے ہیں۔ تعلق باللہ کے اور بہت سے پہلو بھی ہیں۔ مگر ان دونوں کی حیثیت دو بازوؤں کی ہے۔ اگر صرف ایک کو پکڑا جائے گا تو یہ تعلق عدم توازن کا شکار ہو جائے گا۔

استغفار بہت اہم چیز ہے۔ یہ انبیا کرام کی بنیادی دعوت کا جز رہا ہے۔ جہاں نبی نے ربوبیت کی دعوت دی ہے' تقویٰ کی دعوت دی ہے' اللہ پر ایمان کی دعوت دی ہے' وہاں پوری قوم کو توبہ واستغفار کی بھی دعوت دی ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ (ھود ۱۱: ۵۲)

اور اے میری قوم کے لوگو! اپنے رب سے معافی چاہو' پھر اس کی طرف پلٹو۔

حضرت نوح' حضرت ہود' حضرت صالح' حضرت شعیب' حضرت لوط علیہم السلام اور خود حضورؐ نے بھی یہی دعوت دی۔ قرآن مجید میں اس دعوت کو بار بار دہرایا گیا ہے۔

لہٰذا یہ دعوت کوئی جزوی دعوت نہیں ہے بلکہ جس طرح بندگی اور شکر کی دعوت بنیادی دعوت ہے' اسی طرح یہ بھی بنیادی دعوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ اس بات کو واضح کیا ہے' خاص طور پر اگر سورہ نوح کا مطالعہ کیا جائے تو یہ موضوع وضاحت سے ملتا ہے۔ اس سورہ میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی برسوں کی جاں گسل دعوت کا اظہار کیا ہے' یعنی میں نے رات کو بھی پکارا' دن کو بھی پکارا' کھلے بھی پکارا اور چھپے بھی پکارا' اور کوئی طریقہ اٹھا نہیں چھوڑا' لیکن ساتھ ہی آپؑ نے بھی یہی دعوت دی:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا (نوح ۷۱: ۱۰)

میں نے کہا ''اپنے رب سے معافی مانگو۔ بے شک وہ بڑا معاف کرنے والا ہے''۔

یہاں ساری دعوت کو سمیٹ کر استغفار کی دعوت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ استغفار صرف آخرت کے لیے ہی ضروری نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ساری مادی ترقیاں بھی اسی کے ساتھ وابستہ کی ہیں۔ چنانچہ صاف کہا گیا:

يُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ (نوح ۷۱: ۱۱-۱۲)

وہ تم پر آسمان سے خوب بارشیں برسائے گا' تمھیں مال اور اولاد سے نوازے گا' تمھارے لیے باغ پیدا کرے گا اور تمھارے لیے نہریں جاری کر دے گا۔

یعنی وہ تمھارے باغات' کھیتیوں اور زراعت کو ترقی دے گا اور تمھارے لیے پانی کی نہریں بہائے گا جس سے زراعت کو پائیداری اور استقلال نصیب ہوگا۔ یہ ساری دنیاوی نعمتیں اس نے استغفار کے ساتھ وابستہ کی ہیں۔ یہ اسلام کا منفرد پہلو ہے۔ عام طور پر لوگ استغفار کو گناہوں کی معافی تک ہی محدود سمجھتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ استغفار اور توبہ سے کیا مراد ہے؟

استغفار اور توبہ دو مختلف چیزیں نہیں ہیں' بلکہ ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔

استغفار کے معنی ہیں گناہوں سے معافی مانگنا' اورتوبہ کے لغوی معنی پلٹنے' واپس جانے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ استغفار کی روح یہ ہے کہ بندہ دراصل اس بات کو جانتا ہے اور اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے اور وہ رب گناہوں پر پکڑتا ہے۔ انبیا علیہم السلام کی دعوت میں اس کی حیثیت بنیادی ہے۔ پوری دعوت کو استغفار میں سمو دیا گیا ہے۔ جہاں صحیح اور غلط کا اور مواخذے کا احساس ضروری ہے' وہاں اس بات کا احساس بھی ضروری ہے کہ اس کے سوا اور کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔

قرآن نے اعمال کے نتائج کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ جزا وسزا دراصل اعمال ہی کا ردعمل ہے۔ثواب کے معنی ہیں' وہ جو جزا کی صورت میں لوٹ کر آجائے۔ عذاب کے معنی عقب اور پیچھے کے ہیں۔ اردو میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے' یعنی جو چیز گناہ کے پیچھے آئے گی وہ عذاب ہے۔ استغفار دراصل اس چیز کا نام ہے کہ گناہوں کے نتیجے میں جو نتائج رونما ہونے والے ہیں' ان سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔

اس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ ہر وقت ہوشیار اور چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ انسان غفلت کا شکار نہ ہو۔ ہر وقت اپنے احتساب کی بھی ضرورت ہے اور گناہوں کے نتائج سے بچنے کی تڑپ بھی ضروری ہے اور یہ بات بھی کہ صرف اللہ ہی بچا سکتا ہے۔

ہر وقت ہوشیار اور چوکس رہنا اتنا ضروری ہے کہ اس سے کوئی شخص بھی بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ خود حضورؐ نے اپنے بارے میں فرمایا کہ میں دن میں ۷۰ مرتبہ استغفار کرتا ہوں' اور ایک دوسری حدیث کے الفاظ میں' ۱۰۰ مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

جب اللہ کا کامل بندہ' اس کا محبوب بندہ اور اس کا رسولؐ خود دن میں ۷۰ سے ۱۰۰ مرتبہ اللہ کی طرف رجوع کرنے' پلٹنے اور جانے کی ضرورت محسوس کرتا تھا' تو ہم جیسے ناقص بندے اس سے کیسے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا جو لوگ بھی راہ حق پر چلنے والے

ہوں' خواہ آگے چلنے والے ہوں یا پیچھے چلنے والے' ان کے لیے اس کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود بھی بڑی امید دلائی ہے' رحمت کا ذکر کیا ہے اور اپنی شانِ عفو کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ دن کو ہاتھ پھیلاتا ہے کہ رات کا بھولا اب بھی واپس آنا چاہے تو آجائے۔ جب تک آدمی موت کو دیکھ نہ لے' اس وقت تک مغفرت کا دروازہ اس کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اس کی رحمت اس کے عذاب کے اوپر حاوی ہے۔

عملی نتائج

اگر استغفار پر اس طریقے سے غور کیا جائے تو اس کے کچھ عملی نتائج بھی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آدمی کو اپنی غلطیوں کے اعتراف میں تامل نہیں کرنا چاہیے۔ یہ انفرادی طور پر ان غلطیوں کے لیے بھی ہے جو دوسروں کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر سرزد ہوں اور ان کے لیے بھی ہے جو آدمی دوسروں سے برتاؤ میں کرے۔

اس ضمن میں یہ حکم بھی ہے کہ جو گناہ لوگوں کی نگاہ میں نہ آئیں' ان کا اعلان و اظہار ضروری نہیں' الا یہ کہ کسی کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہو۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ غلطیوں کے اعتراف سے آدمی کی عزت اور شان میں کوئی کمی نہیں آتی بلکہ اس کی شان و عزت میں ہمیشہ اضافہ ہوتا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے معاملہ کرتے ہوئے' اپنے غلط فعل کی تعبیر کے مقابلے میں' اپنے غلط رویے اور روش کا اعتراف ہمیشہ مفید ہوگا۔ یہ استغفار کا لازمی تقاضا ہے۔ جو آدمی خدا کے سامنے اپنی غلطی کا اقرار کر رہا ہے' اسے بندوں کے سامنے اعتراف کرنے میں آخر کیا تامل ہو سکتا ہے۔

استغفار سے تواضع اور انکسار بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جو آدمی ہر وقت اپنی غلطیوں پر نگاہ رکھے گا' وہ کبر اور فخر کے اندر نہیں پڑ سکتا۔ اس کے اندر استکبار پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ وہ جس سے بھی معاملہ کرے گا تواضع اور انکسار کے ساتھ کرے گا۔

جو استغفار کرتا ہے وہ انسانوں کو معاف کرنے والا ہوتا ہے۔ جو آدمی یہ توقع

رکھتا ہو کہ اس کے چھوٹے اور بڑے سارے گناہ' اور ساری ناشکرگزاریاں اللہ تعالیٰ معاف کر دے' وہ انسانوں کے ساتھ کیسے سخت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جہاں بھی معاف کرنے کی تاکید کی ہے وہاں اسی طریقے سے متوجہ کیا ہے:

اَلاَ تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ ط (النور ۲۴: ۲۲)

کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمھیں معاف کرے؟

یعنی تم اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ سے اس روش کی توقع رکھتے ہو کہ وہ تمھیں معاف کرے' تو پھر دوسرے انسانوں کو معاف کرنے میں کنجوسی کیوں برتتے ہو؟ اس میں بخل اور ہچکچاہٹ کیوں کرتے ہو؟ چنانچہ انسانوں کو معاف کرنا اسی استغفار کا ایک لازمی حصہ ہے۔

استغفار سے آدمی ان اثرات سے نجات پاتا ہے جو گناہ کے نتیجے میں مرتب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ جب آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے اور جب استغفار کرتا ہے تو وہ دھل جاتا ہے۔

ایک غور طلب پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مادی نعمتوں کو اجتماعی استغفار کے ساتھ کیوں وابستہ کیا ہے؟ یہ بات تو اپنی جگہ درست ہے کہ استغفار سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں لیکن اس کے نتیجے میں آسمان سے پانی کیوں برسے گا؟ فصلیں کیوں اُگیں گی؟ کھیت کیوں لہلہائیں گے؟ پیداوار کیوں بڑھے گی؟ مال میں کثرت کیوں ہوگی؟ اور قوت میں اضافہ کیوں ہوگا؟--- اس کی وجہ یہ ہے کہ قوموں کی زندگی میں احتساب کی بڑی شدید اہمیت ہے۔ جو قومیں اپنے مقاصد اور اخلاق کو سامنے رکھ کر ہمیشہ اپنا احتساب کرتی رہتی ہیں' انھی کے اندر یہ قوت اور طاقت پیدا ہوتی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر کچھ کر گزریں۔ اس کے مقابلے میں جو اخلاق کے معیار کو بہت اعلیٰ رکھیں' اس کو بیان بھی کریں' اور وعظ بھی کہیں لیکن نہ ان کا احتساب ہو' نہ سرزنش ہو اور نہ قوم کو اس بات کی فکر ہو کہ ہم اس کی کتنی پابندی کر رہے ہیں' تو وہ قوم دنیا میں کبھی اوپر نہیں اٹھ سکتی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ o

(الاعراف ۷:۹۶)

اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر انھوں نے تو جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اس بری کمائی کے حساب میں انھیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔

ایمان، تقویٰ، استغفار اور احتساب ہی وہ صفات ہیں جن سے دنیا کے اندر قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ یہ ایمان اگر باطل کے اوپر ہو تو یہ نفاق کے اوپر غالب آئے گا۔اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے ترازو میں نفاق کی کوئی قیمت نہیں ہے، بلکہ منفی قیمت ہے۔ اور اگر ایمان باطل پر بھی ہو تو وہ دنیا میں اپنے نتائج دکھائے گا۔ جن کو اپنے مقاصد پر یقین، ان کے ساتھ عشق ہو اور ان کا ضابطہ اخلاق ہو اور اس کی پابندی ہو اور احتساب بھی ہو، وہی قومیں دنیا کے اندر مادی ترقی بھی حاصل کر سکتی ہیں۔ جو ان اوصاف سے محروم ہوں، وہ مادی ترقی سے بھی محروم رہیں گے۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کے تحت اللہ تعالیٰ نے استغفار کے ساتھ اپنی ساری مادی نعمتوں کو وابستہ کیا ہے۔

تعلق باللہ: عملی تقاضے

اخلاص

اللہ تعالیٰ کی بندگی اور غلامی کی اولین شرط اخلاص ہے۔ اس بات کی تاکید قرآن مجید نے بار بار کی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس طرف توجہ دلائی ہے اور بہت تاکید فرمائی ہے:

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (البینۃ ۹۸:۵)

اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے۔

اخلاص کے دو پہلو ہیں جن کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ پہلا پہلو تو یہ ہے کہ زندگی کے حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے، یعنی زندگی کے کچھ کام اللہ اور اس کی خوشنودی کے لیے کیے جائیں، اور کچھ کام کسی اور کی مرضی و خوشنودی کے لیے کیے جائیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر کام صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے حصول کے لیے ہونا چاہیے۔

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ زندگی کے حصے بخرے نہیں کیے جاسکتے تو اس کا اطلاق عملی زندگی پر بھی ہوتا ہے اور عملی زندگی سے بڑھ کر دل کی زندگی پر بھی ہوتا ہے۔ عملی زندگی میں آدمی بہت سارے کام کرتا ہے مگر اس کا رخ اور مقصود ایک ہی رہنا چاہیے۔

دل میں دوسری محبتیں' اور وفاداریاں بھی ہوسکتی ہیں۔ اس کی اللہ تعالیٰ نے خود اجازت دی ہے لیکن پورے کے پورے دل پر جو محبت اور وفاداری غالب ہونی چاہیے وہ صرف اللہ کی محبت اور وفاداری ہے۔ اس لیے صرف اسی کی خوشنودی اور اسی کی رضا کی تلاش مطلوب و مقصود ہونا چاہیے۔

جہاد ہو یا انفاق' اللہ کے بندوں کے ساتھ تعلق ہو یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تعلق' ہر چیز میں اللہ تعالیٰ نے اسی کی تاکید فرمائی ہے کہ یہ سب اس کے لیے اخلاص کے ساتھ ہونا چاہیے۔ چنانچہ جو لوگ دوسروں کے لیے خرچ کرتے ہیں' ان کو کھانا کھلاتے ہیں' وہ ان سے یہی کہتے ہیں کہ ہم تم سے کوئی بدلہ یا شکریہ نہیں چاہتے' ہم تو یہ سب اس لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے بدلہ اور جزا مطلوب ہے۔ جو آدمی اللہ کی راہ میں مال دیتا ہے' قرآن نے اس کی تعریف اس طرح سے کی ہے:

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓی o اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی (اللیل ۹۲: ۲۰)

اس کے اوپر کسی کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ اسے دینا ہو بلکہ وہ صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا چاہتا ہے۔

یہ چیز ہر پہلو سے ہے۔ جہاد کے ساتھ فی سبیل اللہ کی قید ہے۔ ہماری جدوجہد جہاد ہی ہے۔ نبی کریمؐ نے وضاحت فرمائی ہے کہ جو غصے میں لڑا' حمیت میں لڑا' عصبیت کی خاطر لڑا' قوم کی خاطر لڑا یا کسی کی بھی خاطر لڑا تو وہ جہاد' جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ وہ جہاد ہے جو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کیا جائے۔ اس کے علاوہ کوئی جہاد' جہاد فی سبیل اللہ نہیں ہے۔ فی سبیل اللہ کی قید صرف یہ ظاہر نہیں کرتی کہ صرف اللہ کے دین کے لیے جہاد ہو' بلکہ نیت بھی صرف یہ ہونی چاہیے کہ یہ جدوجہد اللہ کے دین ہی کے لیے ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی اور نیت ہوگی تو وہیں سے اس کے اندر کھوٹ پیدا ہوسکتا ہے۔

اللہ کو صرف اخلاص ہی مطلوب ہے۔ جو لوگ زندگی کے، توجہ کے، دل کے حصے بخرے کرتے ہیں وہی راہِ حق میں عام طور پر سست بھی پڑتے ہیں اور اس کو چھوڑ کر بعد میں بھاگ بھی جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس بات کی بڑی وضاحت کے ساتھ تعلیم دی ہے کہ جو آدمی اپنی زندگی کے حصے بخرے کرتا ہے تو وہ یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ آدھے یا پونے پر راضی نہیں ہے۔ جو یہ سمجھتا ہے کہ میں نے آدھی زندگی اللہ کو دے دی، وہ اسے قبول کر لے گا تو وہ جان لے کہ ایسی بات نہیں ہے۔ گناہ ہو سکتے ہیں، غلطیاں ہوسکتی ہیں، انھیں وہ معاف کر دے گا مگر عزم و ارادہ اور نیت پوری کی پوری وہ صرف اپنے لیے چاہتا ہے۔ اس کی ایک بڑی خوب صورت مثال سورہ انعام میں دی گئی ہے کہ بعض لوگ جانور ذبح کرتے ہیں اور ذبح کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اتنا حصہ تو اللہ کے لیے ہے جسے وہ رب اعلیٰ مانتے تھے اور اتنا حصہ ہمارے دوسرے معبودوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو وہ اللہ کے لیے دیتے ہیں وہ بھی ان کے معبودوں کو ہی پہنچتا ہے۔ اللہ اس کو قبول نہیں کرتا۔

اسی مثال کو اگر وسیع پیمانے پر منطبق کیا جائے تو یہی حال پوری زندگی کا ہے۔ اگر کوئی شخص زندگی کے حصے بخرے کرے کہ یہ حصہ اللہ کے لیے ہے، اور یہ حصہ دنیا کمانے یا میرے دوسرے معاملات زندگی کے لیے ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ اس حصے کو بھی قبول نہیں فرماتا جو اُس کے لیے مخصوص کیا گیا ہو۔ یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ دنیا کمانا، بیوی بچوں اور خاندان کی ضروریات کا خیال رکھنا، یہ سارے کام منع نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ یہ سارے کام بھی اسی ایک مقصد اور صرف اسی ایک نیت کے ساتھ ہونے چاہییں۔ پوری زندگی اُس کو دینے کے یہی معنی ہیں۔

نیت میں جہاں کھوٹ پیدا ہو، اس کو حدیث میں شرک اصغر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک قسم کا چھوٹا شرک ہے کہ آدمی کسی اور کی خاطر کوئی کام کرے۔

اس لیے سب سے بڑھ کر جس چیز کی خود بھی فکر کرنی چاہیے اور اپنے ساتھیوں کو

بھی توجہ دلانی چاہیے وہ یہ ہے کہ جو بھی کام ہو' خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' بہ ظاہر دنیوی کام ہو یا دینی کام' وہ اللہ کے لیے ہو۔ جو کام اللہ کے لیے نہیں ہوگا' وہ بظاہر کتنا ہی دینی کام ہو' اس پر کوئی اجر و برکت نہیں مل سکتی' مثلاً اگر نماز پڑھی جائے اور نیت یہ ہو کہ لوگ دیکھیں اور دین دار کہیں تو یہ نماز دنیوی کام بن کر رہ جائے گی۔ اگر نعرے لگائے جائیں یا پوسٹر لگائے جائیں اور اس میں یہ بات شعوری طور پر پیش نظر ہو کہ یہ سب اللہ کے لیے ہے' اس کی رضا و خوشنودی کے لیے ہے' تو یہ کام ایک دینی کام ہوگا اور اجر کا باعث بھی ہوگا۔

اگر نیت کے اس پہلو کو سامنے رکھا جائے کہ سب کچھ اللہ کے لیے ہے' تو بہت سے ایسے کام جنھیں سیاسی کام کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ ان سے تربیت نہیں ہوتی اور تزکیہ نہیں ہوتا' ان سب سے تربیت و تزکیہ ہو سکتا ہے۔ تربیت و تزکیہ کچھ مخصوص کام کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ آدمی کو ۲۴ گھنٹے میں جو کچھ پیش آئے اور جو کچھ وہ کرتا ہو اگر وہ اس کو صحیح طور پر استعمال کرے تو وہ اس سے اپنی تربیت اور تزکیہ کر سکتا ہے۔ اگر تربیت نہ کرنا چاہے تو نماز اور ذکر جیسی عبادات بھی بے کار جا سکتی ہیں۔ لہٰذا اجتماعی اور تحریکی زندگی کے اندر اہم بات یہ ہے کہ کام کوئی بھی ہو' بڑا ہو یا معمولی' سرکلر لکھنا ہو یا دفتر میں جھاڑو لگانا' اگر آدمی اپنے ذہن میں یہ بات طے کر لے کہ میں یہ اللہ کے لیے کر رہا ہوں' اس کی رضا مجھے مقصود ہے' اس کے علاوہ مجھے کسی سے کچھ نہیں چاہیے تو اس کے بعد وہی چیز اس کی تربیت اور تزکیے کا موجب بنے گی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے گا' اس میں برکت ڈالے گا' اس کے واسطے سے اس کے دل کے اندر اپنی محبت پیدا کرے گا اور اس کی قوت اور استعداد میں اضافہ کرے گا۔ اس طرح قلب کی' جو تزکیہ و تربیت کا منبع ہے' تندرستی اور صحت کا اہتمام ہوگا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بظاہر آدمی پوری زندگی دین کے لیے راہ حق میں گزارتا ہے لیکن دل کے اندر کہیں کھوٹ ہوتا ہے۔ دل کا یہی کھوٹ کسی مرحلے پر جا کر ظاہر بھی ہو جاتا ہے اور ظاہر نہ بھی ہو تو اللہ تعالیٰ اسے دیکھنے اور جاننے والا ہے۔ ایسے بھی لوگ

وہاں دوسری طرف آپؐ اس بات کو اس حد تک بھی نہیں لے کر گئے کہ آدمی اتنی باریک بینی کرنے لگے کہ اپنے سے مایوس ہو جائے۔ مایوسی سے تو ہر جگہ بڑی سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔ لہٰذا آدمی صرف اللہ کی رضا کے لیے کام شروع کرے' پھر یہ دعا کرے کہ اللہ اسے اپنے لیے خالص کر لے۔ اگر درمیان میں غلط خیالات' جذبات اور وسوسے شامل ہو جائیں' تو پھر یہ بھی خیال رہے کہ وسوسوں اور خیالات پر قابو پانا انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اسے چاہیے کہ استغفار کرے اور کام ختم ہونے پر دعا کرے کہ اللہ اسے اپنے لیے خالص کر لے اور قبول کر لے۔ اس کے بعد اپنے کام میں لگا رہے۔

اگر کبھی غلط خیالات' وسوسے اور دیگر مقاصد کا شائبہ ہو تو بھی آدمی کام چھوڑنے کا خیال دل میں نہ لائے۔ یہ کسی صورت میں جائز نہیں۔ بس اس بات کی کوشش میں لگا رہے کہ کام صرف اللہ کے لیے کرے' کوئی ایسا کام نہ کرے جو اس کی مرضی کے خلاف ہو' تو یہ اللہ کو مطمئن کرنے کے لیے اور اس کے انعام کا مستحق بننے کے لیے بالکل کافی ہے۔

اگر کوئی شخص کسی پر تنقید کرے اور کوئی خرابی یا نقص بتائے تو اس کے دو درجات ہو سکتے ہیں۔ ایک درجہ تو یہ ہے کہ آدمی خوش ہو کر قبول کرے کہ تم نے میری اصلاح کی۔ بعض لوگ اس کیفیت تک پہنچ سکتے ہیں' انھیں اس تک پہنچنا چاہیے لیکن یہ انسان کی فطرت ہے کہ اگر کوئی برا کہے' تنقید کرے تو دل میں تھوڑا سا انقباض محسوس ہوتا ہے۔ اگر انقباض دل میں پیدا ہو' یا برا لگے' تو میرے خیال میں یہ ایسی چیز نہیں کہ اسے اللہ تعالیٰ معاف نہ کرے گا لیکن اگر آدمی ناراض ہو جائے' دوسرے کو برا بھلا کہنا شروع کر دے' اس پر تنقید شروع کر دے کہ تمھارے اندر بھی تو یہ خرابیاں اور خامیاں ہیں اور پھر آیندہ کے لیے اس سے دشمنی پال لے' تو یہ باتیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ اب بات آگے بڑھ گئی ہے۔ اب انسانوں کی خوشی اور ناخوشی یا ان کی تعریف و تنقید معیار بنتی جا رہی ہے۔ اب معیار اللہ کی رضا اور خوشنودی اور یہ نہیں رہا ہے کہ اللہ کو کیا مطلوب ہے۔

اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے ہر کام کرنا ہی وہ چیز ہے جس کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ اگر خلوص کے ساتھ عمل تھوڑا بھی ہوگا تو وہ تمھارے لیے کافی ہوگا۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو بہت زبردست محنت بھی کافی نہ ہوگی۔ لہٰذا اس معاملے میں اپنے دل اور نیت کا جائزہ لیتے رہنا بہت ضروری ہے۔ عمل وہ کسوٹی ہے جس سے پتا چل جاتا ہے کہ فی الواقع ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ جہاں بھی یہ محسوس ہو کہ جسے ہم نے مقصد زندگی قرار دیا ہے' اس سے ہم پیچھے ہٹ رہے ہیں' جس کے لیے ہم نے اپنا وقت' صلاحیتیں اور کیریئر سب کچھ لگایا' اب وہی چیز بے معنی ہوتی چلی جارہی ہے' اور اس کی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں' تو وہاں ٹھیر کر اپنا جائزہ لینا چاہیے۔

ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک فرد تحریک سے وابستہ ہے' تربیت گاہوں میں' رات کی تنہائیوں میں' آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں لیکن اگر دل میں دوسرے مقاصد ہوں تو عملی زندگی کے مختلف مراحل پر وہ قابض ہو جاتے ہیں' اور اللہ کی رضا کے لیے جہاد کا مقصد پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ اس تضاد کے نتیجے میں انسان کے اندر جو ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے' اس سے باہر کی زندگی میں بڑے بڑے شگاف نمودار ہوتے ہیں۔ بالآخر عمارت ڈھے جاتی ہے۔ ایسی بہت سی مثالیں مل جاتی ہیں کہ وہ لوگ جو نوجوانی میں بڑے سرگرم' بڑے متحرک' بڑے باعمل اور دین کے لیے بڑے والہانہ جذبات کا اظہار کرنے والے تھے' جہاں دنیا' دنیاوی مستقبل اور مفادات سامنے آئے' وہ ساری کی ساری کیفیت ختم ہو کر رہ گئی۔ اس بات کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اللہ کی رضا کے ساتھ دوسری چیزوں' خواہشات اور مفادات کی طلب شامل رہی تھی یا اللہ کی رضا اتنی غالب اور اتنی خالص نہ تھی' اس میں اتنی قوت نہ تھی کہ جب دیگر خواہشات اور مفادات اپنی دل فریب کشش کے ساتھ سامنے آئیں تو وہ اس کا مقابلہ کرسکتی اور اس کو رد کرسکتی۔ نتیجتاً وہ خواہشات غالب آجاتی ہیں۔ یہ بات ہمیشہ ہمارے سامنے رہنا چاہیے۔

احادیث میں بہت ہی موثر انداز سے اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ ہم ہمیشہ صرف اس بات کی فکر کریں کہ ہمارا ہر کام صرف اللہ کے لیے ہو۔ مشہور و معروف حدیث ہے' حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے حضور میں تین آدمی لائے جائیں گے۔ ایک قرآن کا بہت بڑا عالم ہوگا' دوسرا وہ جس نے اللہ کی راہ میں بہت زیادہ مال خرچ کیا ہوگا' اور تیسرا وہ جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہوگا اور شہید ہوا ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ ہر ایک سے سوال کرے گا۔ قرآن کا علم رکھنے والے شخص سے کہے گا کہ میں نے تمھیں قرآن کا علم دیا' قرأت سکھائی' تم نے اس کا کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں رات دن قرآن پڑھتا رہا' اس کو سکھاتا رہا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: نہیں' بلکہ تو نے یہ صرف اس لیے کیا کہ لوگ تجھے قرآن کا عالم کہیں اور وہ تجھے کہا جا چکا' تیرا اجر تجھ کو مل چکا۔ اس کے بعد اسے سر کے بل گھسیٹ کر لے جا کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ مال دار آدمی سے پوچھے گا کہ میں نے تجھے مال دیا' تو نے اس کا کیا کیا؟ وہ کہے گا: کہ میں نے دن رات دونوں ہاتھوں سے تیری راہ میں خرچ کیا۔ اللہ کہے گا: نہیں' بلکہ تو نے یہ اس لیے کیا کہ لوگ تجھے سخی کہیں کہ کیسا اَن داتا ہے' اللہ کی راہ میں کتنا مال خرچ کرتا ہے۔ یہ تجھے کہا جا چکا' اب تیرے لیے اس کا کوئی اجر نہیں ہے۔ اسے بھی سر کے بل گھسیٹ کر لے جا کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اسی طرح شہید سے پوچھے گا کہ میں نے تجھے یہ سب کچھ دیا' تو نے اس کا کیا کیا؟ وہ کہے گا: میں دن رات تیری راہ میں لڑا یہاں تک کہ میں نے اپنی جان تک تیری راہ میں قربان کر دی۔ اللہ کہے گا: نہیں' بلکہ تو نے یہ سب اس لیے کیا کہ لوگ کہیں کہ کیسا بہادر ہے' کیسا اللہ کی راہ میں لڑنے والا ہے۔ یہ تجھ کو کہا جا چکا۔ اب یہاں تیرے لیے کوئی اجر نہیں ہے اور پھر اس کو بھی پکڑ کر سر کے بل گھسیٹ کر لے جا کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

اس حدیث کو اگر سامنے رکھ کر کام کیا جائے تو پھر اس بات سے بے نیاز ہو جانا چاہیے کہ لوگ کیا کہتے ہیں! تقریر کی اگر تعریف ہو جائے اور دل خوش ہو تو کوئی بات

نہیں۔ لیکن اس تعریف سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں' جب تک کہ وہ تقریر اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول نہ ہو۔ اگر تنقید ہو جائے تو اس میں کوئی نقصان نہیں' اس لیے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہے تو اس تنقید سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس لیے ہر کام میں اس بات کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس کا مقام اللہ کے ہاں کیا ہوگا؟ صرف اسی بنیاد پر کام کیا جائے تو پھر اس سے کام میں اللہ کا رنگ پیدا ہوگا اور برکت ہوگی اور اسی بات سے اللہ کے ہاں اس کی قبولیت بھی ممکن ہو سکے گی۔

اللہ پر بھروسا

اخلاص کے بعد اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جس چیز پر بار بار زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ صرف اللہ پر بھروسا کرو' یعنی توکل کرو۔ اس لیے کہ سب سے اچھا آقا بھی وہی ہے اور سب سے اچھا وکیل بھی وہی ہے۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ (اٰل عمرٰن ۳:۱۷۳)

ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

''وکیل'' کے معنی ہیں جس کو ہم اپنے کام کا ذمہ دار بنائیں۔ دنیا میں بھی وکیل اسے بنایا جاتا ہے جس کے بارے میں یہ یقین و اطمینان ہوتا ہے کہ یہ ہمارا کام کرسکتا اور مقدمہ بخوبی لڑ سکتا ہے۔ دوسرا یقین یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارا معاملہ اور مسئلہ پوری طرح سمجھتا اور جانتا ہے۔ تیسری چیز یہ ہوتی ہے کہ اسے ہمارے مسئلے سے دلچسپی ہے' خواہ یہ دلچسپی فیس سے پیدا کی جائے یا ذاتی تعلقات سے۔ یہ چھوٹی سی مثال ہے ''وکیل'' کو سمجھنے کے لیے۔ وکیل کا لفظ ہمارے ہاں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو کسی کو وکیل بنانے کے پیچھے یہی تین بنیادی باتیں کارفرما ہوتی ہیں: ایک' اس کی قابلیت۔ دوسرے' اس کا علم۔ تیسرے' اس کی دلچسپی۔

اللہ تعالیٰ ان تینوں لحاظ سے نعم الوکیل (بہترین وکیل) ہے۔ اس لیے کہ

اس کا علم ہماری ہر چیز کے اوپر حاوی ہے۔ ہماری ہر ضرورت اس کے علم میں ہے' آنے والی ضرورتیں بھی اور موجودہ ضرورتیں بھی' اور وہ ضرورتیں بھی جو ہماری نظر سے پوشیدہ ہیں' سب اس کے علم میں ہیں۔ گویا اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ یہ اللہ کی وہ صفت ہے جس کا ہم احساس بھی رکھتے ہیں اور شعور بھی۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ کرنا چاہے کر سکتا ہے' اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے۔ یہ دوسری صفت ہے۔ اس کی قدرت پر بھی ہمارا یقین و ایمان ہے کہ ''وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے'' (وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○ ۳:۱۸۹)۔ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ناممکن ہو' وہ ہمارے لیے کرنا چاہتا ہو' اور اس کو نہ کر سکتا ہو۔

تیسری صفت یہ ہے کہ وہ رحمٰن و رحیم ہے۔ اس نے خود ہمیں پیدا کیا ہے اور اس دنیا میں بھیجا ہے۔ ہماری ضروریات سے غافل نہیں ہے۔ اسے ہمارے حال سے گہری دلچسپی ہے۔ وہ ہمیں ہر لمحے تھامے ہوئے ہے۔ ہر سانس اس کی مرضی سے آ رہا ہے اور جا رہا ہے اور اس کی رحمت ہر وقت ہمارے شامل حال ہے۔ رحمت' قدرت' علم اور شکر کی جتنی بھی صفات ہیں' وہ سب اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ بھروسا اور توکّل صرف اللہ تعالیٰ پر ہی کیا جائے۔

توکّل کے معنی دراصل یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے کا ارادہ کر کے پھر ہم سارے کام اس کے سپرد کر دیں۔ لیکن توکّل کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ ہم اپنے حصّے کا کام نہ کریں' اور یہ توقع رکھیں کہ ہمارے بدلے اللہ تعالیٰ آ کر یہ کام کر دے گا۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں اللہ پر بھروسا کرتا ہوں مگر نماز نہیں پڑھتا' تو اس کی یہ بات مناسب نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہم اللہ پر بھروسا کتنا ہی کریں' مگر وہ ہماری جگہ آ کر نماز نہیں پڑھے گا۔ بظاہر یہ مثال بڑی لغو سی محسوس ہوتی ہے' کہ کون آدمی ہے جو یہ ہے کہ میں نماز نہیں پڑھتا' اللہ تعالیٰ پڑھوا دے گا۔ درحقیقت جب تک ہم خود نماز نہیں پڑھیں گے' اللہ تعالیٰ نہیں پڑھوائے گا۔ دنیا کے معاملات میں تو ہم اللہ پر یہ توکّل نہیں کرتے۔

کسان یہ نہیں کرتا کہ گھر بیٹھ جائے اور کہے کہ اللہ تعالیٰ فصل اُگا دے گا بلکہ وہ کھیت میں جاتا ہے' ہل چلاتا ہے' بیج ڈالتا ہے' پانی دیتا ہے اور اس کے بعد اللہ پر توکّل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فصل کو بہترین فصل بنائے۔

کچھ عرصے سے اس اُمت کا دین کے کام کے بارے میں یہ رویہ بن گیا ہے کہ یہ سارا کام اللہ پر توکّل اور دعاؤں سے ہی ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم کو صالح حکمران عطا کرے' اللہ تعالیٰ ہم کو نیک راہ پر چلائے' ہم یہ دعائیں کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام ہو جائے گا۔ توکّل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کام نہ کیا جائے اور اللہ پر بھروسا کیا جائے کہ وہ یہ کام کر دے گا۔ جس طرح وہ ہماری جگہ آ کر نماز نہیں پڑھے گا اسی طرح وہ ہماری جگہ آ کر جہاد نہیں کرے گا' اور نہ اقامت دین کے لیے جدوجہد ہی کرے گا۔ یہ سب کام تو ہمیں ہی کرنا ہیں۔ البتہ ان سب کاموں کا عزم کرنے کے بعد ان کا صحیح خطوط پر چلنا' ان کا صحیح انجام پر پہنچنا' یہ سب کچھ اللہ کے سپرد کر دینے کا نام توکّل ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ کسی شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آ کر یہ پوچھا کہ میں اپنے اُونٹ کو کھلا چھوڑ دوں اور توکّل کروں' یا اُونٹ کو باندھ کر توکّل کروں؟ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اُونٹ کو باندھ دو' اور پھر اللہ پر بھروسا کرو کہ وہ اس کی نگہبانی کرے گا اور حفاظت کرے گا۔

توکّل کے حوالے سے ایک خاص پہلو جو راہِ حق کے لیے کام کرنے والوں کے لیے سمجھنا اور جاننا ضروری ہے' وہ یہ ہے کہ راہِ حق میں کام کرتے ہوئے جب وہ مقامات آتے ہیں جہاں حکمت عملی یا تدبیر سے فیصلے کرنا ہوتے ہیں' وہاں توکّل بڑی ضروری شرط اور صفت ہے۔

توکّل کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم عقل استعمال نہ کریں' فیصلہ نہ کریں اور یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ خود بخود صحیح راہ پر لگا دے گا۔ توکّل کے معنی یہ ہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں' اپنی عقل کو استعمال کریں' اللہ تعالیٰ نے جو کچھ علم اور صلاحیت دی ہے' اس کو استعمال

کریں۔ اس بات کا جائزہ لیں کہ کس کام میں کیا خطرات اور کیا فوائد ہیں؟ اس لیے کہ دنیا کے ہر کام میں کچھ نہ کچھ خطرات اور فوائد ضرور ہوتے ہیں' اور اسی وجہ سے ہمیں کسی نئی راہ اور فیصلے کی ضرورت ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر پرانے کام ہی دوبارہ کیے چلے جانا ہوں تو اس کے لیے کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مشورہ ہمیشہ اسی وقت ہوتا ہے جب کسی پرانے کام کو نئے طریقے سے کرنا ہو' یا کوئی نیا راستہ نکالنا ہو۔ ظاہر ہے نئے راستے میں جہاں فائدے ہوں گے' وہاں خطرات بھی ہوں گے۔ جب ایک دفعہ پوری طرح جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کرلیا جائے کہ یہ کام کرنا ہے تو پھر خطرات کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے اس کام کو کرنا' یہی دراصل وہ توکل ہے جس کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ (اٰل عمرٰن ۳:۱۵۹)

> اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو' اور جب تمھارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے' تو اللہ پر بھروسا کرو۔

یعنی مشورہ کرو اور مشورے کے معنی ہی یہ ہیں کہ سب مل کر بیٹھیں' معاملے پر غور کریں' اور یہ سوچیں کہ کام کیسے ہوگا؟ خواہ معاملہ چھوٹا ہو یا پوری تحریک اسلامی کا' جب کسی بات پر دل ٹھک جائے کہ یہ کرنا چاہیے' تو پھر اس میں جو خطرات اور اندیشے ہوں ان سے بے فکر ہو کر اور انھیں اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے' اس کام کے لیے آگے بڑھ جائیں۔ اس لحاظ سے توکل' تحریک کے معاملات کو چلانے اور انھیں آگے بڑھانے کے لیے بڑی ضروری صفت ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم بعض بڑے اقدامات کے بارے میں یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ہمارے مقصد کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہیں' ان کو اختیار کرنے سے محض اس لیے ہچکچاتے ہیں کہ اللہ سے زیادہ خدشات وخطرات سے ڈرتے ہیں۔ حالانکہ

اللہ پر بھروسا ہو اور ہم یہ طے کرلیں کہ یہ وہ کام ہے جس سے اس کا دین آگے بڑھے گا' تو پھر بہت سارے خطرات اور اندیشے ایسے ہیں جو ہم اللہ کے سپرد کر کے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اوپر بس اتنی ہی ذمہ داری ڈالی ہے کہ ہم سوچ لیں' سمجھ لیں' عقل کا استعمال کریں' ہر چیز کا بغور جائزہ لیں' ایک اچھے اور صحیح فیصلے تک پہنچنے کے لیے جس طریق کار کی ضرورت ہو اسے بروئے کار لائیں' اور اس کے بعد جب کوئی فیصلہ ہو جائے تو پھر اس کے سپرد کر کے آگے بڑھ جائیں۔

توکل سے صبر کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن میں ان دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ پر بھروسے کے بعد پھر بے صبری' مخالفتوں سے ڈر جانے اور اپنے راستے سے ہٹ جانے کا کوئی امکان نہیں ہونا چاہیے۔

توکل کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ نفع و نقصان چونکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے' اس لیے کسی ایسے نفع کی خاطر جو دنیا میں ملنے والا ہو' یا کسی ایسے نقصان کی وجہ سے جس کا خدشہ ہو' اللہ کی راہ سے ہٹنا' یہ دونوں باتیں توکل کے منافی ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز طے کر دی ہے' کوئی مصیبت خواہ وہ تمھارے اوپر پڑے یا زمین سے نمودار ہو' وہ ایسی نہیں ہے کہ ہم نے اس کو پہلے سے طے نہ کر دیا ہو:

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ (الحدید ۵۷: ۲۳)

تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمھیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمھیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ۔

یہ اس لیے ہے تاکہ جو کچھ نہ ملے' اس پر تم افسوس نہ کرو' اور اس کے غم میں مبتلا نہ ہو' اور جو چیز ہاتھ آجائے اس پر اتراؤ مت کہ یہ میرے دست و بازو کا کرشمہ ہے۔ ہم نے محنت کی' جدوجہد کی' جان لڑائی تو یہ حاصل ہوا' بلکہ یہ کہو کہ یہ سب اس کی مرضی سے حاصل ہوا۔

توکل کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تو پھر نفع و

نقصان کا معاملہ بھی اسی کے سپرد ہونا چاہیے۔ یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ نفع و نقصان سب اس کے ہاتھ میں ہے۔ جو کچھ بھی ہے' سب اسی کی طرف سے ہے۔ وہ جو نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی ٹال نہیں سکتا' اور جو نفع پہنچانا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ اسی لیے ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ انسان رزق تلاش کرتا ہے اور اس کے لیے حرام راستوں کی طرف جاتا ہے حالانکہ جو رزق اس کو پہنچنے والا ہے وہ تو پہنچ کر ہی رہے گا۔ یہ اس کی بدبختی ہے کہ جلد بازی کرتا ہے' اور حرام راستوں سے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دونوں طرح کی مثالیں ملتی ہیں کہ لوگوں کو حلال ذرائع سے بہت اچھا رزق مل جاتا ہے اور حرام ذرائع اپنانے کے باوجود مفلس کے مفلس ہی رہتے ہیں۔ دنیا میں اس طرح کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ نفع و نقصان اس کے ہاتھ میں ہے' اس لیے دنیا کے نفع اور نقصان سے ڈر کر' یا اس کی طمع اور لالچ میں' اللہ کی نافرمانی کرنا یا اس کے راستے سے ہٹ جانا توکل کے خلاف ہے۔

دعا

توکل کا ایک پہلو وہ ہے جسے حدیث میں رضا بالقضا سے تعبیر کیا گیا ہے' یعنی بندے کی یہ صفت کہ وہ اللہ کی مرضی اور رضا پر پوری طرح راضی رہے۔ یہ بندے کی بہت بڑی صفت ہے۔ اس کی جڑ بھی ان تمام جذبات' کیفیات اور تعلقات کے اندر ہے جو ہمارے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہونے چاہییں۔ شکر کا تقاضا ہے کہ جو منعم ہے' احسان کرنے والا ہے' جس نے یہ سب کچھ عطا کیا ہے' اس کے بارے میں یہ تصور ہو کہ اس کی طرف سے جو کچھ مجھے پہنچے' اس میں میرے لیے بھلائی ہے' اور اس کے اوپر آدمی راضی رہے۔ اسی بات کے پیش نظر نبی کریمؐ اللہ سے یہ دعا کیا کرتے تھے:

اِنِّیْ اَسْئَلُکَ رِضًا بِالْقَضَا

میں تجھ سے تیرے فیصلوں پر رضا کا سوال کرتا ہوں۔

یعنی جو کچھ بھی اللہ کی رضا اور مرضی ہو اس پر آدمی راضی رہے۔

ہم اللہ سے توکل کا جب اظہار کرتے ہیں تو دو الفاظ سے کرتے ہیں: اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ○ (الفاتحہ ۱:۴) یعنی صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد طلب کرتے ہیں۔

درحقیقت بندگی کی اصل روح یہ ہے کہ سارا انحصار اور بھروسا اللہ پر ہو۔ آدمی جو کچھ مانگے صرف اسی سے مانگے' اسی سے طلب کرے اور اس بات کا پورا یقین رکھے کہ صرف اسی سے مل سکتا ہے۔

سورہ فاتحہ میں جو بات آئی ہے اس کی تشریح ایک احادیث میں اس طرح کی گئی ہے۔ الدعا ھو العبادہ ''اصل عبادت تو دعا ہی ہے''۔ ایک دوسری حدیث میں کہا گیا ہے: الدعا مخ العبادہ ''دعا عبادت کا مغز (روح) ہے''۔ گویا اللہ سے مانگنا ہی اصل عبادت ہے۔ یہ ایسا مانگنا ہے جس کی اس نے تاکید کی ہے۔ قرآن مجید میں یعبدون (عبادت کرنے والے) اور یدعون (مانگنے والے) دونوں لفظ ایک دوسرے کی جگہ بدل بدل کر استعمال ہوئے ہیں۔ لہٰذا عبادت اور اللہ سے مانگنا ایک ہی چیز ہے۔ دنیا کی ہر چیز اللہ کی بندگی کر رہی ہے۔ زمین و آسمان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی بندگی نہ کر رہی ہو۔ سورج' چاند' تارے' پتھر اور پہاڑ سب کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ وہ اس کی بندگی کر رہے ہیں' تسبیح و تقدیس اور حمد کر رہے ہیں۔ اسی طرح فرشتوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق پوری کائنات میں چار انگل بھی جگہ خالی نہیں ہے جہاں فرشتے اللہ کی بندگی یا عبادت نہ کر رہے ہوں۔ لیکن یہ کہ وہ بندہ جس کو اس نے اپنا محتاج بنا کر پیدا کیا ہے اور ساتھ ہی اختیار کی آزادی بھی دے دی ہے کہ وہ اپنی آزادی کے نشے میں ڈوب کر اللہ سے بے نیاز ہو کر زندگی نہ گزارے بلکہ اس کا محتاج اور بندہ بن کر رہے' اس کی علامت دعا ہے جس سے مراد مانگنا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ایک مرتبہ ایک بہت

طویل نصیحت کی۔ اس میں تسلیم و رضا اور دعا کا پہلو بھی شامل ہے۔ آپؐ نے فرمایا: **احفظ اللّٰہ تجد معک،** ''اللہ تعالیٰ کو محفوظ رکھو، تم ہمیشہ اس کو اپنے ساتھ پاؤ گے''۔ یہاں اللہ کی حفاظت کرنے سے کیا مراد ہے؟ اس کی مختلف تعبیریں کی جاتی ہیں۔ میرے خیال میں یہاں اللہ کی حفاظت سے مراد اللہ کی یاد کو محفوظ رکھنا ہے۔ آدمی جتنا اللہ کو یاد رکھے گا، اتنا ہی اس کو اپنے ساتھ پائے گا۔

اسی حدیث میں آگے چل کر آپؐ نے فرمایا: **واذا استعینت فاستعین باللّٰہ** ''اور جب بھی کوئی چیز مانگنا ہو تو صرف اللہ تعالیٰ سے مانگو''۔ مزید فرمایا کہ اگر سارے کے سارے انسان جمع ہو جائیں تب بھی وہ اس کے علاوہ کوئی نفع نہ پہنچا ئیں گے جو اللہ نے لکھ دیا ہے، اور اگر کوئی نقصان پہنچانا چاہیں تو اس سے زیادہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے جو اللہ نے لکھ دیا ہے۔ پھر آپؐ نے آخری الفاظ بیان فرمائے جو ایک تشبیہ اور تمثیل ہے جس سے بات قطعی طور پر واضح ہو جاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

ورفعت الاقلام وجفت الصحف

اور قلم اٹھا لیے گئے اور صحیفے خشک کر دیے گئے۔

یعنی احکامات رقم کرنے کے بعد ان کی سیاہی خشک ہو چکی ہے۔ اب اس میں مزید کوئی گنجایش باقی نہیں ہے۔

اس حدیث میں قطعیت پائی جاتی ہے کہ اللہ ہی کے ہاتھ میں سب کچھ ہے، اسی سے مانگنا چاہیے، وہی دینے والا ہے۔

اس بات کا اس حد تک اہتمام تھا کہ حضورؐ نے اپنے بعض اصحاب سے اس بات کی خصوصی بیعت لی تھی کہ وہ کسی بھی معاملے میں کسی بھی انسان سے کوئی سوال نہیں کریں گے۔ چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ ان لوگوں کا یہ حال تھا کہ اگر گھوڑے پر سوار ہوتے اور ان کا کوڑا نیچے گر جاتا تھا تو وہ کسی دوسرے شخص کو یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ کوڑا اٹھا کر مجھے دے دو، بلکہ خود اترتے تھے اور اٹھاتے تھے۔ آپؐ نے انسانوں سے اس حد

تک بے نیازی کی تعلیم دی تھی لیکن یہ معاملہ سب کے ساتھ نہ تھا۔ بعض اصحاب کو آپؐ نے اس حد تک نصیحت کی تھی اور وہ اس کی پابندی کرتے تھے کہ کسی سے کچھ نہیں مانگنا اس لیے کہ کسی سے کچھ ملنے والا نہیں ہے' سب کچھ اللہ سے ملے گا' وہی دینے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں دعا مانگنے کا حکم دیا ہے وہاں اس بات کا وعدہ بھی فرمایا ہے کہ وہ دعا کو قبول بھی کرے گا۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ (المؤمن ۴۰:۶۰)

اور تمھارا رب کہتا ہے ''مجھے پکارو' میں تمھاری دعائیں قبول کروں گا''۔

ایک دوسری جگہ یوں فرمایا:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ○ (البقرہ ۲:۱۸۶)

اور اے نبیؐ، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں' تو انھیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے' میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں شاید کہ وہ راہِ راست پالیں۔

اس طرح یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارے تو اس کا جواب لازماً ملے گا۔

عام طور پر یہاں دو سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک سوال یہ کہ جب ہر چیز طے ہوگئی ہے' لکھی جا چکی ہے تو پھر آخر دعا سے کیا فائدہ؟ اصل بات یہ ہے کہ دعا اس تحریر سے باہر نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے لکھی ہے۔ اگر ہم تقدیر کے مسئلے کی بحث میں نہ پڑیں اور یہ جان لیں کہ چونکہ اللہ کا علم ہر چیز پر حاوی ہے' اس لیے وہ صحیفہ نامکمل نہیں ہے۔ اس صحیفے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہم اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے دعا کریں گے یا نہیں کریں گے۔ اس کی ایک تشریح یہ ہوسکتی ہے۔

دوسری تشریح یہ ہوسکتی ہے' جو میرے خیال میں زیادہ صحیح رویہ ہے اور علما کی

اکثریت نے اسے اپنایا ہے‘ کہ یہ چیزیں متشابہات کے دائرے میں ہیں۔ اس معاملے میں جو چیز جیسی بتائی گئی ہے اسے ویسا ہی سمجھ کر اصل فکر اپنے عمل کی کرنی چاہیے نہ کہ اس بات میں پڑا جائے کہ اس میں اللہ کی کیا غرض‘ حکمت اور مصلحت ہے؟ اسے کیسے اس بات کا علم ہے اور وہ کیسے کرتا ہے؟ کیسے اس نے فیصلہ کیا ہے؟ اور اگر فیصلہ کر چکا ہے تو کیسے اسے بدلے گا؟ یہ اللہ کے مسائل ہیں۔ ہمیں ان میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس سے مانگیں‘ اس نے کہا ہے کہ اگر مجھ سے مانگو گے تو میں دوں گا۔

دعا میں جلد بازی نہیں کرنی چاہیے۔ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ دعا میں جلد بازی نہ کرو۔ ہر دعا کا یہیں‘ اسی وقت‘ اسی طرح پورا ہونا ضروری نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی اپنی مصلحت ہے۔ کارخانۂ قدرت میں ہر چیز ایک مصلحت کے تحت کام کر رہی ہے۔ لہٰذا بعض دعائیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا پورا ہونا مناسب نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز ایک شخص کو بہت سی چیزیں خوان میں رکھ کر پیش کی جائیں گی۔ انھیں دیکھ کر وہ کہے گا: یہ کیا ہے؟ کہا جائے گا: یہ وہ دعائیں ہیں جو دنیا میں قبول نہیں ہوئی تھیں‘ جن کا بدلہ دنیا میں نہیں مل سکا تھا‘ ان سب کو ذخیرہ کر کے تمھاری آخرت کے لیے رکھا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کثرت سے دعا کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس کا ایک پہلو بہرحال یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اور ہر لمحے اللہ تعالیٰ سے رجوع کرے‘ اسی سے نسبت رکھے‘ اسی سے مانگے اور اس کا پورا کا پورا تعلق اللہ کے ساتھ ہو۔

دعا کا ایک اور بہت اہم پہلو ہے۔ وہ یہ کہ دعا ہم کس چیز کی مانگتے ہیں؟ ہم دعا اس چیز کی مانگتے ہیں جس کی ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ اگر ہم بھوکے ہیں تو ہم کھانا مانگتے ہیں۔ اس لیے کہ بھوک ہمیں لگ رہی ہوگی‘ اس کا احساس ہمارے اندر ہوگا۔ اسی طرح اگر ہم کسی مصیبت میں ہیں تو ہم چاہیں گے کہ یہ مصیبت دُور ہو جائے۔ اگر روزگار نہیں مل رہا تو روزگار ملنے کی دعا مانگتے ہیں۔ اگر امتحان میں پاس ہونے کے امکانات کم ہیں تو امتحان میں پاس ہونے کی دعا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب وہ

چیزیں ہیں جن کی ضرورت ہمارا دل محسوس کرتا ہے کہ یہ ہمارے لیے قیمتی ہیں‘ ان کو ہمیں ضرور حاصل کرنا چاہیے۔

دعا کے بارے میں جن امور کی تعلیم دی گئی ہے ان میں ایک یہ ہے کہ صرف اللہ سے مانگو‘ تاکہ اس سے تمھارا تعلق اور نسبت مضبوط ہو۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ مانگنے سے ہی ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ چیزیں ہمارے لیے قیمتی ہیں۔ لہٰذا دعا دراصل تعلیم کا ایک بہترین پیرایہ ہے۔ اگر ہم ایک بہت طویل لیکچر دیں کہ اللہ کی تعریف کرنی چاہیے اور اللہ ہی سے ہدایت مانگنی چاہیے‘ اور اس موضوع پر ایک لمبی چوڑی کتاب بھی لکھی جا سکتی ہے‘ تو دوسری طرف صرف تین الفاظ‘ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ (الفاتحہ ۱:۵)‘ میں یہ پوری بات سکھائی جا سکتی ہے۔ اس میں دعا کے تمام پہلو آ جاتے ہیں۔ جب وہ مانگ رہا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اسے اس کی ضرورت ہے۔ اس کی قدر قیمت کو وہ محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے وہ اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ پھیلا کر ہدایت مانگتا ہے۔ اب کسی تقریر‘ فلسفے اور کتاب کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ ہدایت کی ضرورت اس کے دل کی پکار اور صدا بن گئی ہے اور زبان پر آ گئی ہے۔

قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر عظیم چیزوں کی تعلیم دعا کے پیرائے میں دی گئی ہے‘ مثلاً سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران کا آخری حصہ۔ اس پر غور کیا جائے‘ سوچا جائے‘ تدبر کیا جائے‘ تشریح اور تفسیر کی جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر دعا کے ہر لفظ میں کسی نہ کسی اہم بات کی تعلیم ہے۔ صرف مانگنا ہی نہیں سکھایا ہے بلکہ یہ تعلیم بھی دی ہے کہ یہ تمھاری ضرورت ہونی چاہیے۔ تمھارے اندر اس کے لیے پیاس‘ تڑپ اور اُمنگ ہونی چاہیے۔ اس کے لیے تمھیں کام کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے اگر ہم جنت طلب کرتے ہیں تو جنت کی پیاس‘ تڑپ‘ طلب اور اُمنگ بھی دل کے اندر ہونی چاہیے۔ اس سے اگر ہم جزا اور توکّل مانگتے ہیں‘ اس کی محبت اور رضا طلب کرتے ہیں تو اسی طرح یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ ان چیزوں کی تڑپ‘ طلب‘ پیاس اور اُمنگ بھی تمھارے دل کے

اندر ہونی چاہیے' اور ان کو حاصل کرنے کے لیے تمھیں کوشش کرنا چاہیے۔

اس طرح دعا رجوع الی اللہ' اللہ کی طرف انابت اور نسبت کا ذریعہ بھی ہے' اور تعلیم کے ساتھ ساتھ ان اقدار' کیفیات اور تعلیمات کو اخذ کرنے کا ذریعہ بھی ہے جس سے یہ چیزیں زندگی کے اندر داخل ہوتی ہیں۔

اطاعت اور فرماں برداری

دعا کے بعد اللہ کی اطاعت اور فرماں برداری ہے۔ اسے میں نے سب سے آخر میں رکھا ہے' یہ ایک لحاظ سے سب سے پہلے بھی آ سکتی ہے۔

یہ بات ہم سب بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ ہم اس کی اطاعت اور بندگی کریں۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب کچھ نہ بن پڑے' انسان کسی بھی مقام پر نہ پہنچ سکے' تو کم سے کم چیز جس سے رابطہ کبھی نہیں ٹوٹنا چاہیے وہ اس کی اطاعت اور فرماں برداری ہے۔ اس کی اللہ نے تاکید بھی کی ہے اور تعلیم بھی دی ہے۔ اللہ کی اطاعت دراصل اس کے رسولؐ کی اطاعت ہے۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (النساء ۴: ۸۰)

جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔

قرآن کا ماننا بھی رسولؐ کو ہی ماننا ہے' اس لیے کہ ہم قرآن کو بھی رسولؐ کے واسطے سے ہی مانتے ہیں۔

''اطاعت'' میں جن پہلوؤں کی طرف توجہ ضروری ہے ان میں پہلی چیز یہ ہے کہ اطاعت میں عمل کی ظاہری صورت کے ساتھ اس کے مقصد اور اندرونی کیفیت کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے جہاں بھی احکام کی تعلیم دی ہے وہاں خاص طور پر اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ عمل تو ہونا چاہیے لیکن جو چیز اس عمل کو اللہ کی نظروں میں مقبول بنائے گی وہ اس کے پیچھے کارفرما دل کی کیفیت ہے۔ اگر نماز میں

خشوع و خضوع ہوگا' اللہ کا ذکر ہوگا تو وہ نماز قبول ہوگی اور اس سے وہ ثمرات بھی حاصل ہوں گے جو زندگی میں حاصل ہونے چاہییں۔ آدمی قربانی کرتا ہے تو اللہ کو اس کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا:

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ط

(الحج ۲۲:۳۷)

نہ ان کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون' مگر اسے تمھارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

حج کے بارے میں بے شمار احکامات ہیں۔ مگر ہر جگہ یہ کہا گیا ہے کہ اس میں کچھ کوتاہی ہوجائے' تھوڑی بہت کمی بیشی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں' اگر دل میں تقویٰ موجود ہے' (لمن التقٰی – البقرہ ۲:۲۰۳)' بشرطیکہ یہ دن اس نے تقویٰ کے ساتھ بسر کیے ہوں۔ اس لیے جہاں بھی جو بھی حکم دیا گیا ہے اس میں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا ہے کہ آدمی صرف ظاہری مراسم کے چکر میں اس طرح نہ پھنسے کہ اس کی روح اور مقصد سے غافل ہو جائے۔

مختلف اُمتوں پر جب زوال آتا ہے تو جزئیات' فروعیات اور ظاہری چیزوں کا اہتمام اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ بس ظاہر ہی ظاہر رہ جاتا ہے' اور باطن غائب ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر جہاں تنقید کی ہے وہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ بنی اسرائیل میں جتنے بھی پیغمبر آئے' انھوں نے اپنی قوم کو جب بھی پکارا' اس بات کی طرف وضاحت کے ساتھ اشارہ کیا۔ بعض انبیا کی جو تقاریر بائیبل میں نقل کی گئی ہیں ان میں انھوں نے یہ تک کہا کہ اللہ تعالیٰ کو تمھاری قربانیوں کی ضرورت نہیں ہے' تمھاری نمازوں کی ضرورت نہیں ہے' تمھارے سجدوں کی ضرورت نہیں ہے' تم اپنی مسجدوں میں جو لوبان جلاتے ہو' اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو ضرورت اس بات کی ہے کہ تم مظلوموں کے ساتھ انصاف کرو' غریبوں کے کام آؤ' بیواؤں کی خدمت کرو۔

یہ تمام تقاریر جو بائیبل میں نقل کی گئی ہیں اور قرآن نے بھی مختلف مقامات پر جس کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہی بات ظاہر کرتی ہیں کہ اگرچہ ہر معاملے میں اللہ کی اطاعت کو مقدم ہونا چاہیے اور اس کی اطاعت کرنی چاہیے' لیکن اس چیز سے غافل نہیں ہونا چاہیے کہ اطاعت کے پیچھے اصل چیز اس کی روح اور مقصد ہے جو حاصل ہونا چاہیے۔

اطاعت میں دوسری بڑی خرابی یہ ہے کہ آدمی بعض چھوٹے اور غیر اہم احکام کی پروا نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات میں تقدیم اور تاخیر ہے اور ترجیحات کی ایک میزان ہے جس میں کچھ چیزیں اہم اور کچھ کم اہم ہیں۔ کوئی چیز غیر اہم ہو سکتی ہے لیکن اس کو اس لیے ٹال دینا کہ اس کے کرنے نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے' دراصل یہ ذہنیت ہے کہ آدمی اللہ کے حکم کو لاپروائی سے ٹال رہا ہے۔ یہ ایک بڑا گناہ بن جاتا ہے۔ اس طرح چھوٹے گناہ بعض دفعہ بڑے گناہ بن جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ جو بڑی نیکیاں ہیں ان کا حق مقدم ہے' جو ان سے کم درجے کی نیکیاں ہیں' ان کا مقام ان سے کم ہے۔

قرآن مجید نے جگہ جگہ اس بات کو مختلف انداز سے واضح کیا ہے۔ سب سے بڑی اور واضح آیت سورہ توبہ کی ہے جس میں فرمایا گیا:

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ (التوبہ ۹: ۱۹-۲۰)

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر ٹھیرا لیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روز آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں؟ اللہ کے نزدیک تو یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔

اللہ کے ہاں تو انھی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنھوں نے اس کی راہ میں گھربار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا۔

اسی طرح جہاں انفاق کی تعلیم دی گئی ہے وہاں فرمایا گیا کہ بعض لوگ اسلام کے غلبے کے آثار سے پہلے ہی اپنا مال اور جان اس راہ میں لگاتے ہیں اور بعض آثار دیکھنے کے بعد لگاتے ہیں' تو جو لوگ پہلے لگاتے ہیں' ان کا درجہ بہت اونچا ہے' حالانکہ اجر دونوں کو ملے گا۔ اس لیے نیکی کے درجات اور ترجیحات میں اُلٹ پلٹ ہونا بھی' اللہ کی اطاعت کے اندر فساد کا سبب بنتا ہے۔

تبلیغی جماعت کے بانی مولانا الیاسؒ کا ایک نہایت قیمتی جملہ ہے کہ جب شیطان انسان سے مایوس ہو جاتا ہے کہ وہ اسے کسی غلط راہ پر لے جائے' تو پھر وہ اسے بڑے کاموں سے غافل کر کے چھوٹے کاموں میں مشغول کر دیتا ہے۔ بڑا کام تو دعوت و تبلیغ اور جہاد کا ہے اور چھوٹے کام اس کے علاوہ اور بہت سے ہیں۔ وہ اس کا سارا وقت اور توجہ چھوٹے کاموں میں لگا دیتا ہے۔

لہٰذا اطاعت کے اندر اس بات کا لحاظ بہت ضروری ہے کہ نیکیوں کے مختلف درجات اور ترجیحات (priorities) ہیں۔ بعض نیکیاں بڑی اور بعض چھوٹی ہوتی ہیں۔ بعض جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں' بعض شاخوں کی اور بعض اس سے بھی کم درجے کی ہوتی ہیں۔ اس کے لحاظ سے ہی ان کا مقام ہونا چاہیے۔

ترجیحات میں ایک اور پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے ورنہ فساد کا اندیشہ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ آدمی چھوٹی نیکیوں سے بالکل ہی غافل ہو جائے۔ مومن کی اصل صفت یہ ہے کہ جہاں بھی اس کو کوئی ایسی چیز نظر آجائے جس کے بارے میں اسے یہ معلوم ہو کہ یہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا حکم ہے' وہ اس کو کرنے کی کوشش کرے' خواہ وہ کسی بھی دائرے سے تعلق رکھتی ہو۔ لیکن اس میں دو چیزوں کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ چھوٹی چیز بڑی چیز کو قربان کر کے نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ جو بھی کام کرے اس میں

اس کی اصل روح اور مقصد کو پیش نظر رکھے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق اور ان تمام کیفیات اور خصوصیات کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ ہمیں کیسے حاصل ہوسکتی ہیں؟

اس کا سب سے بڑا ذریعہ ذکر یعنی اللہ کی یاد ہے۔ ذکر ایسی چیز ہے جس کی قرآن مجید میں بہت کثرت کے ساتھ تاکید کی گئی ہے' اور یہ کہا گیا ہے کہ لوگ اٹھتے بیٹھتے' لیٹتے' ہر وقت اللہ کو یاد رکھیں۔

نماز پڑھنا اللہ کا ذکر ہے' نماز کو ٹھیک طرح پڑھنا اور اس سے پوری طرح فائدہ اٹھانا بھی تعلق باللہ کا ذریعہ ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ نماز پڑھ کر اگر کوئی کام کرو تو اللہ کا ذکر کرو اور جہاں بھی ہو' اللہ کا ذکر کرو۔ غرض ہر جگہ ذکر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

ذکر میں قرآن مجید کی تلاوت کرنا بھی شامل ہے اور اللہ سے ملاقات کرنے کو یاد رکھنا بھی شامل ہے۔ اسی طرح جو مختلف دعائیں سکھائی گئی ہیں' جن کی تعلیم دی گئی ہے وہ بھی ذکر کا حصہ ہیں۔ انھیں صحیح طریقے سے کرنا بھی ذکر ہے۔

یہ سب ذکر کے ذرائع ہیں جو ہمیں حاصل ہیں لیکن ہم ان سے صحیح طرح فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق کمزور رہتا ہے۔ چونکہ ان ذرائع کا مفصل تذکرہ گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے لہٰذا یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔

دنیا اور آخرت

اس دنیا میں ہماری یہ زندگی ایک حقیقت ہے اور جتنی بڑی حقیقت دنیا کی یہ زندگی ہے' اتنی ہی بڑی حقیقت یہ ہے کہ اس زندگی کو لازماً ختم ہونا ہے۔ کسی بھی بات کے بارے میں بحث' گفتگو' اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس بات پر کوئی گفتگو' کوئی اختلاف اور کسی بحث کی گنجائش نہیں ہے کہ زندگی کو بہر حال ایک روز ختم ہونا ہے۔ یہ ایک واضح اور اٹل حقیقت ہے۔

جتنی بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ زندگی اللہ کی بخشی ہوئی ہے' اُس کا انعام ہے' اُس نے انسان کو پیدا کیا ہے' اُتنی ہی بڑی حقیقت یہ بھی ہے کہ ایک روز اس زندگی کو لازماً ختم ہونا ہے اور اُس سے ملاقات ہوگی۔ رب سے ملاقات نہ ہوتو یہ سارا ایمان ایک واہمہ' ایک تخیل بن کر رہ سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم نے خود ہی سوچ لیا ہو کہ اللہ موجود ہے اور سب کچھ دے رہا ہے لیکن یہ کہ واقعی وہ ہے اِس کی تصدیق اُسی وقت ہوسکتی ہے جب اُس سے ملاقات ہو۔ ساری زندگی اللہ کی بندگی اور اُس کی غلامی میں گزارنے کے لازمی معنی ہی یہ ہیں کہ موت کے بعد آنے والی زندگی میں اُس سے ملاقات ہو' اور اُس کی بندگی اور غلامی کی راہ میں ہماری جو کوششیں ہیں اُن کو وہ قبول فرمائے اور وہ اُس کی خوشنودی اور رضامندی کی مستحق ٹھیریں۔

جو آدمی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان کا دعویٰ کرے' تو اُس کو ان دونوں حقیقتوں

کو پیش نظر رکھ کر ہی چلنا ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ پر ایمان کا دعویٰ' آخرت کے اوپر یقین اور ایمان کے دعویٰ کے بغیر فی الواقع کوئی عملی حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم نے جس ہستی کو ہر جگہ محسوس کیا ہو' ہر جگہ پایا ہو' جس پر یقین رکھا ہو' ہر کام اُس کے لیے کیا ہو' موت کے ساتھ ہی اچانک یہ ساری چیز ختم ہو جائے۔ اگر اللہ سے ملاقات اور آنے والی زندگی اور اُس کی رضا اور اُس کا انعام اور یہ ساری چیزیں حقیقت نہ ہوں تو پھر جہاد اور راہِ حق کو اختیار کرنا' اُس کی بندگی کرنا' اُس کی اطاعت کرنا' بالکل عبث اور بیکار کام ہیں' بلکہ وہ آدمی انتہائی احمق ہوگا کہ جو نیکی کرے اور اس بات پر یقین نہ رکھتا ہو کہ آخرت میں اللہ سے ملاقات ہوتی ہے۔

آخرت پر ایمان: بنیادی تقاضے

اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ آخرت پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کی ساری زندگی اور تگ و دو اور یہاں کی ہر چیز ہم آخرت کی نذر کر دیں۔ ہماری ہر سرگرمی اس کے گرد ہو' اور اُسی کی خاطر ہم زندگی نچھاور کر دیں۔ یہ ایمان بالآخرت ہے۔ جتنا یہ ایمان مضبوط ہوگا' اتنا ہی اللہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوگا۔ اللہ نے بار بار دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عبادت' غلامی اور بندگی کی دعوت جہاں بھی آئی ہے' اُس میں آخرت کو مطلوب و مقصود اور اُس کی کامیابی کو اصل کامیابی سمجھ کر جینے کی دعوت بھی شامل ہے۔ انبیا کی ساری دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی اگر غلامی میں بسر کرنا ہے تو یہ سمجھ کر بسر کرنا ہے کہ جب اُس سے ملاقات ہوگی تو اُس وقت وہ اس بات کا فیصلہ کرے گا کہ ہم نے اپنی زندگی غلامی میں فی الواقع بسر کی یا نہیں کی۔

تیسری بات یہ ہے کہ مشکل یہ ہے کہ دنیا ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ اُس کو ہم دیکھتے ہیں' محسوس کرتے ہیں۔ اُس کی لذت فوراً ذائقہ دیتی ہے اور اُس کی تکلیف

سے ہم فوراً درد والم محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ آخرت ایک وعدہ ہے' نگاہوں سے اوجھل ہے اور اُس کی لذتیں ہم دیکھتے نہیں' محسوس نہیں کرتے' صرف سنتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ وہ ہوں گی۔ وہاں جسمانی طور پر دی جانے والی تکلیف' اذیت اور عذاب سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ وہ بھی محض ایک خیال اور وعدے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم کل کے اُوپر آج کو' دُور کے اوپر قریب کو' غیر محسوس چیز کے اوپر محسوس چیز کو ترجیح دیتے ہیں' اُس کو یاد رکھتے ہیں اور اُسی کو اختیار کرتے ہیں۔ یہ آخرت ہی کا معاملہ نہیں ہے بلکہ دنیا کے اندر بھی کل آنے والی چیز کو' یا ایک برس بعد آنے والی چیز کو ہم ٹال دیتے ہیں اور جو چیز فوری حاصل ہو رہی ہو' اس کی طرف لپکتے ہیں۔ یہ ہماری فطرت کا ایک حصہ ہے۔ فطرت کی یہ ساری چیزیں دراصل امتحان کا ایک حصہ ہیں۔ اسی کو قرآن نے بہت صاف الفاظ میں کہا ہے: كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ o وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ o (القیامہ ۷۵:۲۰-۲۱) ''ہرگز نہیں' اصل بات یہ ہے کہ تم لوگ جلدی حاصل ہونے والی چیز (یعنی دنیا) سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ دیتے ہو''، یعنی تم عجلت میں جلدی اور نقد ملنے والی چیز کو پسند کرتے ہو' اُس کو اختیار کرتے ہو' اور جو اُدھار ہے' جس کا وعدہ ہے' جو ایک خیال ہے' جس کی لذت و تکلیف کو تم محسوس نہیں کر سکتے' اُس کو تم ٹال دیتے ہو۔ تمھارا حال تو یہ ہے کہ: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا o (الاعلٰی ۸۷:۱۶) ''تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو''۔

دنیا کی محبت اور اُس پر راضی ہو جانا اور اُسی کو مقصود بنانا' یہ ایک ایسی بیماری ہے جو اللہ کی خاطر حق کی راہ میں چلنے کے ہر ارادے اور کوشش کو گھن کی طرح کھا جاتی ہے۔ دوسری طرف اللہ سے ملاقات کا یقین ہونا اور اُس کو مقصود و مطلوب بنانا' یہ وہ چیز ہے جس سے وہ سارے مراحل طے کرنے کے لیے جو راہِ حق کے اندر پیش آتے ہیں صحیح طاقت وقوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ بیماری کہ آدمی دنیا کو ترجیح دے' دنیا سے محبت کرے'

نقد کو حاصل کرے، اُدھار کو ٹال دے، آج کو قیمتی جانے، کل کی فکر نہ کرے، یہ جس طرح کافروں کو لگی ہوئی ہے اُسی طرح اُن کے ساتھ بھی لگی رہتی ہے جو ایمان لائے ہیں۔اس لیے کہ وہ بھی اُسی دنیا میں رہتے ہیں جس میں کافر رہتے ہیں۔ دونوں کی فطرت ایک ہے اور دونوں کو ایک ہی طرح کے حالات سے سابقہ پیش آتا ہے۔ چنانچہ جہاں بھی مسلمانوں نے ایمان کے دعویٰ میں اور اس کے تقاضے پورے کرنے میں کمزوری دکھائی، اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ اسی بیماری کے اوپر انگلی رکھی کہ یہ اصل دکھتی رگ ہے۔ یہ ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔غزوۂ بدر ہوا تو فرمایا: **تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ** (الانفال ۸: ۶۷) ''تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو''۔ جو بھی کمزوری صادر ہوئی اس کی وجہ دنیا کے اسباب کی خواہش تھی۔ غزوۂ اُحد میں ڈسپلن کی کمزوری ظاہر ہوئی تو فرمایا: **مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ** (ال عمران ۳:۱۵۲) ''تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے''۔غزوۂ تبوک میں لوگوں نے کمزوری دکھائی تو قرآن نے کہا: **اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ○** (التوبة ۹:۳۸) ''کیا تم نے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو پسند کر لیا؟ ایسا ہے تو تمھیں معلوم ہو کہ دنیوی زندگی کا یہ سب سروسامان آخرت میں بہت تھوڑا نکلے گا''۔

ہر جگہ جو بات کہی گئی وہ یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے مظاہر کے پیچھے اصل جڑ دنیا کی محبت ہے۔اسی لیے اللہ نے جب بگڑی ہوئی مسلمان اُمتوں کو اپنی طرف بلایا تو اس میں اس بات کو بنیادی اہمیت دی کہ ہر وہ چیز جس سے آخرت میں اپنے اعمال کی جواب دہی کا احساس کمزور ہوتا ہو، یا جس سے دنیا کی محبت ظاہر ہوتی ہو، اُس کو ختم کیا جائے اور اُس کا استیصال کیا جائے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی ہر دعوت میں یہ بات موجود ہے:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ○ (البقرہ ۲:۴۸)

اور ڈرو اس دن سے جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا' نہ کسی کی طرف سے سفارش قبول ہوگی' نہ کسی کو فدیہ لے کر چھوڑا جائے گا' اور نہ مجرموں کو کہیں سے مدد مل سکے گی۔

اور یہ بھی کہا گیا کہ اگر تم واقعی اللہ کے پیارے ہو تو آخرت کی خواہش کرو' لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ دنیا کی حرص و لالچ غالب آ جاتی ہے اور ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں۔ آخرت جو بعد میں آنے والی ہے' اُس کے لیے سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ غلطی کر رہے ہیں' اللہ بس معاف کر دے گا۔

ان سب پہلوؤں کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ حق کی راہ پر چلنے کے لیے' اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی' جن کو ہم اس طرف بلائیں فکرِ آخرت مرکزی حیثیت رکھتی ہے اور اِسی سے ہمارے اندر قوت و استعداد پیدا ہوگی۔ جن لوگوں کو' عوام کو' جس گروہ اور جس قوم کو ہم بالآخر منظم کرنا چاہتے ہیں اُن کے اندر بھی قوت' اُسی وقت پیدا ہوگی جب دنیا کی محبت کم ہو' موت سے بے خوفی پیدا ہو' اور آخرت کی محبت اُن کے دلوں کے اندر راسخ ہو جائے۔ لہٰذا دعوت کے اندر اِس کو ایک مرکزی نکتے کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔

جب دنیا کی محبت دل سے نکل جائے گی اور آخرت کی طلب دل کے اندر ڈیرہ ڈال لے گی' وہاں کی کامیابی ہی اصل کامیابی ٹھیرے گی تو ہمارا عمل بھی صحیح راہ پر لگے گا اور ہمیں عمل کرنے کے لیے قوت بھی حاصل ہوگی۔ عوام جن کو ہم پکارتے ہیں اور جن کی ہم شکایت بھی کرتے ہیں' اُن کے سارے امراض کا علاج بھی دراصل اِسی میں ہے۔ اللہ نے جب بھی لوگوں کو پکارا تو یہی کہا کہ اِن دھوکوں سے نکل آؤ جو عمل سے غافل کرتے ہیں' اور تم میں سے ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے!

معروف حدیث ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ دنیا کی قومیں اس اُمت پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ صحابہؓ نے پوچھا:

کیا ہماری تعداد بہت کم ہو جائے گی؟ آپؐ نے فرمایا: نہیں‘ تمھاری تعداد تو ریگستان کے ذرّوں اور درخت کے پتوں کی طرح ہوگی۔ انھوں نے کہا: پھر کیا وجہ ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا: دنیا کی محبت اور موت سے نفرت! بلاشبہ یہ حقیقت ہے کہ جس قوم میں یہ مرض پیدا ہو جائے اس کی استعداد اور قوت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ چیز اگر دُور ہو جائے تو پھر قوم اس بات کے لیے تیار ہو سکتی ہے کہ وہ کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر جیے اور مرے اور اپنے اس طرزِعمل اور جدوجہد سے خدا کے ہاں اپنے آپ کو اس بات کی مستحق ٹھیرائے کہ وہ اسے عظمت اور سربلندی کی زندگی بخشے--- اس نکتے سے غافل ہو کر دعوت کی کوششیں کی جائیں تو ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ پوری طرح بارآور نہ ہوں۔

آخرت کو مقصود بنایئے

آخرت کی اس اہمیت کو سمجھ لینے کے بعد‘ دوسری بات جس کا مطالبہ ہے وہ یہ ہے کہ ہم آخرت کو یکسوئی کے ساتھ منتخب کریں اور یکسوئی کے ساتھ اُس کے حصول کا ارادہ کریں۔ دنیا اور آخرت دونوں میں سے کسی ایک کو آدمی منزل بنا سکتا ہے‘ دونوں کو منزل نہیں بنا سکتا۔ آدمی اپنے دل کے ٹکڑے نہیں کر سکتا۔ قرآن نے اس بات کو بہت واضح اور صاف انداز میں کہا ہے کہ آدمی اپنے ارادے کو دو حصوں میں نہیں بانٹ سکتا۔ وہ یہ نہیں کر سکتا کہ دونوں کو مقصود بنائے اور دونوں کو مقصود بنا کر چلے۔ قرآن نے کہا ہے کہ جو دنیا اور آخرت کو طلب کرے گا اُس کو آخرت ملے گی اور اس سے زیادہ ملے گی جتنا کہ وہ تصور کر سکتا ہے‘ اور جو شخص دنیا کو مقصود بنائے گا اُسے صرف دنیا ملے گی لیکن آخرت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا دنیا اور آخرت کو بیک وقت مقصود بنا کر آدمی نہیں چل سکتا۔ دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر وہ زندگی کے سمندر میں تیر کر آخرت تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو شخص آخرت کو مقصود بنائے وہ دنیا سے دست بردار

ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اُس کے لیے مقصود و مطلوب اور محبوب کی حیثیت نہیں رکھے گی بلکہ دنیا اس کے لیے آخرت کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہوگی۔ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کمانا' رشتے داریاں اور دوستیاں نبھانا' دنیا کی نعمتوں سے مستفید ہونا اور ان کے حصول کے لیے جدوجہد کرنا' یہ سب ضرور ہوگا لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی مطلوب و مقصود کا درجہ نہیں رکھے گی۔ ہمیں انتخاب کر کے ارادہ کرنا ہے کہ ہم کو صرف آخرت کو مقصود بنانا ہے۔ قرآن مجید میں من یرید الآخرۃ اور من ارادۃ الآخرۃ کئی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ ہمارے لیے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان دونوں کی حقیقت کیا ہے اور ہر سودے کا نفع و نقصان کیا ہے؟

اسی لیے اللہ نے اپنی کتاب میں اس بات کو بار بار مختلف مثالوں سے واضح کیا ہے۔ یہ جاننے کے باوجود کہ آخرت مطلوب ہونا چاہیے' بار بار بتایا گیا ہے کہ دنیا کی حقیقت کیا ہے اور آخرت کی حقیقت کیا ہے' آخرت سے کیا ملتا ہے اور دنیا کیا دیتی ہے' اس لیے دونوں میں سے کس چیز کو تمھیں اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا کا نفع مال ہوسکتا ہے' اولاد ہوسکتی ہے' اسٹیٹس اور جاہ و حشمت ہوسکتا ہے' یا اُن کا نقصان ہوسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں آخرت کا فائدہ' اللہ کی مغفرت اور اُس کی رضا ہے اور وہاں کا نقصان اُس کی طرف سے دیا ہوا نقصان ہے۔

وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ ؕ (الحدید ۵۷:۲۰)

آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہے۔

آخرت میں یہ دو چیزیں ہیں۔ دنیا کے اندر بھی دونوں چیزیں ہیں' کچھ نفع حاصل ہو جائے یا نقصان ہو جائے' اور آخرت میں یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک چیز حاصل ہو جائے' عذاب حاصل ہو جائے یا عذاب کے بجائے مغفرت اور رضا حاصل

ہو جائے۔

آخرت باقی رہنے والی ہے

دنیا اور آخرت کی حقیقت کو اللہ نے مختلف طریقوں سے واضح کیا ہے۔ اس میں پہلی چیز یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز' نعمت یا تکلیف گزر جانے والی ہے۔ اس کی سب سے صحیح مثال یہ ہے کہ وقت ٹھیر نہیں سکتا۔ اس لیے تکلیف اور آرام بھی ٹھیر نہیں سکتے۔ اگر وقت ٹھیر سکتا تو ہم وقت کو پکڑ کر باندھ لیتے کہ اب ہمیں یہ لذت حاصل ہوئی ہے تا کہ وقت کے ساتھ لذت بھی ٹھیر جاتی لیکن یہ ہمارے بس میں نہیں ہے۔ چونکہ وقت کا گزرنا ہمارے بس میں نہیں ہے اور اس کو ہم روک یا تھام کر نہیں بیٹھ سکتے' اس لیے یہاں کی لذت' خوشی اور آرام اور یہاں کا دکھ درد اور تکلیف و الم' یہ سب چیزیں گزر جانے والی ہیں۔ ہمارا یہ روز کا تجربہ ہے کہ خوشی کا ہمیں بڑا انتظار رہتا ہے۔ اُس کے خواب دیکھتے ہیں' اُس کی تمنائیں کرتے ہیں' لیکن خوشی آتی ہے' چند لمحے میں گزر جاتی ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے ایک خوش گوار یاد رہ جاتی ہے۔ اُس کی ساری لذت رخصت ہو جاتی ہے۔ تکلیف اور پریشانی سے ہم ڈرتے رہتے ہیں۔ جب مصیبت پڑتی ہے تو یہی خیال آتا ہے کہ یہ بھی گزر ہی جائے گی۔ دنیا کے ساتھ یہ عجیب معاملہ ہے کہ یہاں کوئی بھی چیز ٹھیرنے والی نہیں ہے۔ موت کے ساتھ یہ سب چیزیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گی۔ اس خاتمے کو کبھی ٹالا نہیں جا سکتا۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط (اٰل عمرٰن ۳:۱۸۵) ''آخرکار ہر شخص کو مرنا ہے''، یہ بات اٹل حقیقت ہے۔ کوئی کافر' فلسفی' مشرک کسی بھی چیز سے انکار کر سکتا ہے' بحث کر سکتا ہے' لیکن موت سے انکار نہیں کر سکتا۔

دنیا فنا ہو جانے والی ہے۔ یہاں انسان جو کچھ حاصل کرے گا' جو کچھ بھی بنائے گا' ختم ہو جائے گا۔ اس کے مقابلے میں آخرت کی ہر چیز باقی رہنے والی ہے اور کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے' الا یہ کہ اللہ کچھ اور چاہے۔ اس نے ہر جگہ عذاب اور اجر کو مشروط کیا

ہے۔ اگر اللہ چاہے گا تو عذاب ہمیشہ رہے گا۔ ایسا ہی معاملہ اس کی بخشش کا ہے' یعنی الاما یشاء اللّٰہ لیکن ساتھ ہی پھر یہ بھی کہا ہے کہ کوئی انقطاع کا سوال نہیں ہے۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ (النحل ۱۶: ۹۶)

جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔

قرآن مجید میں دنیا کی مثال تفصیل کے ساتھ دو تین جگہ دی گئی ہے۔ فرمایا کہ دنیا کی مثال بارش کی سی ہے۔ بارش ہوتی ہے' فصل اُگتی ہے' بہار آتی ہے' اس کے بعد وہ زرد پڑ جاتی ہے' اور بالآخر زمین کے اندر رل مل جاتی ہے۔ سورۃ الکہف میں' سورۃ الحدید میں اور سورہ یونس میں تین جگہ اس مثال کے مختلف پہلو مختلف انداز میں واضح کیے گئے ہیں۔ ان سب میں یہی بتایا گیا ہے کہ جس طرح کھیتی باڑی ہوتی ہے' لہلہاتی فصل کو دیکھ کر انسان خوش ہوتا ہے لیکن بالآخر وہ زرد پڑ جاتی ہے اور چورا چورا ہو کر مٹی میں مل جاتی ہے' دنیا کی ساری کمائی اور ساری کوششوں کا حاصل بھی اسی طرح ختم ہو جانا والا ہے۔ آخرت کے بارے میں یہ بات بالکل صاف کہی گئی ہے کہ عذاب ہوگا تو ایسا کہ جیسے ہر طرف سے موت آ رہی ہو لیکن وہاں موت کو نہیں آنا۔

يَّتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ؕ وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ○ (ابراھیم ۱۴: ۱۷)

موت ہر طرف سے اس پر چھائی رہے گی مگر وہ مرنے نہ پائے گا اور آگے ایک سخت عذاب اس کی جان کو لاگو رہے گا۔

یہاں جب درد و الم بہت بڑھتا ہے تو آدمی یہ آرزو کرتا ہے کہ بس اب موت ہی آ جائے تا کہ یہ درد و الم ختم ہوں۔ موت آ بھی جاتی ہے اور درد و الم ختم بھی ہو جاتے ہیں لیکن آخرت کا درد والم ایسا ہوگا کہ جیسے موت آ رہی ہو لیکن آدمی مرے گا نہیں۔ ایسا ہی معاملہ انعام پانے والوں کا بھی ہوگا۔ اسی لیے جو انعام پانے والے ہیں اُن کے لیے

کہا گیا ہے:

لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی ۚ (الدخان ۴۴:۵۶)

وہاں موت کا مزہ وہ کبھی نہ چکھیں گے۔ بس دنیا میں جو موت آچکی سو آچکی۔

گویا آخرت کی زندگی ایک دائمی اور ہمیشہ کی زندگی ہے۔

آخرت میں اجر یقینی ہے!

دوسری بات جو اللہ نے آخرت اور دنیا کے موازنے میں واضح اور صاف بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ آخرت کے لیے کوشش کے نتائج یقینی ہیں۔ آخرت کے لیے کوشش رائیگاں نہیں جا سکتی۔ اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ آدمی خلوص کے ساتھ آخرت کے لیے کوشش کرے اور وہ کوشش ضائع ہو جائے اور اُس کا اجر نہ ملے۔ لیکن دنیا کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی کوشش کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ آدمی بہت محنت کرے ممکن ہے کہ کچھ حاصل نہ ہو' تھوڑی محنت کرے ممکن ہے کہ بہت کچھ مل جائے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر آدمی جو بھی کوشش کرے گا' لازماً اُس کو ملے گا بلکہ کسی کو ملے گا کسی کو نہیں ملے گا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ جو مقصود بنا کر آدمی کوشش کرے گا وہ لازماً حاصل ہوگا۔ کچھ حاصل ہوگا کچھ نہیں بھی حاصل ہوگا۔ لہٰذا دنیا کے نتائج غیر یقینی بھی ہیں' کم اور زیادہ بھی ہو سکتے ہیں' اور ہر شخص کو ملنا ضروری بھی نہیں ہے۔ لیکن آخرت کے بارے میں یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ ہر شخص کا کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے کہ جو ضائع جائے گا' بلکہ جو کچھ اجر ہوگا اُس سے زیادہ کا وعدہ ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ۝ (الشوریٰ ۴۲:۲۰)

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں' اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی

حصہ نہیں ہے۔

وہ کس طرح سے دیتے ہیں' اُس کی بھی تفصیل ایک اور جگہ بیان فرما دی گئی:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ (بنی اسرائیل ۱۷ : ۱۸)

جو کوئی (اس دنیا میں) جلدی حاصل ہونے والے فائدوں کا خواہش مند ہو' اسے یہیں ہم دے دیتے ہیں جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں۔

دنیا کی محنت سے اس کا کوئی تناسب نہیں ہے کہ بعض لوگ صبح سے شام تک پاپڑ بیلتے ہیں اور چند پیسے کما پاتے ہیں اور بعض اُسی کے اندر بہت کچھ کما لیتے ہیں۔ لِمَنْ نُّرِيْدُ سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں جس کو چاہتے ہیں اُس کو دیتے ہیں' یہ نہیں کہ ہر ایک کو ملتا ہے لیکن آخرت کے وعدے بالکل صحیح ہیں۔ وہاں ہر عمل کا اجر یقینی ہے!

دنیا کی حیثیت

دنیا کی زندگی ختم ہونے والی اور چند روزہ ہے اور یہیں تک فائدہ اٹھانے کے لیے محدود ہے۔ قرآن نے اس کے لیے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں' مثلاً لہو ولعب۔ اس کے معنی ہیں بے معنی کھیل تماشے۔ اس کا ترجمہ عام طور سے کچھ اس طرح ہوتا ہے جیسے کوئی ایسی بے فائدہ چیز ہے' بے قدر چیز ہے جس میں آدمی کو مشغول ہی نہیں ہونا چاہیے۔ حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا چند لمحوں کی تفریح ہے' چند لمحے اس سے فائدہ اٹھانا ہے اور چند لمحات کے بعد یہ پورا کھیل تماشا ختم ہونے والا ہے۔ اس کی کوئی تفریح اور کوئی خوشی دائمی نہیں ہے۔ اسی طرح دنیا کے لیے زینت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اسے تفاخر بھی کہا گیا ہے اور تکاثر بھی۔ ہر لفظ کے اندر دنیا کے نتائج کی قدر و قیمت کو واضح کیا گیا ہے۔

سجاوٹ اور زینت صرف ظاہری ہوتی ہے اس لیے کہ آپ باہر سے ایک چیز کو سجاتے ہیں' اندر سے اُس کی کچھ حقیقت نہیں ہوتی۔ زینت اسی لیے کہا گیا ہے کہ دنیا اور

دنیا کی نعمتیں ظاہری سجاوٹ ہیں' اچھا لباس' اچھا مکان' اچھی گاڑی' یہ سب سجاوٹ ہے۔ ان کی خدا کے نزدیک فی نفسہٖ کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

تفاخر کے معنی ہیں فخر کرنے کے۔ اس میں ایک دوسرے کے ساتھ مسابقت کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ مسابقت کے ساتھ' جلن اور حسد اور کش مکش کی برائیاں بھی ہوتی ہیں اور درد والم بھی اس کے ساتھ ساتھ آتے ہیں۔

تکاثر کے معنی یہ ہیں کہ زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ایک ہوک سی ہو۔ دنیا کے گھونٹ سے آدمی کبھی سیراب نہیں ہوتا بلکہ ایک گھونٹ پی کر اور پیاس بڑھتی چلی جاتی ہے' آدمی مزید حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ تین الفاظ دنیا کے تین مختلف پہلو ہیں۔ یہاں کے نتائج اور اُن کی قدر و قیمت کو واضح کرتے ہیں۔ دنیا بڑی بے وفائی کرتی ہے' انسان کی پوری شخصیت وصول کرتی ہے' پوری محنت مانگتی ہے۔ انسان کے پاس جو لاقیمت ذہن اور دماغ اور عقل اور دل ہیں اُن کو اپنے پاس گروی رکھ لیتی ہے اور اُس کے بعد نہ دینے کا وعدہ کرتی ہے نہ دیتی ہے' اگر دیتی ہے تو پورا نہیں دیتی' اور جو کچھ دیتی ہے اُس کے ساتھ سو روگ اور سو عیب لگے رہتے ہیں۔ محنت پوری ہو جاتی ہے' وصول کم ہوتا ہے۔ اس لیے جب قرآن کہتا ہے کہ دنیا متاع الغرور ہے تو اس میں یہ سب معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ غرور کے معنی دھوکے کے ہیں۔ یہ سارے دھوکے اُس کے اندر شامل ہیں۔

اس کے مقابلے میں اس نے آخرت کو ''خیر وابقٰی'' کہا ہے کہ یہ بہتر ہے' اور باقی رہنے والی ہے۔ یہاں خوف وحزن سے نجات ہے۔ زندگی کے اصل دکھ اور تکالیف مادی نہیں ہیں۔ اس دنیا کے اندر جو خوف اور اندیشے لگے رہتے ہیں کہ کیا ہو جائے گا اور جو ماضی کی حسرتیں ہیں کہ کیا نہیں ہوا' وہ دنیا کے اصل درد والم ہیں۔ لیکن آخرت میں اللہ کا وعدہ ہے: وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَاهُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ (البقرہ ۲:۶۲) ''اور اُن کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے''۔ وہاں پر آدمی کو کسی قسم کا نہ خوف اور غم ہوگا

اور نہ کسی قسم کی مسابقت ہی درپیش ہوگی کہ اُس کو اتنا مل گیا' میرا اُس سے بہتر ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ایک لحاظ سے بہت قیمتی قرار دیا ہے کہ آخرت کی پوری راہ دنیا سے ہوکر جاتی ہے اور یہی وقت' یہی مال اور یہی نعمتیں آخرت کے حصول کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ اسی لیے مال کو اور دنیا کو خیر بھی کہا گیا ہے۔ بظاہر یہ بڑی متضاد بات محسوس ہوتی ہے لیکن اللہ نے مال کی جگہ خیر کا لفظ استعمال کیا ہے' یعنی اگر وہی مال اور وہی دنیا آخرت کمانے کے لیے استعمال ہو تو پھر وہ خیر ہے۔ گویا ایک دودھاری تلوار ہے کہ جو اس کے پیچھے چل پڑا وہ برباد ہوگیا اور جس نے اس کو اپنے پیچھے چلایا اور اس کو آخرت کی منزل کی طرف لے گیا' وہ کامیاب ہوا۔ یہ بات بھی بار بار کہی گئی ہے کہ اللہ کے نزدیک دنیا کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ایک جگہ تو یہ بھی فرمایا کہ اگر یہ خدشہ نہ ہوتا کہ انسان اس آزمایش کو برداشت نہ کرسکیں گے اور سارے کے سارے انسان کفر کی راہ پر نکل پڑیں گے' تو اللہ انکار کرنے والوں کے محل' ان کے دروازے' اُن کے بستر سب سونے چاندی کے بنا دیتا۔

اب جو آدمی ان حقیقتوں سے واقف ہو اُس کو اپنی منزلِ مقصود آخرت ہی کو قرار دینا چاہیے۔ اگر اِن سب کو چھوڑ کر وہ دنیا کو مقصود بنالے اور اُس کے پیچھے دوڑے تو اس سے بڑی حماقت اور غلطی کیا ہوسکتی ہے۔ دنیا کی کسی نعمت کو طول دینا یا تکلیف کو مختصر کرنا ہمارے بس اور اختیار میں نہیں ہے لیکن آخرت کی نعمت کا حصول ہمارے بس اور اختیار میں ہے۔ اسی بات کو قرآن میں یوں کہا گیا ہے: كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ط (اٰل عمرٰن ۳:۱۸۵) ''آخرکار ہر شخص کو مرنا ہے''، یعنی زندگی ختم ہونے کا وقت تو مقرر ہوگیا۔ اب ہم یہ چاہیں کہ ہم نے جو کچھ بھی اسباب جمع کیے ہیں' عالیشان محل تعمیر کیا ہے' مکان سجایا اور بنایا ہے' بینک بیلنس بنایا ہے اور کارخانے قائم کیے ہیں' ان سے فائدہ اٹھانے کی ہماری جو مہلت ہے اس میں ایک لمحے کا اضافہ کرلیں تو وہ اضافہ ہمارے بس

کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح یہاں پر جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں اور ہم چاہیں کہ ایک لمحہ مختصر ہو جائے تو مختصر بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لیے اس کے فوراً بعد فرمایا کہ پھر دنیا کا ارادہ کیوں کرو' اصل چیز تو آخرت ہے جس کا ارادہ ہونا چاہیے۔ یہیں سے یہ مقصود اور منزل بنی کہ آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔ چنانچہ کُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ (۳:۱۸۵) کے فوراً بعد فرمایا: وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ ''اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو'' یعنی تمھاری ساری مزدوری' سارا معاوضہ اور ساری محنت قیامت کے روز ادا کی جائے گی۔ آخر میں دنیا کی حقیقت اور کامیابی کے تصور کو یوں اجاگر کیا:

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ (اٰل عمرٰن ۳:۱۸۵)

کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتشِ دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا' تو یہ محض ایک ظاہر فریب ہے۔

سورہ ال عمران کی اس آیت میں دنیا اور آخرت کا پورا تصور واضح اور صاف کر دیا گیا ہے۔ ہم بار بار کہتے ہیں' تقریروں میں بھی کہتے ہیں' لٹریچر بھی موجود ہے کہ اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ لیکن اس کو پہچاننا' اس کو جذب کرنا اور اس کو اختیار کرنا کوئی بہت آسان کام نہیں ہے۔ اس کی دعوت تو بالکل صاف اور واضح ہے کہ دنیا جیسی بے قیمت چیز کے لیے قوتیں اور وقت کیوں صرف کرتے ہو۔ جو کچھ قوتیں' وقت اور صلاحیتیں اللہ نے دی ہیں جن سے آخرت کی وہ نعمتیں خریدی جا سکتی ہیں کہ جو ہمیشہ رہنے والی ہیں' ابدی ہیں اور جن کی کوئی نظیر دنیا کے اندر نہیں ملتی' اُن کو چھوڑ کر آدمی کیوں ان کے پیچھے دوڑے۔

یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ دنیا' آخرت کا راستہ ہے اور یہاں ہر چیز ایک امتحان ہے۔ دنیا فی نفسہ کوئی قابل مذمت چیز نہیں۔ لیکن جس بات کی بہت

وضاحت کے ساتھ تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں آدمی کا رہنا مسافر کی طرح ہو۔

حضورؐ نے فرمایا کہ دنیا کے اندر مسافر کی طرح رہو۔ اس پر آپ جتنا غور کریں گے' دنیا اور آخرت کے تعلق کے مختلف پہلو واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ مسافر اپنے سفر کی غرض سے پوری دلچسپی رکھتا ہے اور جب سفر میں ہوتا ہے تو حالت سفر میں اپنے ہر لمحے کو اور اپنی ہر چیز کو استعمال کرتا ہے تاکہ سفر کا مقصد حاصل ہو' لیکن وہ مقام سفر پر ڈیرے ڈال کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اُس کو واپسی کا' وطن لوٹنے کا برابر خیال لگا رہتا ہے۔ دنیا کے ساتھ معاملے کی پوری تصویر اس کے اندر ہے۔ ہم نہ تو اس سے بے نیاز ہو سکتے ہیں' نہ اِس سے دست بردار ہو سکتے ہیں' نہ اس کو ترک کر سکتے ہیں بلکہ ہم کو اسی کو استعمال کرنا ہے' اسی میں رہنا ہے' اسی سے پوری غرض اور فائدہ حاصل کرنا ہے' لیکن یہ ہماری منزل اور گھر نہیں ہے بلکہ اس سے ہمیں وہ کمانا ہے کہ جب ہم اپنے گھر پہنچیں تو وہاں پر ہم کامیاب ٹھیریں۔

دو اہم پہلو

یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ دنیا کو استعمال کرنے کی یہ مہلت جو ہمیں ملی ہے' ایک مختصر مہلت ہے۔ اس کے ساتھ دو چیزیں لگا دی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ مختصر ہے' دوسری یہ کہ اس کے اختتام کا علم نہیں ہے۔ یہ اختتام آج بھی ہو سکتا ہے' کل بھی ہو سکتا ہے' اور اس میں برسوں بھی لگ سکتے ہیں۔ قرآن نے خود کہا ہے کہ تم میں سے بعض بچپن ہی میں رخصت ہو جاتے ہیں' بعض جوان ہوتے ہیں' بعض بڑھاپے میں--- لیکن یہ کہ کوئی ایسا نہیں ہے کہ جسے رخصت نہ ہونا ہو۔ لیکن ہمیں اس مختصر مدت کے اختتام کا بھی علم نہیں ہے اور نہ اپنی موت کی جگہ کا ہی علم ہے۔

موت کے بارے میں قرآن نے جو کچھ تعلیم دی ہے' اس سے دراصل یہی بات

واضح ہوتی ہے کہ موت کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ آدمی اُس سے ڈرے اور خوف کھائے۔ ہم اُس چیز سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں جس سے بچنا ہمارے اختیار میں ہو' چونکہ موت سے کسی صورت میں اور کسی حالت میں بھی مفر نہیں ہے' لہٰذا اُس کے لیے اندیشہ کرنا اور اہتمام کرنا' خوامخواہ کی پریشانی ہے۔ البتہ موت کے بعد جو کچھ پیش آنے والا ہے' اُس سے بچنا ہمارے اختیار میں ہے۔ اُس کا پورا انحصار ہمارے عمل پر ہے۔ آج جو کچھ ہم کر رہے ہیں' وہی کل ہم اپنی نگاہوں سے دیکھیں گے' وہی ہمیں وہاں پیش آئے گا۔ بے شمار احادیث اور آیات اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بہت تیقن کے ساتھ بتاتی ہیں کہ سوائے اعمال کے اور کوئی چیز نہیں ہے جو آخرت میں انسان کا مقام متعین کرے۔ لہٰذا موت سے ہم ڈریں اور خوف کھائیں' اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ بالآخر ہم کو موت آئے گی۔ ہمیں تو اُس کا خیال کرنا چاہیے جو موت کے بعد پیش آنے والا ہے۔ اگر اُس کا خیال کریں گے تو بچنے کی کوئی صورت ضرور نکل سکے گی۔

جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ مہلتِ عمل مختصر ہے اور بغیر کسی نوٹس کے ختم ہونے والی ہے۔ یہی دعوت دی گئی ہے کہ اس سے پہلے کہ وہ وقت آئے جب تم اِس دنیا سے رخصت ہو' اس کی تیاری کرلو۔ یہ دعوت مختلف انداز سے دی گئی ہے۔ کہیں کہا گیا کہ تیاری کرلو اس سے پہلے کہ تم کو پکڑ لیا جائے اور موت آ جائے' اس لیے کہ اُس کے بعد کوئی اور مہلت عمل نہیں ہوگی۔

آدمی کہے گا کاش تھوڑی سی مہلت ملتی اور یہ مدت آگے ٹل جاتی تو پھر میں صدقہ بھی کرتا اور نیک کام بھی کرتا۔ وہ اللہ سے درخواست کرے گا کہ مجھے واپس بھیج دے اب میں نیک کام کروں گا۔ مگر اب یہ موقع انسان کو ملنے والا نہیں ہے۔ **بَلٰی قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِیْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ** ٥ (الزمر ۳۹: ۵۹) ''(اور اس وقت اسے یہ جواب ملے گا) کیوں نہیں' میری آیات تیرے پاس آ چکی تھیں' پھر تو نے انھیں جھٹلایا اور تکبر کیا اور تو کافروں میں سے تھا''۔

آخرت مقصود ہو' اور موت کا جو فطری خوف ہے وہ تو بہر حال فطری ہے' لیکن مطلوب ایسا خوف ہے جس سے اعمال کا رخ متعین ہونے لگے۔ آدمی نڈر اور بے خوف ہو جائے اور اللہ کی راہ میں جان دینے کی ضرورت پڑے تو ہنسی خوشی جان پیش کر دے اور موت کی حقیقت کو سمجھ لے کہ جہاں لکھی ہے' جس وقت لکھی ہے وہاں آ کر رہے گی۔ قرآن میں اس کو بالکل کفر قرار دیا گیا ہے کہ آدمی کہے کہ ایسا ہوتا تو شاید موت نہ آتی۔ کہا گیا ہے کہ کافروں کی طرح نہ ہو جاؤ جو کہتے ہیں کہ لڑائی پر نہ جاتے' سفر پر نہ جاتے تو نہ مرتے' حالانکہ یہ تو صرف دل کی حسرت و ندامت ہے اور کچھ نہیں۔ موت تو آنا ہی تھی۔ اگر موت میدانِ جنگ میں لکھی ہوئی تھی تو اللہ تعالیٰ اُن کو کھینچ کر وہاں پہنچا تا جہاں اُن کو مرنا تھا۔ اس لیے کہ جہاں مرنا ہے' جس وقت مرنا ہے' اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔ قوت' طاقت اور جوش و جذبہ اور بے باکی پیدا کرنے کے لیے موت سے نڈر اور بے خوف ہونا بہت ضروری ہے۔ آخرت کا تصور اور موت کا اٹل ہونا' اس کا شعور اپنے اندر بھی اور دوسروں کے اندر بھی' قوت' طاقت' عزم و حوصلہ اور بے باکی پیدا کرتا ہے۔

اگر آخرت کو مقصود بنانے کی کیفیت حاصل ہو' تو دنیاوی زندگی کے تمام مراحل کامیابی سے گزارے جا سکتے ہیں۔ ہر طرح کے مراحل آئیں گے لیکن اگر یہ بنیاد مضبوط نہ ہو تو شاید عارضی طور پر آدمی بہک جائے' اُس کے قدم ڈگمگائے جائیں' لیکن جس نے اس کو مستقلاً اپنا مقصود بنا لیا' وہ کبھی صحیح راہ سے بھٹک نہیں سکتا۔ ہم کو سب سے زیادہ فکر اِس بات کی کرنی چاہیے کہ ہمارا دل اس طرف یکسو ہو جائے کہ آخرت کی کامیابی اصل کامیابی ہے' اُسی کو بالآخر ہمیں حاصل کرنا ہے۔ گو دنیاوی چیزوں کی کشش ہماری فطرت کے اندر ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ
مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ

(آل عمرٰن ۳:۱۴)

لوگوں کے لیے مرغوبات نفس---عورتیں' اولاد' سونے چاندی کے ڈھیر' چیدہ گھوڑے' مویشی اور زرعی زمینیں--- بڑی خوش آیند بنا دی گئی ہیں۔

کوئی چیز اللہ نے نہیں چھوڑی' عورتیں' اولاد' سواریاں' کھیتیاں' کارخانے' پیداوار' بینک بیلنس اور سونے چاندی کے ڈھیر' ان سب کی محبت ڈالی گئی ہے۔ یہ سب چیزیں موجود ہیں' ان سے آدمی یقیناً تعلق رکھے گا لیکن ان سب سے بہتر اور باقی رہنے والی چیز آخرت ہی مقصود ہونا چاہیے۔ اسی لیے فرمایا:

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○ (اٰل عمرٰن ۳:۱۴)

مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔

درحقیقت قوت و طاقت کا اصل منبع اور سرچشمہ اللہ پر ایمان اور فکرِ آخرت ہے! اس لیے ایک مومن کا مطمح نظر' حقیقی نصب العین اور تمام کوششوں کا منبع و مرکز دنیا نہیں آخرت ہونی چاہیے۔ اگر انسان اس کھلی حقیقت کو پہچان لے تو اس کی سوچ اور فکر کا رخ درست ہو جائے گا۔ نتیجتاً تمام مسائل جو حقیقت سے چشم پوشی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں' خود بخود حل ہوتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ وہ وقت بھی آئے گا کہ اللہ اپنا وعدہ پورا کرے گا اور دنیا میں سربلندی بھی ملے گی اور آخرت میں سرخروئی و سرفرازی بھی۔

یہی اصل کامیابی ہے!

○○○